

دہلی

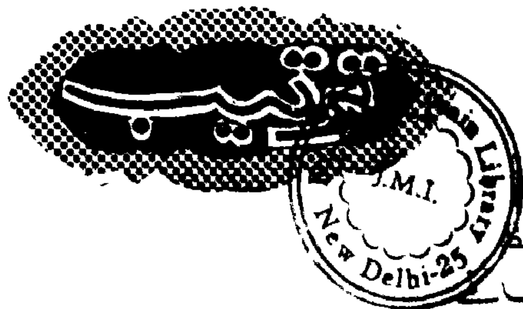
۱۹۸۶ء



مدیر، طابع و ناشر
وکاس دت

جلد ۲
قیمت ۸۰ روپے

پبلشرز ایڈورٹائزرز
جے-۶ کرشن نگر - دہلی ۱۱۰۰۵۱



ترتیب

افسانے

غزلیں

نظمیں

خراج عقیدت

مضامین

ادبی خبرنامہ ۲۶۵

پیش لفظ

اگرچہ آج اُردو کو حصولِ آزادی کے بعد کے پہلے دہے ایسے بحرانی دور کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تاہم آج بھی اُسے اپنا حقیقی مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ اس میں شک نہیں کہ آج مرکزی اور ریاستی سرکاریں اس زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کثیر رقم خرچ کرنے کے علاوہ اکادمیوں اور دیگر اداروں کے ذریعہ اس سلسلے میں متعدد اقدام کر رہی ہیں لیکن بوجوہ اس زبان کی ترقی و فروغ کے راستے میں نئی اڑچنیں حائل ہیں جن میں سب سے بڑی اڑچن اُردو کی وہ نام نہاد بڑی شخصیتیں ہیں جو اس زبان کے لیے مگرمچھ کے آنسو بہا کر، لمبے چوڑے بیان دے کر اور احتجاجی جلسے اور جلوس کر کے اُردو کو اس کے جائز حقوق اور حقیقی مقام دلانے کی آڑ میں اپنی شہرت و مقبولیت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ اُردو اکادمیوں کو ملنے والا لگ بھگ ایک کروڑ سرکاری روپیہ اُردو کی ترویج و اشاعت پر کم اور اکادمیوں کے پروگرام کے نام پر اکادمیوں کے منتظمین و اراکین کے دوستوں اور اعزا و اقارب پر زیادہ صرف کیا جاتا ہے جتاکہ اکادمیوں کو ملنے والی سالانہ گرانٹ کو محض خرچ کرنے کے لیے جو مذاکرے، مباحثے، مشاعرے، ڈرامے اور دیگر پروگرام مرتب کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر پروگراموں میں کچھ اپنے مخصوص ادبا و شعرا کو مدعو کر کے اپنی اقربا پروری کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان پروگراموں کی بدولت وہ حضرات جنہیں لوگ شاعر بھی نہیں مانتے، آج صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مقالہ نگار، محقق، اداکار اور نہ جانے کیا کیا بن گئے ہیں۔ اور وہ ہر سال اکادمیوں سے ہزاروں روپے وصول کر رہے ہیں۔

اسی طرح اُردو اکادمیوں کی جانب سے انعامات کے نام پر جو بے شمار روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک طرح کا مذاق ہی ہے کیونکہ انعام تو وہ ہوتا ہے جو سیکڑوں میں سے چند منتخب اعلیٰ معیاری کتابوں کو دیا جائے لیکن بعض اکادمیاں تو صرف روپیہ ٹھکانے لگانے کے لیے لگ بھگ سبھی موصول ہونے والی کتابوں کو انعام دے دیتی ہیں چاہے ان کا معیار اور موضوع کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ دراصل ان انعام حاصل کرنے والے ادبا و شعرا

کو اکادمیوں سے "انعام یافتہ" نہیں بلکہ "امداد یافتہ" کہنا ہی بہتر ہوگا۔ اور بعض اوقات تو بیچارے مصنف کو اتنی کم رقم کا انعام ملتا ہے کہ اگر اس کے ذریعہ بھیجی گئی کتابوں کو فروخت کیا جاتا تو اس سے زیادہ رقم وصول ہو جاتی کیونکہ آج کل اکثر کتابیں تو ساٹھ ستّر روپے قیمت کی ہوتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اکادمیوں کے انعام کی وجہ سے ملک میں اُردو کتابوں کی اشاعت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ بعض کتابیں تو صرف انعام کے لئے ہی شائع کی جاتی ہیں کیونکہ فروخت کا خاطر خواہ اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے اکادمیوں کو انعام کے لئے ارسال کی گئی کتابوں کے علاوہ بقیہ کتابیں یا تو مصنف کے دوستوں، شاعروں اور ادیبوں میں مفت بٹ جاتی ہیں یا گھر میں پڑی پڑی دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں لہٰذا اکادمیوں کو چاہئے کہ وہ اَن گنت مصنفین کو انعام دینے کی بجائے ہر برس چند منتخب کتابوں پر ادباء و شعراء کو ایک دو ہزار روپے کے بجائے دس پندرہ اور بیس ہزار روپے کے انعام دیں اور بقیہ مصنفین کی ایک سو سے تین سو تک کتابیں خرید کر انہیں لائبریریوں میں تقسیم کریں تو ان کا بہتر مصرف ہوگا۔ اس طرح مصنفین کو کتابوں پر آئی لاگت وصول ہو جائے گی۔ دوسرے لائبریریوں کو گرانٹ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی جن کا بعض اوقات غلط ڈھنگ سے استعمال کیا جاتا ہے تیسرے اس طرح لائبریریوں میں ملک بھر میں شائع ہونے والی کتابوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ جمع ہو جائے گا جس سے اُردو قارئین و محققین مستفید ہو سکیں گے۔

حوالہ جاتی مجلے "عالمی اردو ادب" کی اشاعت کا مقصد اُردو قارئین کو سال بھر کا منتخب اُردو ادب پیش کرنے کے علاوہ ہر طرح کی ادبی سرگرمیوں سے روشناس کرانا نیز تحقیقی اور معلوماتی مضامین پیش کرنا ہے۔ درحقیقت اس طرح کے حوالہ جاتی مجلے کی ترتیب و تدوین کسی فرد کا نہیں بلکہ ادارے کا کام ہے لیکن افسوس کسی ادارے نے اس جانب توجہ نہیں دی بہرحال میں نے اس مجلے کی اشاعت کے ذریعے ایک معمولی سی انفرادی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں دو سو ادیبوں، شاعروں، محققوں اور نقادوں سے معلومات حاصل کرنے کے لئے خطوط ارسال کئے گئے تھے مگر اس سلسلے میں انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یاد دہانی کے لئے دوبارہ خطوط لکھنے پر دو سو اہلِ قلم میں سے صرف بہت کم ہی نے جواب

سے نوازا۔ بہرحال اپنی انفرادی کوشش سے جتنی بھی معلومات حاصل ہو سکیں انھیں پیش کیا جا رہا ہے۔

مجھے پوری طرح احساس ہے کہ زیرِ نظر شمارے میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں۔ خصوصاً شمالی اشاروں میں بہت سی مشہور ادبی شخصیات شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور بعض کے حالات ادھورے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متعدد شعراء و ادباء نے اپنے بارے میں حالات فراہم نہیں کئے اور اس میں شامل زیادہ تر معلومات مختلف کتابوں اور رسائل سے اکٹھی کی گئی ہیں جس سے بہت سی معلومات نامکمل ہیں تاہم آیندہ شمارے کو اس سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

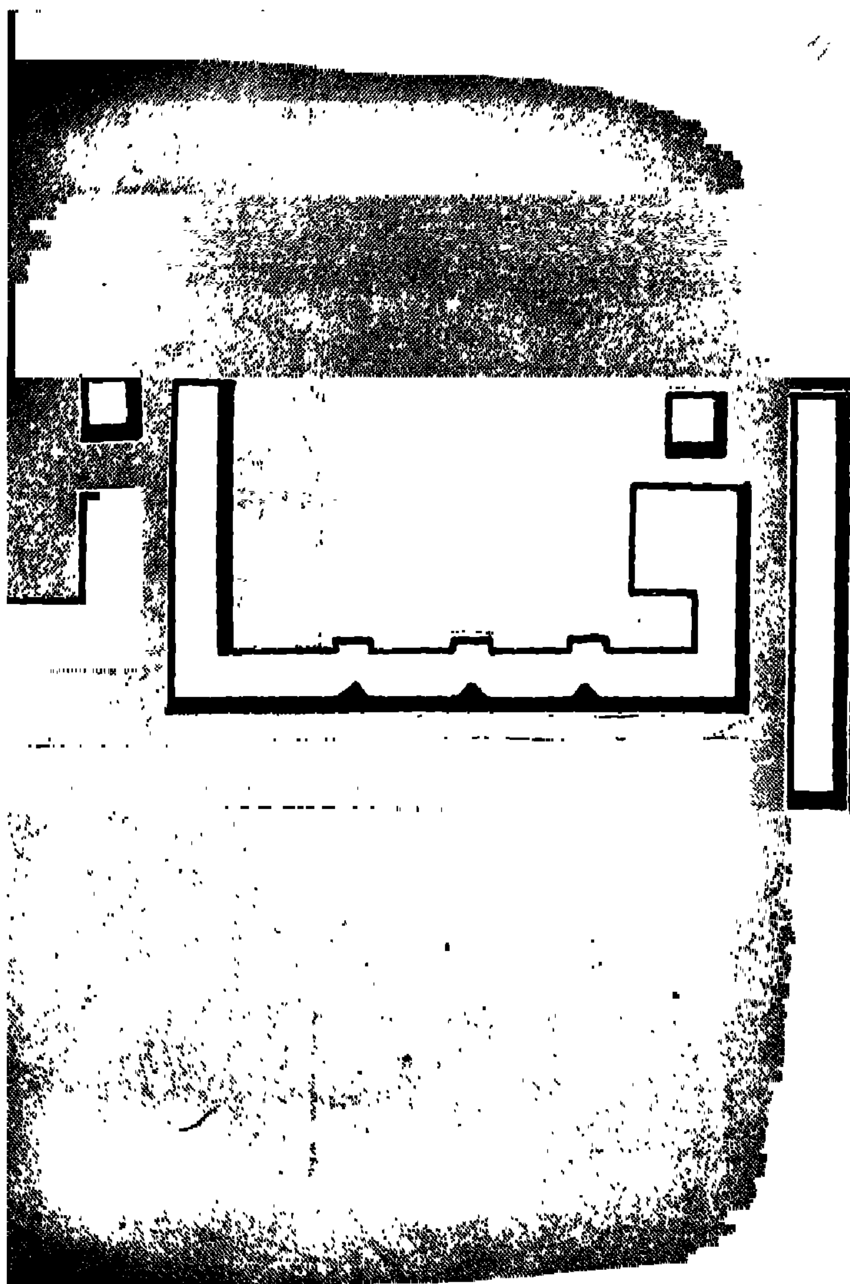
اگر آپ کے علاقے کی کوئی ادبی شخصیت لائبریری ناشر، کتب فروش اخبار یا رسالہ اس میں شامل نظر نہ آئے تو آپ براہ کرم اس کی تفصیل سے آگاہ کیجئے تاکہ آیندہ شمارے میں اسے شامل کیا جا سکے۔

زیرِ نظر شمارے میں تخلیقات کی اشاعت میں حروف تہجی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تاکہ کسی ادیب یا شاعر کو امتیاز و تفریق کا گلہ نہ ہو پھر بھی اگر غلطی سے کہیں ایسا نہ ہو سکا ہو تو اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

رسائل اور تصاویر کی فراہمی اور مشوروں کے لئے میں پریم پال اشک، دیویندر اسر، راج نراین راز اور دیگر احباب کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں اس مجلے میں تخلیقات کے لئے میں اُن رسائل و جرائد کا ممنون ہوں جن سے انہیں مستعار لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اُن اہلِ قلم کا بھی شکر گزار ہوں جن کی غزلیں، نظمیں، افسانے اور مضامین اس میں شامل کئے گئے ہیں۔

جے۔۶ کرشن نگر
دہلی۔ ۱۱۰۰۵۱

نند کشور وکرم
یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء



احمد ندیم قاسمی

بین

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں. بکائین کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلہریاں، تنے سے چوٹی تک اسی طرح بھاگی پھرتی تھیں، اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیئے کی کالی پیلی روشنی میں اونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری، اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر تمہارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تمہارے بابا نے موقع پا کر تمہیں دیکھا تھا تو اُداس ہو گیا تھا۔ اور میں نے کہا تھا "تم تو کہتے تھے کہ بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے۔ پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے" اور اس نے کہا تھا "تو نہیں جانتی نا بھولی عورت۔ تو ماں ہے نا۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے" اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمہارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں، کیوں کہ میری جان وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا سانپ کو دیکھتی ہے۔ وہ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیئے۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہما ہوا، باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائی پر، دوسرے بوڑھوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمان کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی

اس کی طرف آ رہا ہے۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی، میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوبصورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوبصورت ہے پر اب اس کی خوبصورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیر دیں' بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا تو وہ بالکل سورت تھا۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی۔ بس ذرا سی بجھا دی۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھینچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے تمہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر ابھی ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوتے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر، چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگنے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار تم گر پڑیں اور تمہارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں روتے روتے نڈھال ہو گئی پر تمہارے بابا نے جھک کر کہا تھا "خدا جو بھی کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری راجو بیٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس کی خوبصورتی کو داغ دار کر دیا ہے۔" پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل سنے سنے چاند کا سا تھا۔ لال لال سا بھی اور سبزا سبزا سا بھی۔ جو اب میری جان پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لیے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتہ چلا کہ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی دیواروں کے اندر سے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری راجو بیٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمہاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں

بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکار سی اٹھتی رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پہلے تم آیت پڑھتی تھیں اور تمہارے بعد تمہاری ہم سبقوں کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں جب تم اکیلی پڑھ رہی ہوتی تھیں تو گلی میں سے گزرنے والوں کے قدم رُک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولہے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ ادھر سے گزر رہے تھے اور تمہاری آواز سن کر انہوں نے کہا تھا "یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں" اور جب تمہیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمہارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگی تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لاتیں اور تمہاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور "طفیل سائیں دولہے شاہ جی" کہتی ہوئی ان برتنوں پر "چھوہ" کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ بُرے نیک ہو جاتے۔ بے نماز نمازی ہو جاتے!

ان دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسے تم نور کی بنی ہوئی تو ہمیشہ سے ہو پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آتیں تو تمہارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں۔ جیسے سورج پر نہیں جمتی۔

خدا اور رسولؐ کے بعد تم سائیں دولہے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں۔ اسی لیے تو تمہارا بابا ایک بار تمہیں سائیں دولہے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی! کہ اب بھی جب چار طرف سناٹا ہے اور صرف اِدھر اُدھر سے سسکی کی آواز آ جاتی ہے، میں تمہارے آس پاس تمہاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے، پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمہاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری لاڈو کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمہارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بیٹی کے سر پر چنّی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آ رہا ہے پر تمہارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے

کی مہلت ہی نہ دی۔ میں نے تمہارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا: "تو تو سدا کی بے خبری ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس بات یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے اس سے کبھی تو بات کرو۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے۔"

تب پہلی بار مجھے بھی تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آجاؤ۔ مگر پھر اسی شام کو سائیں حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی نہیں بیٹی کہ سائیں دولے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔ زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف کوئی بات کی، اسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی بُرا کام یا بُری بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرہانے کی طرف سے کھل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا دستِ مبارک بلند ہوتا ہے۔ بُرا کام یا بُری بات کرنے والا جہاں بھی ہو کھنچا چلا آتا ہے۔ اپنی گردن سائیں جی کے دستِ مبارک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دستِ مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی دیواریں یوں مل جاتی ہیں جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولے شاہ جی کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے میں کجاوے کے ایک طرف تھی اور تم میری جان دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمہارا بابا بیٹھا تھا۔ اونٹ جونہی اُٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی، اور میری پاک اور نیک بچی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرتا تھا، لوگ دُور دُور سے کھنچے چلے آتے تھے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں اور ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے اور غوطہ لگا کر جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئے دور نکل جاتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے۔

جو زمین پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ آسمان کا خیال مجھے یوں آتا تھا کہ ایک بار تمہارے بابا نے پالان پر سے جھک کر میرے کان میں پہلے سے کہا: "اُدھر دیکھو۔ یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اُڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمکتے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اُتر کر آنے والے فرشتے معلوم ہوتے ہیں!" اور میری آنکھوں کا نور بچی، میں تمہاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے۔ کچھ ایسے جیسے ننھے مُنّے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہواؤں میں ہمکتے پھرتے ہوں۔ وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آتے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کے پاس ہمارا اُونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔ تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولھے شاہ جی تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لیے جا رہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور تمہاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لیے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں ان کے زانوؤں کو چھونے اور دستِ مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انھوں نے فرمایا تھا: "اپنی بیٹی کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کرا لیے ہیں۔ تم انشاء اللہ جنتی ہو۔" یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر ہم نے اندر جا کر بیبیوں کو سلام کیا تھا اور تمہیں۔ میری جان۔ سائیں دولھے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور اُن کے گھرانے کی بیبیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آ گئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاکؐ نے ہم غریبوں اور گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹھنڈک، اے میری صاف ستھری راز بیٹی! پھر جب عرس کے بعد ہم دونوں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی

تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے مگر کیا یہ تم ہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں۔ تمہارے بال اُلجھ رہے تھے چادر تمہارے سر سے اُتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلّا پڑی تھیں۔ مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دولھا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا میں یہیں رہوں گی، جب تک انصاف نہیں ہوگا میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا۔ آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دست مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود ہی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ پر اب میں نہیں آؤں گی، اب میں نہیں آسکتی۔ میں بندھ گئی ہوں۔ میں رک گئی ہوں" پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آگیا تھا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لیے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے "اثر ہو گیا ہے۔ دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے"

تمہارے بابا نے فریاد کی تھی "اثر ہو گیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہو گیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟" وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ پھر میں نے اندر بیبیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بیبیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں اور زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم پھر لپک کر مزار شریف کی طرف گئے تھے مگر اب کے میری بچی، تم نے ہمیں دیکھا تو تمہیں جلال آگیا تھا اور تم نے اتنے زور سے چیخ کر کہا تھا کہ "تم چلے کیوں نہیں گئے مگر

مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ چیخ اس حلق سے نکلی ہے جس نے تلاوت کے سوا کبھی اور کچھ کیا ہی نہیں۔

ہم اُجڑے بچھڑے ماں باپ مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ جن اُترے تو اس امانت کو اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور رانو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دو۔

"اب تم جاؤ"۔ ہمارے سروں پر تمہاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمہاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں "اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ فیصلہ ہو جائے تو میں سیدھی تمہارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ" یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں میری بیٹی۔ ہم تمہارے ماں باپ اس کے بعد بھی بار بار تمہارے پاس پہنچے مگر اب تو تم ہمیں پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمہیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ تمہارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمہارے ہونٹ اکڑ کر پھٹ گئے تھے۔ تمہارے بالوں میں گرد تھی اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمہارے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے اور ہم نے یہ کپڑے تمہارے سامنے رکھ دیئے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمہارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اُٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوتے تھے کہ تم کہیں کپڑے بدلنے گئی ہو۔ مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اُٹھا تھا۔ تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھیں اور تمہارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنہوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا یہ جوڑا درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں۔ جیسے کوئی جھری، کوئی سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر جیسے ہوئے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ انصاف ضرور ہوگا پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ جن بھوت کلام پاک پڑھنے والوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ دور سے بیٹھے ہنستے رہتے ہیں اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے، تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں۔ آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے نام پر، رسول پاکؐ کے نام پر، پیر دستگیر کے نام پر، سائیں روڈے شاہ جی کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلئے اور یہ جن اتار دیجئے اور سائیں حضرت شاہ جی نے فرمایا تھا کہ ہم جن تو اتار دیتے مگر تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں، تم گھر جا کر دعا کرو۔ ہمارا وظیفہ جاری رہے گا۔

جب ہم لوٹتے ہوئے واپس آ رہے تھے تو بیبیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن حضرت شاہ مزار کی طرف آ ئے تھے تو تمہاری بد نصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول ہر تیسرے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لیے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں روڈے شاہ جی کے دیتے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی! خادم تمہاری بیٹی کو مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے انہیں روک کر کہا تھا کہ نادانو! یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمہاری بیٹی تمہیں بلا رہی ہے۔ رات آدھی رات

گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کی پائنتی بیٹھی ہوئی تھیں۔ چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمہاری نظریں ٹنگ گئی تھیں اور تمہارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تم اس وقت بھی تلاوت ہی کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمہارے بابا نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونا شروع کر دیا تو نہایت ہی کمزور آواز میں تم نے کہا تھا: "میری اماں۔ میرے بابا۔ کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا۔ انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی۔ سائیں دولھے شاہ جی، آپ نے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ خدا کے سامنے .... خدا .... !" اس کے بعد تم چپ ہو گئی تھیں اور تب سے چپ ہو۔"

پھر ہم تمہیں یہاں گھر میں اٹھا لائے۔ اور جب ابھی ابھی صبح سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم سائیں جی کی طرف سے تمہارے لیے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمہارے بابا پر آ گیا۔ اس نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولھے میں جھونک دیا جس پر تمہیں غسل دینے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اب میرے جگر کی ٹکڑی، میری نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری راانو بیٹی! آؤ میں تمہارے ماتھے کے نیچے ہوتے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ ابکا تن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں اور ایسی ہوا چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی اور چاروں طرف تمہاری تلاوت کی گونج ہے اور سائیں حضرت شاہ جی کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے ماحول میں پھیل چکی ہے اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمہیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔

(چنگاری، دہلی، اپریل/مئی ۱۹۸۴ء)

اقبال مجید

آگے ہے آگے

ایک باقاعدہ بنے ہوتے شہر کی شاہ راہ، ایک اجنبی، پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔

جب سب کچھ بنتا ہے تو پیشاب گھر نہیں بنتے۔

جب پیشاب گھر بنتے ہیں تو لوگ وہاں پاخانہ کر دیتے ہیں۔

پتلون کی فلائی پر ہاتھ بار بار جاتا ہے۔

ایک کشادہ سی صاف ستھری دیوار پر لکھا ہے "یہاں پیشاب کرنا منع ہے"

وہاں دیوار سے لگ کر سایہ ہے، لاتعداد خوانچے والے بیٹھے ہیں۔ سامنے سیدھی بھاگتی ہوئی شاہراہ ہے۔ دائیں بائیں دکانیں ہیں مال سے لدی ہوئی، چوراہے اور فوارے ہیں۔ چاٹ کی دکانیں، آئس کریم، بھنے چنے، ٹی اسٹال، چوڑے چوڑے فٹ پاتھ، کہیں کہیں کنارے کنارے لوہے کی خوبصورت ریلنگز اور آدمیوں کی بھیڑ۔ صاف ستھرے تیز تیز چلتے اپنے آپ سے باتیں کرتے چھوٹے بڑے آدمی۔

پیشاب کے مقام پر جلن ہو رہی ہے

نسوں کو پوری طاقت سے اوپر کی طرف کھینچنے کا عمل نہ جانے کب سے جاری تھا۔

یہ شاہراہ کسی ویران علاقے سے کیوں نہیں مل جاتی، یا پھر کوئی زیر تعمیر عمارت ہی فٹ پاتھ کے کنارے مل جاتے جہاں آس پاس جھاڑیاں ہوں۔

بہت دیر کا رکا ہوا پیشاب جب یک بارگی بہہ نکلتا ہے تو جسم کے ایک ایک عضو کا تناؤ جس مسرت انگیز لذت کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے وہ لطف و طمانیت قدرت کا ایک عظیم تحفہ ہے۔

ایک باقاعدہ بنے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، پیشاب کی اذیت ناک شدت اور

پیشاب گھر

زندگی میں سب سے مبارک عمل کیا ہے؟

way Out کی تلاش!

ہمارے اندر بہت کچھ گڑتا رہتا ہے ستایا کرتا ہے اور بے چین کر دیتا ہے ہم کو، جی چاہتا ہے کہ ہم اسے نوچ کر نکال دیں۔

بائیں طرف ایک سینما ہال ہے۔

بکنگ ونڈو پر سناٹا ہے۔ ہر سینما میں پیشاب گھر ہوتا ہے۔ یک بارگی سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ پیشاب کی شدت اور بڑھ جاتی ہے لیکن ہال کے پھاٹک پر تالہ لگا ہے۔ شاید ابھی شو کا وقت نہیں ہوا۔

چوڑی چکلی سڑک اپنے پورے طمطراق سے جاری ہے۔

فٹ پاتھ کے دونوں طرف سونے چاندی کی دکانیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ کیا دن میں ایک بار بھی پیشاب نہیں کرتے۔ دکانوں پر کپڑا خریدتے ہوئے لوگ، کوک پیتے ہوئے لوگ۔

ایک پیڑ کے نیچے گنّے کا رس کچلا جا رہا ہے ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ٹھیلہ کھڑا ہے جگہ جگہ چائے کی بھٹیاں ہیں، پینے کا اتنا سامان لوگوں کے پیٹوں میں جا رہا ہے اور لوگ بغیر پیشاب کئے گھوم رہے ہیں۔

کیا وہ دُنیا کا واحد فرد ہے جو پیشاب کی شدت میں مبتلا ہے۔

شاید ایسا نہیں ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ سارے کے سارے دکاندار، سڑک کی یہ بھیڑ فٹ پاتھ کے یہ تماشائی سب ہی ان چور جگہوں کو جانتے ہوں گے۔ جہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے چہرہ تکلیف سے بار بار رنگ بدلتا ہے آدمی میں برداشت کی قوت کی بھی حد ہوتی ہے جب پیشاب اپنی پوری قوت سے لگے نہ کھڑے رہنے میں آرام ملتا ہو اور نہ چلتے رہنے میں۔ جب بار بار آنکھیں آس پاس کہیں فلائی کے بٹن کھول کر کھڑے ہو جانے کا سوال کرتی ہوں تو زندگی کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے، باہر کی خوبصورت ترین شے، تیز سے تیز دھماکہ، ہیبت ناک سے ہیبت ناک واقعہ خالی خالی سا لگتا رہتا ہے۔

یہ جلن مارے ڈال رہی ہے۔
نسیں جیسے اب ٹوٹ جائیں گی۔ کہیں کوئی بوند باہر آ جائے۔
اجنبی ہونا تو ایک بہانہ ہے۔ آدمی کہیں اجنبی نہیں ہوتا صرف lay out کی بات ہے کسی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔
"اے چھوکرے۔ یہاں پیشاب کرنے کی جگہ ہے آس پاس؟"
"آگے ہے آگے۔" جواب ملتا ہے۔
پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔
"کیوں سیٹھ جی یہاں پیشاب کرنے کی کوئی جگہ ہے آس پاس؟"
"آگے ہے آگے۔"
نیچے انڈر ویئر بھی نہیں ہے، لوگ انڈر ویئر پہن کر عقلمندی کرتے ہیں۔ شاید اس لیے نیچے کے کپڑے کبھی کبھی اوپر کے کپڑوں سے مہنگے ہوتے ہیں۔
"کیوں بابو جی، یہاں پیشاب کرنے کے لیے کوئی جگہ ہے آس پاس؟"
"آگے ہے آگے۔"
ہونٹ دانتوں کے نیچے دباتے اور درد کو سہتے سہتے بار بار ابھرنے والی بے معنی جھنجھلاہٹ کو جھٹکنے کتنی دیر ہو گئی اور کتنا سفر کٹ گیا، نہ راستہ کہیں مڑا اور نہ کوئی نالہ ملا اور نہ کسی دکان کا پچھواڑا، لکڑی کی بند دکانوں کے پیچھے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔
"کیوں بھیا پوسٹ مین اِدھر کہیں جگہ ہے پیشاب کرنے کی؟"
"آگے ہے آگے۔"
فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں لگی ہیں۔ کبھی کبھی پرانی کتابوں میں نایاب کتابیں بھی مل جاتی ہیں لیکن ٹھہرنے کا یارا نہیں، ہر بات کا وقت ہوتا ہے، اتنی مہلت کہاں؟
"کیوں مہاشے جی، اِدھر کہیں پیشاب۔"
"آگے ہے آگے۔"
یہ اسمبلی بھون ہے ٹھیک اس کے سامنے خیمے لگے ہیں جہاں بھوک ہڑتالی پڑے ہیں، سیاست زندگی کا ایک حصہ ہے ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنا ہی ہوں گی۔
"دادا یہاں پیشاب کے لیے۔"

"آگے ہے آگے"

نہرو کا سب سے بڑا حریف ہندوستان کا پروگریسو موومنٹ تھا اس لیے انھوں نے سوشلسٹ ہندوستان کا چکر چلا کر سب کو بیکار دیا، ربط و تسلسل جب نہ ہو اور تبدیلی کی جلدی ہو تو سماجی ادارے ٹرانسفر تو کئے جاسکتے ہیں ٹرانسفارم نہیں کئے جاسکتے۔ سماج آگے ہو گیا۔ فرد پیچھے۔ علاؤ الدین کا چراغ تو محض ایک کہانی ہے۔

"بھیا یہاں پیشاب گھر"

"آگے ہے آگے"

"اردو کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوئی۔ علی سردار جعفری کا چیک دیر میں کیش ہوا۔
کتنی دیر اور لائن میں کھڑا رہنا پڑے گا بھئی۔

"پیشاب"

"آگے ہے آگے"

جہاں ہو وہیں کھڑے رہو، جسم کے تناؤ اور اندر کے درد کو سہتے رہو، ایسی حالت میں چلنے سے مثانہ اور بھی Irritate ہوتا ہے۔ سفر بند کرو۔

مٹھیاں بھنچی ہیں، بار بار رگ پٹھے اُوپر کی طرف سکڑ رہے ہیں، کتنا درد ہو رہا ہے۔

جب پیشاب کی شدت ناقابلِ برداشت ہو تو اس کے بارے میں سوچتے نہیں رہنا چاہیے نہیں Irritation اور بڑھتا ہے لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔

چلنے سے کھال کو بار بار مسلنا، کوئی سیدھی بات کرے تو اس کا الٹا جواب دینا، پیشاب کی شدت ذہن کو دیوالیہ کر دیتی ہے۔

"یہاں پیشاب گھر کہاں ہے؟"

"آگے ہے آگے"

"نہیں نہیں، یہاں پر اس جگہ پیشاب گھر کہاں ہے؟"

"آگے ہے آگے"

"نہیں۔۔۔ ابھی ابھی، ٹھیک اسی مقام پر، پیشاب گھر کہاں ہے؟"

"آگے ہے آگے"

"نہیں نہیں، میری فلاں کے بٹنوں سے بالکل جڑا ہوا پیشاب گھر کہاں ہے؟"

"آگے ہے آگے"

([illegible])

انتظار حسین

دیوار

"وہ تو ہنس رہا ہے۔"

"کیا؟" ایک دم سب کی نظریں جبران کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

جبران نے ایک مرتبہ پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی پھر بولا "ہاں بالکل! یہ تو ہنسی کی آواز ہے وہ ہنس رہا ہے۔"

سب نے کان لگا کر اس دور کی آواز کو سننے کی کوشش کی اور اپنی ہراساں نظروں اور تشویش بھری خاموشی سے جبران کے بیان کی توثیق کی، صرف ایک عماسہ تھا کہ اس تشویش میں حصہ دار نہیں تھا، اس کی خاموشی تشویش کے بجائے بے تعلقی کا رنگ لیے تھی، مندریس نے کہ ان کے بیچ پڑا تھا اپنی تشویش کو اپنے وقار پر غلبہ نہیں پانے دیا۔ ایک وقار کے ساتھ کسی قدر افسردہ لہجہ میں بڑبڑایا... "وہ بھی" اور چپ ہو گیا۔

دفعتاً عمیر نے جھرجھری لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رفیقوں نے اسی طرح چپ بیٹھے ہوئے استفسار آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میں خبر لے کر آتا ہوں" اور وہ چلا گیا۔

وہ سب اسی طرح چپ بیٹھے تھے اب شام کا دھندلکا تھا ——————— عمیر کا تعاقب کرتے ہوئے بھی اُن کی نظریں زیادہ دُور تک اُسے نہیں دیکھ سکی تھیں اور اب اس کی نگاہیں راہ تکتے ہوئے بھی زیادہ دُور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر بڑھتا ہوا اندھیرا سماعت کی راہ میں حائل نہیں تھا، کان اسی طرح دور کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"اب تو کوئی آواز نہیں آرہی" عماسہ بولا۔

جبران نے تھوڑی دیر کان لگا کر سنا، عماسہ کی تائید کرتے ہوئے بولا "ہاں اب کوئی

آواز نہیں آرہی لگتا ہے کہ اس نے ہنسنا بند کر دیا۔"

پھر انہوں نے قدموں کی آہٹ سنی اور دیکھا کہ عمبر واپس آرہا ہے کوئی کچھ نہیں بولا کسی نے کچھ نہیں پوچھا، سوال ان کے ہونٹوں پر نہیں آنکھوں میں تھا تکتی ہوئی استفسار آمیز نظروں سے عمبر پر نرغہ کر لیا۔

"وہ تو وہاں ہے ہی نہیں۔"

"کیا؟" ایک مرتبہ پھر سب چونک پڑے۔

"ہاں میرے عزیزو! اب وہاں نہیں ہے میں نے قریب جا کر اس لمبی فصیل پر ایک سمت سے دوسری سمت تک نظر ڈالی وہ وہاں نہیں تھا۔"

"تو وہ بھی۔" مندرلیس نے اپنے پُر وقار مگر افسردہ لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

"مگر کہاں گیا وہ؟" عساہیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"جہاں اس سے پہلے جانے والے گئے تھے۔" مندرلیس نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

اس کی متانت نے جیسے رفیقوں کے لبوں پر مہر لگا دی سب چپ کے چپ رہ گئے کچھ دیر بعد عساہیل بڑبڑایا "کتنے ہمارے رفیق اس راہ گئے اور گم ہو گئے عجب بات ہے کہ ہر رفیق اُدھر کی خبر لے کر واپس آنے کا اعلان کر کے جاتا ہے مگر دیوار پر چڑھتے ہی اس کی زبان کو تالا لگ جاتا ہے پھر وہ ہماری طرف نہیں دوسری طرف دیکھتا ہے، قہقہہ لگاتا ہے اور دوسری طرف اُتر جاتا ہے۔"

"دوسری طرف کیا ہے؟" عساہیل نے سوال اُٹھایا۔

"دوسری طرف؟" سب نے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے سوائے عماسہ کے۔

مندرلیس نے عماسہ کو معلق دیکھا اور پوچھا "اے عماسہ تو نے کچھ جانا کہ دوسری طرف کیا ہے؟"

"دوسری طرف جاننے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہے؟ پھر ادھر آدمی کیا دیکھ کر ہنستا ہے۔" عمبر نے برہم ہو کر سوال کیا۔

"یہی دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

عمبر نے اس پر تاؤ کھایا، کھڑے ہوتے ہوتے بولا "میں دیوار پر چڑھوں گا اور خبر لے کر

آؤں گا کہ دیوار کے اس طرف کیا ہے؟"

رفیقوں نے حیران و پریشان نظروں سے اُسے دیکھا وہ دیوار کی دوسری طرف دیکھنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"تجھ سے پہلے جانے والے بھی یوں کہہ کر گئے تھے" عماسہ نے زہر بھری ہنسی کے ساتھ کہا۔

"مگر میں واپس بھی آؤں گا" عیر نے غصے سے کہا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

عیر جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کہ وہ بہت تیزی سے چلا تھا اور شام کا اندھیرا اُبھرا ہونے لگا تھا۔ رفیقوں نے حد نظر تک اُسے دیکھا اور پھر کان لگا کر بیٹھ گئے، ایک خوف بھرے انتظار میں کہ شاید وہی آواز جو کئی بار سن چکے تھے پھر آئے۔

جبران نے یکسوئی کے ساتھ کچھ سننے کی کوشش کی پھر بولا "تو وہ بھی"

"کیا وہ بھی؟" رفیقوں نے چونک کر کہا۔

جبران نے ایک مرتبہ پھر صدر کی آواز پر کان لگائے "ہاں وہ بھی"

رفیقوں نے اپنے اپنے طور پر ہنسنے کی اس آواز کو سنا اور خوف بھری آواز میں بولے۔

"وہ بھی"

پھر وہ آواز آنی بند ہو گئی جبران نے بہت کان لگائے مگر کچھ سنائی نہ دیا، مایوسی سے بولا "اب کوئی آواز نہیں آرہی"

"مطلب یہ ہے کہ گیا" مندریس نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

دیر تک سب چپ بیٹھے رہے آخر عساہیل نے جھرجھری لی "کاش ہمارے پاس یاجوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں"

"پھر کیا ہوتا؟" عماسہ نے بیزاری سے کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے"

"اگلی صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی"

مندریس اپنے بزرگانہ انداز میں بیچ میں پڑتے ہوئے بولا کہ "عزیزو! آپس میں تکرار مت کرو، سر جوڑ کر یہ سوچو کہ اس دیوار کے مسئلے کا حل کیا ہو"

"بہتر ہے کہ ہم واپس ہولیں" جبران بولا۔

عساہیل نے جبران کو دیکھا "کیا کیا واپسی؟"

"ہاں واپسی.... اب واپسی ہی میں عافیت ہے ورنہ یہ دیوار ہمارے سر بہت خرابی لائے گی۔"

"مگر واپسی ہمیں زیادہ خراب کرے گی۔"

"وہ خرابی اس خرابی سے بہرحال بہتر ہوگی کہ ہم باری باری دعوی اور اعلان کر کے دیوار پر چڑھیں اور پھر بے معنی ہنسی ہنستے ہوتے ہوئے بغیر دیوار کے اس طرف اُتر جائیں آخر اس عمل سے حاصل؟"

مندریس نے ٹھنڈا سانس بھرا "عزیزو! میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس دیوار نے ہمارے درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں قبل اس کے کہ ہمارے درمیان دیواریں اونچی ہو جائیں ہمیں اس مسئلہ کا حل تلاش کر لینا چاہیے سو عزیزو! میں نے یہ سوچا ہے کہ اب میں خود دیوار پر چڑھوں گا۔"

"مندریس تو؟" سب نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"ہاں میں.... میں دیوار پر چڑھوں گا اور دوسری طرف کی خبر لاؤں گا۔"

"یہ وہی اعلان ہے" جبران بولا "جو آگے جانے والے کر گئے تھے وہ یہ اعلان کر کے گئے اور واپس نہیں آتے۔"

"مگر میں نے واپسی کی ترکیب سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے ترکیب یہ سوچی ہے کہ ایک بڑی رسّی لے کر اس کا ایک سرا میں اپنی کمر میں باندھوں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں پکڑاؤں، پھر دیوار پہ چڑھوں.... جب میں ہنسی کا شکار ہو جاؤں اور دیوار کے اس طرف زقند لگانے کے لیے بھی باندھوں تو تم مل کر رسّی کو اپنی طرف کھینچو۔ یوں میں زقند لگانے سے باز رہوں گا اور خبر لے کر واپس آؤں گا" عساہیل یہ سن کر بے ساختہ ہنسا مگر مندریس نے اس کی ہنسی سے چشم پوشی کی اور اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا اہتمام کیا۔ ایک لمبی رسّی لے کر اس نے ایک سرا مضبوطی سے اپنی کمر میں لپیٹا اور گرہ لگائی، دوسرا سرا رفیقوں کے ہاتھ میں پکڑایا اور چلا دیوار کی طرف....

دیوار پر چڑھنے سے پہلے مندریس نے جبران اور عساہیل کو دیکھا کہ رسّی کا سرا مضبوطی

سے پکڑے ہوتے تھے۔ پھر عماسہ کو دیکھا کہ الگ کھڑا تھا "اے عماسہ! کیا تو اب بھی الگ تھلگ رہے گا اور مجھے دیوار کے اس پار گر جانے دے گا؟"

عماسہ نے تامل کیا مگر پھر ایک الکساہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر رسّی کو تھاما اور بولا "افسوس ہے مجھ پر کہ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل کتنا بے معنی اور لاحاصل ہے اور پھر بھی اس میں شامل ہو رہا ہوں۔"

مندریس دیوار پر تیزی سے چڑھا... جبران اور عساہیل نے چشم زدن میں دیکھا کہ مندریس دیوار کی منڈیر پکڑا ہے اور اس پار دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر عساہیل نے پکارا کہ "اے مندریس! کچھ کہہ کہ تو نے دیوار کے اس پار کیا دیکھا؟"

عساہیل کی پکار شام کے سناٹے میں صحراؤں میں گونجی اور گم ہو گئی... عساہیل نے تعجب کیا کہ اس نے مندریس کو پکارا اور مندریس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر جبران نے مندریس کو پکارا اور تعجب کیا کہ مندریس نے اس کی پکار کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"عجب بات ہے مندریس ہماری پکار کو سن رہا ہے اور چپ ہے۔"

"مندریس اب نہیں بولے گا کہ اس نے دیوار کے اس طرف دیکھ لیا ہے۔" عماسہ بڑبڑایا۔

"مگر" جبران چونکا "مندریس ہنس رہا ہے۔"

دونوں نے کان لگا کر سنا اور جبران اور خوف زدہ ہوتے۔ مندریس نے بھی جس پر وہ تکیہ کیے بیٹھے تھے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا مندریس بھی؟" جبران نے تشویش سے کہا۔

"نہیں! مندریس کو ہر حال میں واپس آنا ہے کہ وہ رسّی سے بندھا ہوا ہے اور رسّی کا سرا ہم نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔"

"مگر عساہیل میری مٹھی بھاری ہوتی جا رہی ہے۔"

"اے جبران! رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہ کہ اس طرح ہم مندریس کو دوسری طرف زقند بھرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔"

عساہیل اور جبران نے اور ان کے ساتھ عماسہ نے رسّی کو مضبوطی سے تھاما۔ مندریس پہلے آہستہ ہنسا... پھر اس کی ہنسی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ایک لمبا قہقہہ بن گئی۔ عساہیل جبران

اور عماسہ نے ایک لمبے قہقہے کو ایک خوف کے ساتھ سنا اور ان کی مٹھی بھاری ہوتی چلی گئی۔

"عزیزو! رسی کو اپنی طرف کھینچو۔ مبادا ہم خود دیوار پر کھنچے چلے جائیں" عساہیل بولا۔

رسی کو اپنی طرف انہوں نے پوری مضبوطی سے کھینچا اور محسوس کیا کہ انہوں نے مندرلیس کو اپنی طرف گرالیا ہے مگر جب انہوں نے قریب جاکر دیکھا تو حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"عزیزو! یہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ مندرلیس آدھے دھڑ کی صورت خون میں لت پت پڑا ہے یہ آدھا دھڑ کہاں گیا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ کھینچا تانی میں آدھا دھڑ ہماری طرف آپڑا، آدھا دھڑ دوسری طرف جا پڑا۔

عماسہ ہنسا "مندرلیس نے ایک شوق فضول میں اپنے وجود کو کتنا مضحکہ خیز بنالیا ہے کہ وہ آدھا ادھر پڑا ہے آدھا دیوار کے اس طرف"

عساہیل نے خون میں لت پت ادھورے مندرلیس کو دیکھا اور درد کے ساتھ کہا "کاش ہمارے پاس یاجوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں"

"پھر کیا ہوتا؟" عماسہ نے جل کر کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے"

"مگر صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی"

"ہم پھر اُسے رات رات میں چاٹ ڈالتے"

"اور صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی" عماسہ نے جلے بھنے لہجے میں کہا اور زہر میں بجھی ہنسی ہنسا پھر وہ ہنستا چلا گیا۔

جبران اور عساہیل دونوں سکتے میں آگئے۔

"عماسہ بھی" جبران اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"اور وہ تو دیوار پر بھی نہیں چڑھا ہے" عساہیل نے تعجب سے کہا۔

جبران اور عساہیل دونوں حیرت و دہشت سے عماسہ کو تکے جارہے تھے جس کی ہنسی اونچی ہوتے ہوتے ایک لمبا قہقہہ بن چکی تھی۔

(دھوبی، نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۴ء)

بشریٰ رحمٰن

ٹوٹا ہوا آدمی

اتنا شاندار دفتر، یہ بڑی کار، اُوپر سے نیچے تک ایک مستعد عملہ، اچھی شہرت — اور رہنے کے لیے خوبصورت آرام دہ گھر۔

ایک آدمی کے کیریئر کی یہی انتہا ہوتی ہے۔ ابتدا وہ کہیں سے بھی کرے۔

جبران علی نے بھی بڑی کڑی مسافت طے کی تھی۔ یوں سمجھئے کہ پاؤں پاؤں چلتا اور آبلے پھوڑتا وہ اس مقام تک آیا تھا۔

پہلے پہل جب یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی اس نے سی۔ ایس۔ پی کا امتحان دیا تھا تو اس کے سامنے کئی راستے تھے۔ ابا کی دواؤں کی دوکان پر بیٹھ جاتا۔ مزید تعلیم کے لیے باہر چلا جاتا۔ کالج میں لیکچرار ہی رہتا۔ کیونکہ وہ اپنی کلاس میں اوّل آیا تھا۔ اور کالج کی لیکچراری تو اُسے یونہی بن مانگے مل گئی تھی۔ بن مانگی شے کی کبھی قدر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نے سی۔ ایس۔ پی کا امتحان دے ڈالا۔ اسے لگ رہا تھا سی ایس پی وہ ستاروں بھرا راستہ ہے۔ جو چاند سورج تک پہنچا دیتا ہے۔ ایک بار آدمی اس راستے پر چل پڑے تو پھر منزل تک پہنچنے کے گُر اُسے خود بخود آجاتے ہیں۔ یا شاید ڈی۔ سی اور کمشنر کی کوٹھیوں پر جوتے چٹخاتے رہنے سے کرسی اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ ایسی کمزوری جو خنجر کی نوک بن جاتی ہے۔ خواہشوں کی قبا پھاڑ ڈالتی ہے۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ وہ اس امتحان میں بھی اوّل آیا اور قسمت نے اُسے اس راستے پر ڈال دیا۔ جسے وہ کیریئر کی کہکشاں کہا کرتا تھا۔

ملازمت ملتے ہی اس نے اپنی ایک پرانی کلاس فیلو سے شادی کرلی۔ جس سے وہ عشق تو ہمیشہ سے کرتا تھا۔ مگر اس کے باپ کی جھنڈے والی گاڑی سے ڈر کر کبھی بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

دونوں مرادیں ایک ساتھ بر آئیں۔

اور وہ زندگی کی کہکشاں پر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

آگے اور آگے۔۔۔ آگے بڑھنے کی لگن اگرچہ بہت اچھی ہے۔ مگر اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔

ایک سخت مقام کچھ ایسا آیا کہ اس کی سختی کا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ بہت دنوں تک وہ اپنے دل کی آواز کو دبا کر ضمیر کے شعلوں کو ہوا دیتا رہا۔ مگر اس کا اثر اُلٹا ہوا۔

جب وہ چھوٹے چھوٹے علاقوں کا بادشاہ مانا جانے لگا تو اُس میں تمام تر شہنشاہی عادات سرایت کرنے لگیں۔ اُس کا اس میں کیا قصور تھا؟ جہاں جاتا لوگ دوزانو ہو جاتے۔ اس کی پہچان اس کی موٹر تھی۔ اور وہ بڑی کوٹھی جس کے گیٹ پر چوب دار پہرہ دیتا نظر آتا تھا۔

اندر باہر ضرورت مندوں کا ہجوم نظر آتا۔

اور پھر لوگ تو ستم ظریف ہیں۔

خدا کی قسم اس نے کبھی عورت اور شراب کو چھونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ نہ جانے کن کی مہربانیوں سے بوتلیں بیڈ روم میں گھس آئیں۔ شراب تن من میں اُتری تو ساقی گری کی لذت نے سر اٹھایا۔ ساقی آیا تو ساتھ سنگیت بھی آیا۔

جام، ساقی اور سرود، تینوں نے مل کر اُسے لوٹ لیا۔

یہ سب کچھ رفتہ رفتہ زندگی کی ضرورت بنتا گیا۔ یا شاید اسٹیٹس کی علامت بنتا گیا۔ بیویاں روتی ہیں، چلاتی ہیں، دھمکیاں دیتی ہیں۔ بالآخر سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ کیونکہ شوہر کا اسٹیٹس اور بچوں کا مستقبل انہیں بھی عزیز ہوتا ہے۔

جب شوہر مدہوش ہو ہو کر سرِ محفل گانے والی کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا ہے۔ تو وہ مسکرا مسکرا کر اپنے آنسو ضبط کرتی ہیں۔ اور ہنس ہنس کر گانے کی داد دیتی ہیں۔ یوں تو جبران علی کے بے شمار دوست تھے۔ اور کون تھا جو اس کا دوست کہلانا پسند نہیں کرتا تھا مگر جبران علی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن میں فصلی بٹیرے کون کون سے ہیں؟ لیکن اس کے پیشے کا تقاضا یہ تھا کہ پہچان کے باوجود اُنہیں قریب رکھے۔ اور اُن کے پردے رکھے۔ قربت کے باوجود کچھ دوریاں بھی رکھے۔

لیکن قدرت نے کچھ پیارے دوست بھی عطا کئے تھے جن میں سے ایک سلمان شاہ بھی

تھا۔ سلمان شاہ ایک پڑھا لکھا زمیندار تھا۔ اُس نے ملک سے باہر جاکر بیرسٹری کی ڈگری لی تھی۔ لیکن طبیعت میں سادگی اور درویشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے اپنے پیشے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھا رہا تھا۔ ہاں اُس کی ذات سے دوستوں کو خوب فائدہ پہنچتا تھا۔ جبران علی کی ٹرانسفر جب سلمان شاہ کے شہر میں ہوگئی تو پرانے دوستوں کی پرانی محفلیں پھر زندہ ہوگئیں۔

جب بھی جبران علی اپنے کام سے تھک جاتا تو سلمان شاہ کے گھر آجاتا۔ سلمان شاہ کے گھر کوئی اسے سرکار نہیں سمجھتا تھا۔ وہاں وہ ایک پیارا بھائی تھا۔ اچھا دوست تھا۔ سب لوگ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے، تاش کھیلتے، سلمان شاہ کے بچے چاچا، چاچا کہہ کر اس کے گلے میں جھولتے رہتے۔

کم از کم وہاں جاکر اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک انسان ہے۔ آزاد ہے۔ اور اپنی مرضی سے ہنس بول سکتا ہے اور ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں وہ جس عالم، اور جس حلیے میں بھی چاہے جاسکتا ہے۔ مرتبے اور وردی کو جعلی نوٹ کی طرح پرے پھینک کر۔ ہاں ایک بات کی کمی اُسے محسوس ہوتی کہ سلمان شاہ کے ہاں پینے پلانے کا بندوبست نہیں تھا۔ سلمان شاہ اکثر مردوں کی طرح شادی سے پہلے پیتا ہوگا مگر اب شادی کے بعد تائب ہوگیا تھا۔ اُس کی بڑی وجہ غالباً اُس کی بیوی ہوگی۔

پینے والے کسی ایسی جگہ رت جگا نہیں کر سکتے جہاں بوتل کا بندوبست نہ ہو۔ رات اُترتی ہے تو اُن کے ذہن کے جنگل میں بھوت پریت واویلا کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر جب تک کھانے سے پہلے جبران علی چسکی نہ لگائے اُسے کھانے کا مزہ نہیں آتا۔ ادھر ہر شب سلمان شاہ نے اپنی بیوی سے کہہ سُن کر، جبران علی کو اپنی بوتل ساتھ لانے کی اجازت دیدی۔

"اب کوئی زہر کی گولی اپنی جیب میں رکھے یا پھانسی کا پھندا گلے میں لٹکائے رکھے بھلا کسی کو اعتراض کیوں ہو۔ اپنی گور اپنی گردن۔ اگر ہم پیا نہیں کرتے تو ہم گناہ میں شامل کیوں ہوں گے؟"

سلمان شاہ کے ان دلائل کو شائستہ نہیں مانتی تھی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی پڑھی لکھی عورت تھی۔ پتہ نہیں شراب سے کیوں متنفر تھی... ؟ مگر جب جبران علی اپنی بیوی کو بھی محفلوں میں لانے لگا تو وہ بھی آکر بیٹھنے لگی۔

سلمان شاہ کی بیوی عجیب قسم کی عورت تھی۔

کم از کم جبران علی کو تو یہی محسوس ہوا۔ اس کی صورت پر یہی لکھا ہوا تھا کہ وہ بڑی سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ عورت ہے۔ کتنی تکلیف دہ ہوتی ہیں وہ عورتیں جن کے چہروں پر اُن کی ذہانت کی چھاپ ہوتی ہے۔ وہ محفل میں ہمیشہ چراغ کی صورت نظر آتی ہیں۔ کبھی ایک مکتب لگتی ہیں۔ کبھی میخانہ۔۔۔۔

اور مرد ایک طالب علم کی صورت ہوتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے، عورت کے بارے میں ہر علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عورت پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ عورت کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ کھوجنا چاہتا ہے۔ ہر عورت اُس کو ایک ایسا جزیرہ لگتی ہے۔ جسے ابھی دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ دریافت کا کولمبس بننا چاہتا ہے۔ گو انجام کار، اس کے ہاتھ میں عورت کے بارے میں کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔ خالی تھیسس لیے کھڑا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کے تھیسس اس کے ہم جنسوں سے میل نہیں کھاتے۔

جبران علی جب بھی شائستہ کو دیکھتا۔ اُسے بڑی اُلجھن ہوتی۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تین بچوں کی ماں تھی۔ اور ایسی ہی تھی جیسی تین بچوں کی ماں کو ہونا چاہیے۔

وہ شہر کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ مگر اپنے خاوند کے ساتھ ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتی تھی۔ قصبے میں رہنے کے باوجود اُس کا گھر شہری گھروں کا ایک اچھوتا نمونہ تھا۔ وہ فیشن کی دُنیا سے دُور بڑی سادگی سے رہتی تھی۔ مگر اُس سادگی سے ایسی شعاعیں نکلا کرتیں جو چمکتے پتھروں میں سے نکلتی ہیں۔

وہ جب محفل میں آتی تو کسی کی طرف بطور خاص نہیں دیکھتی تھی۔ نہ کسی کو مخاطب کر کے بات کرتی تھی۔ وہ سرسری انداز سے ہر ایک کی طرف دیکھتی جیسے اُسے دُنیا میں کسی کی پروا نہ ہو۔ مگر جب وہ بات کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے محفل میں ہر ایک کو دیکھ رہی ہے۔

وہ کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنستی تھی۔ صرف مسکرایا کرتی تھی۔ مگر اس کے آتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے کمرے کی ہر شے ہنس رہی ہے، قہقہے لگا رہی ہے۔ اتنے شاداب چہرے کہ جنہیں دیکھ کر قطار اندر قطار ہریالے کھیتوں کا تصور اُبھرنے لگے، کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

وہ کبھی بحث میں حصہ نہیں لیا کرتی تھی۔

جب بھی ڈرائنگ روم میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ خود ایک لایعنی سی بحث شروع کر دیتے

رہیں۔ جھگڑانا اور سر پھوڑنا انسانی خاصہ جو ٹھہرا۔ وہ بحث کے دوران نظریں جھکائے جاتے بنا بنا کر ہر ایک کو پیش کرتی تھی۔ اور پھر جب اُس کو چپ کرانا مقصود ہوتا تو اپنی رائے کا اظہار صرف ایک فقرے میں کرتی تھی۔ اُس وقت یوں احساس ہوتا کہ یہی ایک فقرہ ہر دلیل پر بھاری ہے۔ اور اب اس بھاری پتھر کو اپنی جگہ سے سرکانے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔

سب لوگ چپ ہو جاتے۔ تسلیم کر لیتے۔ احتراماً یا کسی خوف کے تحت۔ شاید اس کے اندر علم کی ایک نہر جاری تھی۔ یا شاید جبران علی کا محض خیال ہو یا واہمہ ہو!

ایک بات تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ رفتہ رفتہ جبران علی پر انکشاف ہوا کہ سلمان شاہ کے گرد شخصیت کا یہ سارا تانا بانا اس کی بیوی نے بُنا تھا۔ ورنہ وہ شادی سے پہلے ایسا نہیں تھا۔

اب تو ایسا محسوس ہوتا جیسے شائستہ ایک مشعل ہے۔ اور سلمان شاہ اس روشنی میں آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی لیے سلمان شاہ کے چہرے پر وقت کی ایک شکن بھی نہیں تھی۔ کیا مست قلندر بنا بیٹھا تھا۔ جیسے زندگی اُس کے آگے بین بجا رہی ہے اور وہ اُس پر سانپ کی طرح بیٹھا سر دُھن رہا ہے۔

دوستی بڑی پیاری شے ہے۔ مگر حسد پر تو کسی کی اجارہ داری نہیں نا ؟ کسی کے من کے اندر اتنی شانتی ہو۔ کوئی اس حد تک اپنے حال میں مست ہو۔ تو پھر دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اپنے عزیز یا دوست ہی کیوں نہ ہوں۔

جبران علی کی گھر میں مسلسل آمد کے ساتھ ہی شائستہ اور سلمان شاہ میں بھی گھریلو قسم کی جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔ جنہیں سلمان شاہ اپنے یار سے نہیں چھپاتا تھا۔ اور یہی بات شائستہ کو بُری لگتی تھی۔ دوستی ایک طرف، اور ذاتی زندگی ایک طرف۔ عورت اور مرد کی نجی زندگی ایک ایسا مقدس راز ہوتی ہے جس میں شانہ نشیں فرشتوں کو بھی شامل نہیں کرنا چاہیے۔ لحاظ کی ایک مقدس چادر کے تلے، یہ کہانی آپ ہی آپ دوسری دُنیا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے پیچھے ایک خوشبو چھوڑ جاتی ہے۔ ماں، باپ، بہن بھائی یہ جا بنکہ دوست، احباب۔ کسی کو کیوں درمیان میں لایا جائے۔ اور تو سارے مسئلے اُن کے حل ہو چکے تھے۔ اب یہ اتنی سی بات درمیان میں آن اٹکی تھی کہ جبران علی اُن کے گھر میں بیٹھ کے پیتا تھا۔

میاں بیوی کی نگاہ سے بے باک ہو جاتی ہے اور ان رشتوں کی پہچان نہیں رہتی۔ شائستہ

کا اصرار تھا۔

مگر سلمان شاہ اس کا ہمیشہ مذاق اُڑاتا تھا۔ وہ کہتا "یہ تو پینے والے کے ظرف پر منحصر ہے۔ کیونکہ۔۔۔۔

"جو اہلِ دل ہیں بڑھاتی ہے آبرو اُن کی
جو بے شعور ہیں ان کو خراب کرتی ہے!"

"اونہہ۔ شراب اور شعور کا بھلا کیا میل!" شائستہ چڑ جاتی۔

"بعض اوقات تم بالکل نیم خواندہ خواتین کی طرح بات کرتی ہو۔" سلمان شاہ کہتا۔ "مجھے حیرت ہوتی ہے۔ تمہارا سارا علم کہاں چلا جاتا ہے۔ یہ باتیں مڈل پاس اور میٹرک فیل لڑکیوں کو زیب دیتی ہیں۔"

"جی ہاں! ابھی میں اتنی ماڈرن بن جاؤں کہ شراب کو سوشل زندگی کا ایک لازمہ سمجھ لوں۔ اور ڈرائنگ روم کو بوتلوں سے سجا دوں۔ اور ہر زید بکر کو آوارہ نظری کی اجازت دیدوں تو پھر میں بڑی اچھی اور تعلیم یافتہ کہلاؤں گی۔ ہے نا؟"

سلمان شاہ ہنس پڑتا۔

"بالکل درست کہا تم نے۔"

"تو صرف تعلیم یافتہ کہلانے کے لیے میں اپنے نظریاتی اصولوں کا خون نہیں کر سکتی۔"

"اچھا یہ نظریاتی اصول کیا ہوتے ہیں؟"

"مرد اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" وہ بے رُخی سے کہتی تو سلمان شاہ فوراً صلح پر آمادہ ہو جاتا۔

"شائستہ!" وہ اسے آگے بڑھ کر تھام لیتا اور کہتا۔ "مجھے پتہ ہے تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ چپ رہتی۔ بالکل نہ بولتی تو پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور کہتا۔ "تمہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں تمہارے شوہر کے منہ کو نہ لگ جائے۔"

یہ ڈر بھی اپنی جگہ صحیح تھا۔ مگر وہ کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھتی۔

"تمہارا شوہر کاغذ کا بنا ہوا نہیں ہے۔ سمجھیں؟ اتنے سال ہو گئے تمہارے ساتھ رہتے۔ ہاں جب چھوڑ دی۔ تو چھوڑ دی۔ اور پھر ع

جب سے دیکھیں یہ آنکھیں ہم پینا پلانا بھول گئے

وہ انگلی سے شائستہ کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرنے لگتا۔ اور اس عمر میں اس ایکٹنگ پر شائستہ مصنوعی غصے سے کہتی۔

"پلانا تو نہیں چھوڑا۔ ہاں پینا ضرور چھوڑ دیا ہو گا"

"اسے کیوں اس غریب کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ میرا یار ہے۔ تھک، ٹوٹ کے آتا ہے ذرا دل کا غبار نکال لیتا ہے۔ تمہارا کیا لیتا ہے؟"

"بھئی مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے نکال دو اور اُسے رکھ لو۔۔۔۔" شائستہ پھر برہم ہونے لگتی۔

"حالانکہ تم جانتی ہو۔ دونوں کو نہیں نکالوں گا۔ دونوں کو رکھوں گا"

شائستہ کو اس بات کا بہت غصہ تھا کہ اس کے شوہر نے اپنے دوست جبران علی کی آمد کے بعد اس کے ساتھ اپنے رویئے میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ اور وہ جبران علی کی آمد کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔

پُرسکون زندگی میں ذرا سی بے سکونی بعض اوقات وہ کام کرتی ہے۔ جو پاؤں کے تلوے میں چبھی ہوئی پھانس کرتی ہے۔

شائستہ چونکہ بڑی گہری عورت تھی۔ اس لیے اس کے ماتھے کی ذرا سی شکن کو سلمان شاہ کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ جبران علی کے سامنے اس کے ماتھے کی شکن کا راز کھول دیتا تھا۔ اور یہی بات شائستہ کو بُری لگتی تھی۔

شائستہ کو تو جبران علی کا بوتل لانا بھی بُرا لگتا تھا۔ اس نے جبران علی کی بیوی کے دل کا بھید بھی پا لیا تھا۔ وہ غریب مجبور تھی۔ وہ کہتی تھی اس نوکری میں صحبتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ اور پھر جب کوئی مرد کسی دوسرے مرد کو بہترین تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن میں بوتل اور عورت کے سوا کوئی اور چیز نہیں آتی۔ مردوں نے مردوں کو کبھی دلدل سے باہر نہیں نکالا۔ بلکہ گرنے والا نکالنے والے کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تاکہ وہ بولنے کے قابل نہ رہے۔ اس وقت شائستہ کا دل لرزنے لگتا۔

گو اُسے سلمان شاہ پر مکمل اعتماد تھا۔ مگر اس اعتماد کا کیا ہے۔ اپنے عارضی دوست کی ذرا سی خوشنودی کی خاطر یہ مرد اپنی بیوی سے کیا ہوا زندگی بھر کا وعدہ بھول جاتے ہیں۔ دل توڑ دیتے ہیں۔ راستے بدل لیتے ہیں۔

"پیالے کے ساتھی کبھی مخلص دوست نہیں ہوتے۔" شائستہ ہمیشہ کہتی۔

"تمہیں کیا پتہ دوستی کیا ہوتی ہے؟" سلمان شاہ بے پروائی سے کہتا۔

"ٹھیک ہے، میں نہیں جانتی کہ مردوں کی دوستی کے معیار کیا ہیں۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ اندھیری راہوں کے دوست کبھی اچھے دوست نہیں ہوتے۔"

"وہ بُرے دوست ہوتے ہیں؟" سلمان شاہ جھنجلا کر پوچھتا۔

"دشمن ہوتے ہیں۔" شائستہ بڑے شان سے کہتی۔

"یعنی اب تم میری اور جبران علی کی دوستی تڑوانا چاہتی ہو۔ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ اپنی بوتل یہاں لے آتا ہے۔"

"انشاء اللہ تعالیٰ مجھے یہ کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ بات تو وقت ثابت کرے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے شائستہ بیگم کہ میں تمہارے آگے گھٹنے ٹیک چکا ہوں۔ مگر تم میرے اور میرے دوستوں کے درمیان حائل نہ ہو سکو گی۔ مجھے اپنے دوست اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ بیوی کا کیا ہے۔ ہر عمر میں مل جاتی ہے۔"

شائستہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور پھر وہ چپ ہو جاتی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

مرد واقعی اتنا بے وقوف ہوتا ہے؟ وہ دل میں سوچتی۔ پھر اس کو گم صم اور چپ دیکھ کر سلمان شاہ خود ہی محفل میں چھیڑ دیتا۔

"یار میری بیوی کو تمہاری بوتل سے بیر ہے۔" وہ جبران علی کے سامنے کہتا۔ جبران علی اپنی لال آنکھوں سے شائستہ کی طرف دیکھتا اور پھر اپنا پیگ بھرنے لگ جاتا۔ وہ جواب دینے کی بجائے مسکرا کر جام منہ سے لگا لیتا۔

"جانتے ہو کیا کہتی ہے؟"

"ہوں۔"

"یہ کہتی ہے۔ شراب پی کر مرد کی نگاہ بدل جاتی ہے۔"

اس بات پر جبران علی سر جھکا لیتا۔

"کیا ہو جاتا ہے مرد کی نگاہ کو؟" سلمان شاہ تمسخرانہ انداز میں شائستہ سے پوچھتا۔

"غلط انسان کی تمیز آ جاتی ہے۔" بھری بھری شائستہ ہونٹ بھینچ کر کہتی۔

"غلط اور صحیح کیا ہوتا ہے؟"
"بُرا اور بھلا، حلال اور حرام؟"
"ذرا مثالیں دے کر واضح کرو؟"
"اُسے ماں بہن کی تمیز نہیں رہتی؟" شائستہ ایک دم پھٹ پڑتی۔
اس پر دونوں دوست قہقہہ لگا کر ہنستے۔ شائستہ غصّے میں تنی رہتی۔
"آپ کے اس طرح ہنسنے سے میں اپنا موقف تو نہیں چھوڑ دوں گی؟"
"یہی میں جانتا ہوں۔ تم مضبوط اعصاب کی عورت ہو؟"
"شراب اسی لیے حرام کی گئی ہے کہ اُسے پی کر آدمی حلال و حرام میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ماں اور بہن کا فرق اُٹھ جاتا ہے۔ سامنے والی عورت اس کی کیا لگتی ہے؟ اس سے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے؟"
"پھر تو شراب بڑی اچھی شے ہے؟" سلمان ہنس کر کہتا؟ یار مجھے بھی کسی دن ایک پیالہ دے دو۔ سچی دوداب اس عمر میں دل چاہتا ہے۔ یہ تمیز مٹا کر دیکھوں؟"
اس پر دونوں دوست پھر قہقہہ لگا کر ہنستے اور کافی دیر تک ہنستے رہتے۔
"بھابی صاحبہ! آپ کو کیسے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ تمیز اُٹھ گئی ہے؟" نشے میں ڈوبی ہوئی بھاری آواز میں اچانک جبران علی پوچھتا۔
تب شائستہ کا دل چاہتا۔ بڑھ کر اُس کی لال انگارہ آنکھیں نوچ لے۔ اور پھر اُنہیں ہتھیلی پر رکھ کر اُسے دکھائے۔ اور کہے۔
"خود اپنی آنکھوں کو دیکھو، تمہیں بھی اندازہ ہو جائے گا؟"
مگر وہ بڑے سکون سے کہتی؟ کچھ باتوں کے مرد دعوے دار ہیں۔ تو کچھ دعوے عورتیں بھی کر سکتی ہیں؟
"مثلاً ...؟" سلمان شاہ اُسے ٹوک کر پوچھتا۔
"اپنی طرف اُٹھنے والی ہر نگاہ کو عورت فوراً پہچان لیتی ہے۔ آپ جو چاہے کہہ لیں، مگر یہی پہچان سرزمین عورت کی میراث ہے؟"
"تم ذہین عورت ہو۔ یہی سب سے بڑی مصیبت ہے؟" جبران علی اپنے دل میں سوچتا۔
گو شائستہ نے اُن کی محفلوں میں بیٹھنا کم کر دیا تھا اور جبران علی کی بیوی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی آمنا سامنا تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ چھوٹی موٹی رنجشیں بھی ہوتیں۔

اور صحت مند قسم کی تکرار بھی۔

پھر ہوا یوں کہ جبران علی پر ایک کیس بن گیا۔ بوتل اور عورت کے بیچوں بیچ اس نے کچھ کام غلط بھی کر دیے تھے۔۔۔۔۔ آنے والے حالات کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے؟ کرسی کی نوکری ایسی ہوتی ہے۔ بہت کوشش سے ملتی ہے۔ ایک جھٹکے میں چھن جاتی ہے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح جبران علی کو بھی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ حقیقی معنوں میں اس وقت اُسے احساس ہوا کہ سچا دوست کیا ہوتا ہے؟

جبران علی کی آگے پیچھے کوئی جائیداد نہ تھی۔ پس انداز کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ جو جس کے نام تھا، وہ اُسی پر قابض ہو بیٹھا تھا۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ اور وہی سرمایہ جو کل تک اُس کی راہ میں بچھا جاتا تھا۔ آج سوتیلی ماں بن بیٹھا تھا۔ بھئی روپیہ سے بڑا ہرجائی بھی کوئی ہے اس سنسار میں؟ اس وقت سلمان شاہ نے، ماں بن کے اُسے کلیجے میں چھپا لیا۔ سائبان بن کر سر پر چھا گیا۔ وہ جبران علی کے بیوی بچوں کو اپنے گھر لے آیا۔ اس کے مقدمے پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ وہ قانون کی کتابیں جنھیں خاندانی اثاثے کی طرح، اُس نے بند کر کے رکھ دیا تھا۔ اُس کے مطالعے میں آ گئیں۔ اور جبران علی کے لیے وہ اپنے ہر قانون داں دوست کے پاس گیا۔

پھر رات کو دونوں مل کر بیٹھتے تو کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کی بات کرتے۔ سلمان شاہ نے اپنے گھر کا ایک حصہ انہیں دے دیا تھا۔ بچے مل کر کھیلا کرتے۔ عورتیں مل کر کھانا پکایا کرتیں۔ وہ دونوں سر جوڑ کر تجویزیں کرتے۔ آخر کار دونوں شوگر مل لگانے پر متفق ہو گئے۔ اس کے علاوہ مستقبل کے اور بہت سے پروگرام انہوں نے کاغذ میں قید کر لیے۔

سب کچھ کتنا ٹھیک جا رہا تھا۔ جو عمارت گرنے والی تھی۔ وہ اپنے آپ کھڑی ہونا شروع ہو گئی تھی اور۔۔۔ نہ جانے کیسے اور کس طرح جبران علی کو احساس ہوا کہ وہ سلمان شاہ کی بیوی کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس نے پہلے کبھی عشق نہیں کیا تھا۔ وہ عشق پیشہ آدمی تھا۔ شادی کے بعد بھی یہ مشغلۂ عشق اس نے جاری رکھا تھا۔

اس کا فلسفۂ عشق ہی نرالا تھا۔

وہ کہتا تھا ہر عورت اس قابل ہوتی ہے۔ کہ اس سے عشق کیا جائے۔ اور عشق کا یہ فلسفہ اس نے شراب کی مستی میں ڈوب کر پایا تھا۔ جب وہ نشے میں ہوتا تو ہر عورت اُسے پری معلوم

ہوتی۔ اُس پری کو زیر کرنا ہی اُس کی آخری تمنا بن جاتی۔

سلمان شاہ کی بیوی شائستہ ہرگز ایسی عورتوں میں شمار نہ ہوتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اُس کے خیال کو ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا جوں جوں وہ اپنے ذہن و دل کو ملامت کرتا اتنا ہی وہ حواسوں پر چھا جاتی۔ اُسے چھونے کا خیال بے قرار کرنے لگتا۔ خصوصاً جب وہ شراب کے نشے میں ہوتا۔ اور وہ کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مصروف ہوتی تو جبران علی اس کے دھیان میں ڈوبا رہتا۔

جب صبح ہوتی تو وہ صدق دل سے توبہ کرتا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتا۔ لعنت ملامت کرتا کہ پھر اس قسم کے خیال کو دل میں جگہ کبھی نہ دے گا۔

لیکن جب رات آتی۔ اور اپنے جلو میں لال پری لیے ہوتے آتی۔ تب اُس کی سوچ کا زاویہ بدل جاتا۔ شائستہ ایک مدھ بھرا سپنا بن کر اس کی آنکھوں میں لہرانے لگتی۔ اگر وہ شریکِ محفل ہوتی تو وہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پینے کی کوشش کرتا اور وہ جلد ہی محفل سے اُٹھ کر چلی جاتی۔

کیسا عجیب دورا تھا کہ جب اُن پر بُرا وقت آپڑا تھا۔ وہ ان کے خلاف کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اور یہ جبران علی بھی جانتا تھا کہ خدا کے بعد سلمان شاہ ہی اُس کا آخری سہارا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ عزیزوں اور دوستوں نے بھی نظریں بدل لی تھیں۔

پھر ایک دن وہ بُری گھڑی آپہنچی۔

اس روز سلمان شاہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا اور صرف ایک ہی رات کے لیے گیا تھا۔ جبران علی تنہا پی رہا تھا، رات آدھی ڈھل چکی تھی۔ اُس نے اپنی بیوی کو جگایا کہ ذرا کھانے کے کمرے میں جا کر ریفریجریٹر میں سے اُسے برف کا ایک سا پچا لا دے۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور وہ منہ موڑ کر سو گئی۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اُٹھ کر اس طرف کو چل پڑا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک عورت فریج کھولے کھڑی ہے۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

کون عورت ہے یہ۔ . . .

اس نے اپنی جلتی بجھتی لال لال آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور اسے پہچاننے دیر نہ لگی۔ وہی

رشا ہوا جسم۔ چراغ کی طرح جلتا ہوا بھرا پا کندن ، کندن گردن پر کھلی لٹوں کا خمار۔۔۔
بس نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس ریشمی گردن کو چومنے کی خواہش کو نہ دبا سکا۔ جلدی سے
آگے جا کر اس نے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ رکھے ہی نہیں دباؤ بھی ڈالا۔
وہ خوف زدہ ہو کر مڑی۔ اور پھر گر گئی۔۔۔۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل بھی گر کر چور
چور ہو گئی۔
گری ہوئی عورت شکار ہوتی ہے۔
اور گرے ہوئے شکار پر جھپٹنا ذلالت کی نشانی ہے۔
جبران علی اس وقت ذلیل مرد بن گیا۔
شائستہ کی وحشت زدہ آنکھیں جب جبران علی کی خبیث آنکھوں سے ٹکرائیں تو اُس نے
لرزتی ہوئی زبان میں صرف اتنا کہا۔
"بھائی جی!"
"بھائی جی۔۔۔۔" اس کے بعد اس میں کچھ کہنے کی سکت نہ رہی۔ وہ صدمے سے بے ہوش
ہو چکی تھی۔
صبح کو سب نے یہی سمجھا کہ پورا ریفریجریٹر اس پر گر گیا تھا۔ اور ساری رات وہ اس کے
نیچے دبی رہی۔ اس لیے جانبر نہ ہو سکی۔
مگر جبران علی جانتا تھا۔ داغ اپنا ہو یا بیگانہ۔ کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں۔ جو اُجلے دامن پر
کوئی داغ لے کر نہیں جی سکتیں، جب روح مر جائے تو جسم کی موت کا واقع ہونا یقینی امر ہے۔
انقلاب تو زندگی کی ریت ہے۔
آگے بڑھنا تو چلن ہے زندگی کا۔
زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ جبران علی کے اندر جو الاؤ جلتا رہتا تھا۔ وہ اُسے
کبھی نہ بجھا سکا۔
شراب کی بوتلوں میں غرق ہو کر، اس نے بھولنے کی کوشش کی۔ عورتوں کو پامال کر کے
تسکین حاصل کرنی چاہی۔
مگر جب بھی وہ کسی عورت کے قریب جاتا۔ اسے آواز آتی۔
"بھائی جی!"

" بھائی جی " وہ یوں چونک جاتا جیسے سانپ نے اس کے پاؤں کو ڈس لیا ہو۔ یہ آواز اس کی روح کے پاتال میں بیٹھ گئی تھی۔

اس نے پہلے بھی کئی عورتوں کے منہ سے لفظ 'بھائی جی' سنا تھا۔ ہر قسم کی عورتوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ شروع شروع میں وہ بھی عورتوں کی بہت سی قسموں کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ اچھی بُری عورتوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ ہر قسم کی عورت اس کی ضرورت بن گئی تھی۔ کالی ہو، گوری ہو۔ شہزادی ہو یا چمارن۔ بس جوان ہو۔ عورت ہو۔

ایسی عورتیں بھی اس کے پاس آتی تھیں کہ بھائی صاحب بھائی صاحب کہتے اُن کی زبان سوکھتی تھی۔ مگر اپنا کام کروانے کے بعد جب اُٹھ کر جانے لگتیں تو اپنی کوکھ میں اس کا بچہ لے کر جاتیں۔

اُسے خوب معلوم تھا۔ کہ بھائی بھائی کہنے والی حرّافہ عورتیں، کتنی جلدی بھائی کو عاشق بنانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے لیے لفظ بھائی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

مگر نہ جانے شائستہ کی زبان سے یہ لفظ کیسے ادا ہوا۔ کہ وہ زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں لفظ بھائی کے معانی سے آشنا ہوا۔

بھائی جی کے بدلے وہ اُسے جوتا مار لیتی۔ اس کے منہ پر تھوک دیتی۔۔۔ اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی۔ اتنا بڑا تاوان ادا نہ کرتی تو وہ زندگی کی بہت سی منزلوں سے آشنا نہ ہوتا۔

تنگ آکر اس نے عورت اور شراب سے توبہ کر لی۔

کام میں مگن ہو گیا۔

بڑا بنتا گیا۔

اُوپر اُٹھتا گیا۔

آج وہ ایک شاندار دولت کا مالک تھا۔ موٹر کاریں تھیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے تھے۔ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

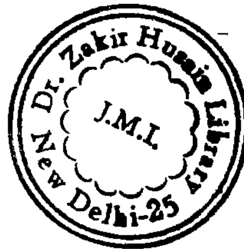
اس بے دولت کے انبار پر کھڑا ہو کے وہ غلاظتوں سے دور ہو گیا تھا۔

بڑا عظیم خسارہ۔

لیکن۔ ایک لفظ اب تک اس کے کلیجے میں پھانس کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ جب تک بھائی جی

کی پھانس، اس کے کلیجے کو لہو لہو کر رہی تھی' وہ غلاظتوں کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔
اور بے ہودہ انسان! گندگی کے لیے ہر عورت نہیں ہوتی۔ بعض عورتوں کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔
کبھی کسی نے مسجد کے گنبد پر بھی اُپلے تھاپے ہیں؟
اپلوں کے لیے الگ دیواریں ہوتی ہیں۔
رات کو جب کام کر کے اپنے دفتر سے باہر نکلتا۔ زینہ زینہ نیچے اُترتا۔ تو ہر زینہ بلاناغہ اس کے کان میں سرگوشی کرتا۔
بھائی جی۔
بھائی جی۔
اس کا سارا وجود بیزے پر چڑھ جاتا ہے!
"باری تعالیٰ!" وہ سوچتا۔
"گناہ تو میں نے اور بھی بہت کیے ہیں۔ اس ایک گناہ کا بوجھ اتنا زیادہ کیوں ہے کہ مجھ سے اُٹھ نہیں سکتا۔!"

(روبی نئی دہلی مارچ ۱۹۸۴ء)



بیر راجہ

نمبر دو: نمبر ایک

جب وہ کوئی بھولی ہوئی بات سنا جاتا تو میرے اندر ایک ٹیس سی اُٹھتی۔ میری باتیں جو صرف میری ہیں، میرے ساتھ بیتی ہیں، جنہیں میں ہی سلجھاتا سا، جن سے میرا سامنا ہوا کرتا.... اس کی کیسے ہو گئی ہیں؟ وہ باتیں مجھے کیوں یاد نہیں؟ کبھی کچھ یاد آنے پر میں خود کو ماضی میں پاتا، خود کو جوان محسوس کرتا، لیکن ساتھ ہی بوڑھا ہونے اور سب ختم ہو جانے کا احساس بھی طاری ہو جاتا۔

نامر کو پچھلے ۲۵ برسوں کی ڈھیر ساری باتیں یاد تھیں، اس بات پر حیرانی ہوئی کہ اُسے اتنی باتیں کس طرح یاد ہیں۔ پچھلے چار مہینوں میں اس کی باتوں نے مجھے بہت گہرا جھٹکا دیا ہے۔ جہاں یہ باتیں اس کی یادوں کی قبر ہیں، وہیں یہ مجھ سے میرا سب کچھ چھینتی رہی ہیں۔ صبح سے رات تک ایک دُنیا بناتا جو اُسی روز مسمار ہو جاتی اور پھر دوسرے دن نئی دُنیا شروع ہوتی۔

نامر نے اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ سوائے کچھ یادوں کے جو ریستوراں کی بیس میزوں، سرسے اور پرسیٹوں، برسوں پرانے گاہکوں، بتیس آدمیوں کے اسٹاف اور مجھ جیسے مالک سے جُڑی ہوئی ہیں۔ دوبارہ لوٹنے کے بعد وہ سارا دن باہر برآمدے میں بیٹھا ان یادوں کو گنگناتا اور اس وقت کی تاک میں رہا کرتا کہ کب میں اُسے خالی دکھائی دوں اور وہ آکر کوئی بات اس انداز میں سنائے جیسے ابھی ہوئی ہو۔

ریستوراں کے دروازے پر کسی پُرانے گاہک کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔ سلام بجالاتا اور پوچھتا کیسے ہیں حضور؟ مزے میں ہی ہوں گے... کوئی کمی ہے حضور کو؟ گاہک اکثر اُس کی باتیں سنے بغیر ہی چلے جاتے۔ اور اس کا چہرہ باسی پھول

کی طرح مرجھا جاتا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ اب لوگ اتنے مزے سے اس کی باتیں کیوں نہیں سنتے۔ جتنے مزے سے پہلے سنا کرتے تھے۔

گیٹ پر کھڑا ہوا لڑکا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھتا کہ کون تھا نام میاں۔ چپ نالائق! بڑوں سے منہ لڑاتا ہے۔ وہ اُسے ڈانٹتا لیکن جیسے ہی کوئی پوچھتا کہ کیسے ہو نمبر دو؟"

"بس زندہ ہوں حضور۔ ساری عمر آپ لوگوں کی خدمت میں گزری اب مٹی آپ لوگوں کے ہاتھوں اُٹھنی ہے۔" وہ پھول جاتا۔ کوئی کبھی ترس کھا کر اسے کچھ دے بھی جاتا۔ برآمدے میں اس کے گرد بھیڑ جمع رہتی۔ اس کی باتیں اس حضرت گنج سے شروع ہوتیں جب گورے ہی صرف حضرت گنج میں گھوما کرتے تھے۔ ہندوستانی مارے ڈر کے اُدھر کا رُخ نہیں کرتے تھے۔ جب کسی پرانے گاہک کی یاد آتی تو چست ہو جاتا اور جھک کر کہتا کہ اماں کیا وقت تھا، جب حضور پڑھا کرتے۔۔۔کتابیں مجھے سونپ کر لونڈیا کے ساتھ سیر گشتی کیا کرتے۔ اگر کوئی بیچ میں ٹوک کر پوچھتا کہ نام بھائی مزے تو آپ نے بھی خوب لوٹے ہوں گے؟ وہ بدک کر کہتا۔ تھو تھو کیا کہتے ہو۔ قسم خدا کی جو امانت میں کبھی خیانت کی ہو! ہمارے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا چلے آتے بیراگیری کرنے۔ کبھی بل میں روغن جوش غائب، پورا چکن گول۔۔۔سب ایرے غیرے بیرے بن گئے۔" حاضری رجسٹر میں شنکر، نندو، بابو نہ جانے کیا کیا بن جاتے ہیں۔ معلوم ہے گوروں کی بیراگیری کی ہے میں نے! ہاتھ میں ٹرے پکڑنی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ بولتے بولتے اس کی سانس اکھڑ جاتی۔ کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ بڑبڑاتا "جانور کی اولاد ننگ کرتے ہیں۔"

ریستوراں شروع کئے مجھے کچھ مہینے ہی ہوتے تھے کہ ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ فرشی سلام کے بعد میلے کچیلے کاغذوں کا ایک پلندہ اس نے کاؤنٹر پر پھیلا دیا۔ تعریفی خطوں اور سرٹیفکیٹوں کی بھرمار تھی۔ سر جھکا کر بولا تھا۔ اب بھی آرزو ہے کہ حضور کے قدموں میں جگہ ملے گی۔۔۔جنازہ بھی آپ کے کاندھوں پر اُٹھے۔ اُسے میں نے حیرانی سے دیکھا تھا اُس دن۔ لمبوترہ چہرہ، ہنستی آنکھیں، تیکھی ناک اور لچھے دار آواز۔ سفید وردی اور سر پہ پگڑی۔ دوسرے دن وہ اس طرح کام کر رہا تھا جیسے وہی سب کچھ ہو۔ اس کی آواز میں ایک ادھیکار تھا۔ کہیں کوئی کرسی ٹیڑھی ہوتی، وہ لپک کر سیدھی کر دیتا۔ گاہک کی گردن ہلتے ہی

سمجھ لیتا کہ اُسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ صبح تالا کھولنے، صفائی، دھوپ جلانے، سپلائر سے ٹوٹو میں میں کرنے سے لے کر ریستوران بند کرنے تک کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے اُوپر اوڑھ لی۔

یہ سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے پینتیس سال تک چلتا رہا۔ بیماری کے بعد اُس کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ ساتھ پورے اسٹاف کو بھی اپاہج کر گیا۔ میں سارا دن گورکھ دھندے میں پھنسا رہتا۔ نیپکن ختم ہو گئے، انتظام بھی کیا تو معلوم ہوا انڈے ختم ہو گئے ہیں۔ دودھ والا نہیں آیا۔ ویٹر میزوں کے بٹوارے پر لڑ رہے ہیں۔

کبھی کبھی نامر بیماری میں بھی چلا آتا اور کہتا کہ حضور، میٹ والے سے سو روپے لینے ہیں۔ انڈے والے کی طرف تین سو انڈے باقی ہیں...

"تم بیماری میں کیوں پریشان ہوتے ہو؟"

"آپ اکیلے یہ سب کیسے کرتے ہوں گے؟ بہت پریشان ہو جاتا ہوں یہ سوچ کر۔"

ایک دن وہ میرے پاس بہت دیر تک کھڑا رہا۔ اکیلا دیکھتے ہی بولا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ مرنے دم تک اپنی دھنستی آنکھیں، اکھڑتی سانس، کچن کے بند دروازے کے پیچھے سے آتی ہوئی مریل آواز جیسی آواز۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ ہمت نہ ہارو۔"

اچانک میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ لیکن پہلی بار کسی ملازم کی آواز چبھی۔

"نہیں سرکار! بیماری ہی نامراد ہے۔ نہیں تو کیوں جاتا؟ جا بھی کہاں سکتا ہوں؟ آنکھوں پر کوئی پٹی باندھ دے تب بھی قدم خود بخود یہاں چلے آئیں گے۔ قسم کھائی تھی آپ کے قدموں میں مرنے کی۔" وہ بچوں کی طرح سسکنے لگا۔

میرا من ذلت سے بھر اٹھا۔ برسوں پہلے اس کی کہی بات میں کتنی سچائی تھی۔ میں نے آج تک اس سچائی کو کیوں محسوس نہیں کیا؟ اُس دن اُسے دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ اس میں ابھی کم سے کم تیس سال تک کام کرنے کی طاقت ہے۔ ٹکے گا، بھاگے گا نہیں۔ اُن دنوں نامر کو کئی بار بلا تصور گالیاں بھی دیں، صرف دیکھنے کے لیے کہ برداشت کرتا ہے یا نہیں۔ اپنی پرکھ اور ملازم چننے کے طریقوں پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ کیا اس بیمار میں آنے سے پہلے میں اتنا کمینہ تھا؟ نہیں! پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟ نوکروں کو پھسلانے اور خوش

سیکھنے کے لیے اُن سے میں اُن کے گاؤں، کھیتوں، ندیوں کے بارے میں اور نہ جانے کیا کیا باتیں کیا کرتا تھا۔ کیا یہ سب میں ہی کرتا رہا؟ "نامر خاں" میں نے پہلی بار اُسے نمبر دو کی بجائے نام سے پکارا۔ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ تم بیمار ہو۔۔۔ تمہارا پورا علاج ہوگا ہر چیز ملے گی تمہیں۔۔۔ پیسہ بھی"

میرے پاس وہ زبان نہیں تھی جو دل سے نکلا کرتی ہے، جو کہا تھا وہ تو اس کا حق تھا جو اُسے بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ میں نے بہت پیار سے کہا کہ اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پیسے میں خود تمہیں پہنچا دیا کروں گا"

"آپ صرف مجھے باہر برآمدے میں بیٹھنے کی اجازت عنایت فرمائیں۔ میرے دن خود بخود کٹ جائیں گے" وہ کانپ رہا تھا اُسے ڈر تھا کہ کہیں میں اس کی بات کو ٹھکرا نہ دوں۔ ایک بے چین بد حواسی اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔

"آپ کے سائے میں پڑا رہوں گا" وہ گڑگڑاتا ہوا بہت نیچے اُتر آیا۔

"نہیں نامر بھائی! جو آرام اور سُکھ گھر میں ہے وہ باہر برآمدے میں نہیں ہے"

"نہیں حضور!" اس کی آواز اس طرح گونجی جیسے کچن میں کسی نے ڈوسے کے توے پر پانی کا چھینٹا دے مارا ہو۔ ہال میں کام کرتے ہوئے بیروں کے قدم رُک گئے۔ بہت سی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میری آواز کھولتے گھی کی طرح اس پر پڑی تھی۔ جلاتی ہوئی۔

"گھر! نہیں حضور"

اس نے پوری طاقت سے کہا۔ جیسے گھر نام کی جگہ میں نے کسی ایسی جگہ کا نام لے دیا ہو جہاں خونخوار درندے ہوں۔ اس کی آواز میں چھپے ہوئے درد کو محسوس کرتے ہوئے مجھے پہلی بار وہ ایک ملازم کی جگہ آدمی محسوس ہوا۔ اس کا ہاتھ آئس کریم کے ڈبے کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میرے گرم ہاتھوں میں۔۔۔

"گھبراؤ مت۔ میں جو ہوں! ممتا اور بچے پن سے نکلی ہوئی بات مجھے بے کار لگی۔ اس میں یقین اور ہمت پیدا کرنے والی بات کے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

"وہاں سب مکار ہیں۔ میری موجودگی ناگوار گزرتی ہے انہیں"

ریستوراں کی دنیا ہمیشہ کی طرح تھی۔ ایک چکن تندوری، ایک ہوٹ ڈاگ، دو فرائیڈ رائس۔۔۔ میزوں سے چھری کانٹوں کی آوازیں۔۔۔ سرگوشیاں، مذاق، سنگیت کی دُھن۔۔۔

میں ساتھ ساتھ بل کاٹ رہا تھا۔ بیروں کو بلانے کے لیے بار بار گھنٹی بجا رہا تھا۔ پیسے لے رہا تھا۔ ہر میز پر میری نگاہیں گھوم رہی تھیں۔ لیکن ناصر آج پہلی بار کسی اور دُنیا میں تھا۔ اچانک وہ مجھے بھی اپنی دُنیا میں لے گیا اور اس بات سے چونکا دیا کہ وہ اپنے گھر میں صرف ایک بنڈل بیڑی ایک ماچس، پانچ کپ چائے اور دو وقت کی روٹی کا حق دار ہے۔

کچن کے دروازے کے پیچھے سے کئی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ کتنا بھی لڑیں۔ آپس میں، وقت پر ایک دوسرے سے جُڑ جاتے ہیں۔

صبح پانچ بجے میرے اندر گھنٹی بج اُٹھتی ہے پھر میں سو نہیں سکتا۔ پوری عمر بھی ہوا۔ راستے میں ہی ہاتھ منہ دھو کر یہاں چلا آتا تھا۔

"ارے تم بھی پانچ بجے اٹھتے ہو؟" اندر ہی اندر کھسیا اُٹھا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مجھ سے پہلے پہنچنے والا آدمی اتنے ہی بجے اُٹھے گا۔ اب میرے اندر بھی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی جو روز صبح پانچ بجے بج اٹھتی ہے۔ گھنٹی کہاں سے اور کیوں بجتی ہے اسے ہم بالکل نہیں جانتے... نہ جانے گھنٹی کس طاقت سے بج اٹھتی ہے... اور کون بجاتا ہے؟

"ہاں کیا کہہ رہے تھے ناصر میاں؟"

"اب کہنے کو کچھ نہیں رہا سرکار۔ صبح لڑکے نے صاف کہہ دیا، یہ ہوٹل نہیں جہاں مفت کھانا ملتا ہو۔"

باہر برآمدے میں ڈیرہ جماتے ہوئے وہ ریستوراں کا پھر انگ بن گیا۔ آتے جاتے گاہک اُسے دو تین روپے دے جاتے۔ اُس نے اپنے پاس سگریٹ رکھنے شروع کر دیئے۔ کچھ نہ کچھ ان سے بھی بن جاتا۔ رات کو دوسرے ہوٹلوں کے نوکر بھی اس کے پاس آنے لگے۔ وہ روز خبر دیتا کہ فلاں ریستوران میں کتنی بکری ہے۔ یونین نے کسے پھانس لیا ہے، کون کس پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔

رات کو ریستوراں بند ہونے کے بعد خالی ہال میں تنہا بیٹھ کر کافی کا ایک پیالہ پینے میں جو آنند اور سکون ہے، اُسے ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ جہاں دن بھر رونق رہتی، وہاں ایک خاموشی... اس وقت سب بھول جاتا۔ صبح کے کٹے ہوئے پنکھ لوٹ آتے... اندر ایک پھڑپھڑاہٹ ہوتی جسے بہت قریب سے محسوس کیا جا سکتا ہے... ہر گھونٹ کے ساتھ پھڑپھڑاہٹ بڑھ جاتی۔

ایک ایسی ہی رات کو نامر میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس اڑان اور پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ میں معلوم ہی نہ ہوا کہ کب وہ آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیا حال ہے نامر میاں؟"

"ایک وردی چاہیے مالک۔ بھیک منگوں کی طرح مجھے باہر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا ایک خواہش اور ہے حضور۔ مجھے نمبر ایک کا ایک بلا بھی عنایت کریں۔"

"نمبر ایک کا؟"

"یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ سرفراز کی ملازمت مجھ سے پانچ مہینے زیادہ رہی... ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بہتر کام کرنے والا کیا عمر بھر نمبر ایک نہیں بن سکتا؟"

اس سے باتیں کرنے کی اُمنگ ختم ہو گئی۔ میں بُری طرح زخمی ہو اُٹھا۔ اپنے سوچنے کے طریقے سے نفرت ہونے لگی۔ کیا میں قابلیت کی جگہ صرف سال گنتا رہا۔

رات کو ریستوران سے باہر نکل کر جگمگاتے، سنسان، خاموش اور کھلے حضرت گنج میں اکیلے گھومنا ٹھنڈک میں اُڑنے کی طرح لگتا۔ جی کرتا رات بھر ننگے پاؤں گھومتا رہوں۔ ہر رات لگتا کہ کوئی دوسرا حضرت گنج ہے۔ جسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اس انوکھے سکھ میں نامر میرا ساتھی بن گیا۔

"حضور، کیا گھر کا حساب کتاب ہوٹل سے بھی پیچیدہ ہوتا ہے؟" ایک رات گھومتے ہوئے اُس نے پوچھا تھا۔

اس رات میں خاموش رہا۔ بات بات میں اس کے منہ سے گھر لفظ سن کر لگتا کہ وہ میرے منہ پر تھپڑ مار رہا ہے۔ کہاں ہے میرا گھر؟ کیا میرا گھر صرف ہوٹل نہیں ہے؟ گھر تو میں صرف سونے کے لیے جاتا ہوں؟

"کیا ہوتا ہے گھر حضور؟ بیوی روز طعنے دیتی ہے کہ تم کیا جانو گھر؟"

میں خود سوچ میں ڈوب گیا جس گھر کے لیے میں نے زندگی لٹادی... کیا ہے اُس کا رنگ روپ؟ اس طرح کی باتیں میں نے پہلے کبھی کیوں نہیں محسوس کیں؟ کیا نامر صرف ان باتوں کا احساس کرانے کے لیے لوٹا ہے۔ کیا اس کی واپسی میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے ہوئی ہے... میں ایک دم تنہا اور بے گانا ہو جاتا اور سب بے کار لگنے لگتا۔

"کہتی ہے کہ ایک ایک پیسے کے حساب سے گھر چلتا ہے۔ آٹا، ترکاری، کپڑوں کا

ب اسی طرح چلتا ہے۔"
"نام سجاتی، ریستوران بھی ایک ایک پیسے کے حساب سے چلتا ہے۔ ایک فی صد
ع کم ہو جانے سے راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔"
"سچ حضور! ہزاروں لاکھوں میں اتنی چھوٹی رقم کی کیا اہمیت؟ آپ مذاق کر رہے
، "میری بات اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔
حضرت گنج پارک کے ہم پارک میں کسی بینچ پر بیٹھ جاتے۔ جوتے اُتار کر اوس سے
یگی گھاس پر ننگے پاؤں رکھتے ہی اندر ایک گہرے سکون کا احساس ہوتا۔ جس میں نجات
ر تکتی دکھائی دیتی۔ وہیں سو جانے کی اونگھ بھی ہوتی۔ گھر کی خواہش بہت دور ہو جاتی
رختوں کی اوٹ سے جھانکتی گھڑی، پیچھے اونچی عمارت کی کھڑکیوں سے آتی روشنی، سڑک
ر گھروں کے بند پھاٹک سوچتا کیا یہ سب پہلے بھی یہاں تھا؟ جلد ہی اندر کا سکھ ایک

اداسی میں بدل جاتا۔
وہ جلدی میری اُداسی کو توڑ دیتا۔ وہ پُرانی باتیں اس طرح کرید تا جیسے ابھی ہوئی
ہوں پھر میں اس کی باتوں میں بہہ جاتا۔ کبھی احساس ہوتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟
رور دیر ہو جاتی۔ لوٹتے ہوئے گاڑی روک کر سگریٹ سلگاتا اور سوچتا کہ اس کی
دُنیا میں کیوں ڈوبتا جاتا ہوں میں؟ کیا کسی آدمی کا تعلق کسی پورے ماضی کو غلط ثابت

کر سکتا ہے۔
میرے دونوں بیٹے نامرکی باہوں میں جوان ہوتے ہیں۔ اب دونوں مجھ سے لڑتے
ہیں کہ میں اُس کے ساتھ کیوں گھومتا ہوں؟ کیا میں اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گھوم نہیں
سکتا۔ آپ کیوں بھولتے ہیں کہ وہ کبھی ہمارے یہاں معمولی ملازم رہ چکا ہے۔ میرے ہر

سوال کا جواب وہ یہی دیتے۔
"ارے حضور یاد ہے آپ کو!" ایک رات پارک میں بینچ پر بیٹھتے ہی اُس نے
کہا۔ میں بجلی کے کھمبوں سے آتی روشنی میں ڈوبتے ہوئے پودوں کو دیکھتا ہوا کہیں اور تھا۔
اور وہ ہانپ رہا تھا جیسے پارک کی پوری ہوا اس کے پھیپھڑوں کے لیے کم ہو۔ کبھی کوئی
بات یاد آتے ہی وہ بے تاب ہو جاتا۔
"یاد ہے آپ کو ایک بار تین نمبر ٹیبل پر مٹر پلاؤ میں ہڈی نکلی تھی۔ اُن دنوں سالا

گھسیٹا ہیڈ کک تھا۔ ہر ڈش میں میٹ کا شوربہ ڈالتا تو اس کا ایمان تھا پولیس تو ضرور آتی اُس دن، لیکن آپ کے سامنے لوگ سوڈے کی بوتل کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔"

وہ گھاس پر بچّوں کی طرح لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ مجھے لاکھ یاد کرنے پر بھی کچھ یاد نہیں آرہا تھا نہ یہ یاد تھا کہ گھسیٹا کک کس سال میں ہمارے پاس تھا۔

مجھے یاد کرانے لگا کہ میں نے اس دن بہت بڑا عجوبہ کر دکھایا تھا۔ رسوئی میں جاکر دیوار کی طرف منہ کرکے گالیاں دیں اور باہر آتے ہی کس مسکین انداز میں کہا کہ نان وِیجی ٹیرین کک نے ویجی ٹیرین کک کی نوکری لینے کے لیے ہی ایسی بدمعاشی کی۔ بولتے ہوئے ناصر کی آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ خوشی میں دیوانہ ہو اُٹھا۔

ماضی کے جنگل سے نکلی ہوئی اس کی ہر بات میں تاریخیں، دن، سال اور یہاں تک کہ وقت بھی صحیح ہوتا۔ ایسا لگتا کہ اس نے ریستوران کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچا تھا زندگی بھر۔ کیا وہ اس پونجی پر اپنی ساری زندگی کاٹ سکتا تھا؟ ساتھ ہی اس کی ہر بات کے بعد میں زخمی ہو جاتا۔ میری شیخیاں، ہتھکنڈے اور بزنس کی بدمعاشی مجھے ہی کھا گئی۔ کبھی حساب کتاب کی پرانی کتابوں کو دیکھ کر چونک اُٹھتا۔ کیا بیس برس پہلے کریم چار روپے سیر تھی اور دودھ بارہ آنے۔

سوچا تھا ریستوران دونوں لڑکوں کے حوالے کرکے نجات ملے گی، ملی نہیں میرے پنکھ کٹ کر ریستوراں میں ہی رہ گئے۔ اُڑتا کہاں؟ اب ناصر مجھے پہلے سے بھی اچھا لگنے لگا۔ شاید اس لیے کہ میرے پاس اس کی طرح جینے کا کوئی ڈھوکا بھی نہیں تھا۔ میرا خواب کہ اب آزادی سے گھوموں گا۔ کوئی بندھن، کوئی مجبوری نہیں ہوگی۔۔۔ کہاں کھو گیا میں یہ بھی نہیں سمجھ پاتا۔ وہ دن یاد آتے جب رات کو گھومتے ہوئے قدم خود بخود سُدھا کی کھڑکی کی طرف جا پہنچتے۔ راتیں چہکتے ہوئے گزر جاتیں۔ وہی سدھا آج کہتی ہے کہ کیا دیا ہے میں نے اُسے۔ کبھی گھر بھی رُکا ہوں، کبھی بچّوں کی صورت بھی دیکھی ہے میں نے۔۔۔! گھر میں مجھے دیکھتے ہی سب سہم سا جاتا ہے۔ میرے پہنچتے ہی سب کی باتیں رُک جاتی ہیں۔ جب کبھی میں بولنے کی کوشش کرتا ہوں تو کوئی ڈھنگ کی بات دماغ میں آتی ہی نہیں۔ کبھی میں کتنی باتیں کیا کرتا تھا۔

جب سُدھا بچّوں کا نام لیتی تو مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا۔ کتنے سرل تھے میرے ماتا پتا

کتنا نرمل تھا اُن کا پیار! کتنی صاف باتیں کیا کرتے تھے۔ پتا ہر اتوار کو جیبوں میں ہاتھ ڈالتے۔۔۔ ٹافیاں، میٹھی گولیاں دیکھتے ہی ہم سب ناچ اٹھا کرتے۔ کلکاریاں مارا کرتے۔ میں اپنے بچوں کو یہ سب کیوں نہیں دے پایا؟"

پہلے بیوپار ٹھیک کر لوں۔ زندگی ٹھیک کرنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ برسوں پہلے اتنی چھوٹی سی بات مجھے کہاں سے کہاں لے گئی۔ جب میں چھنتا جا رہا تھا، سمجھتا رہا کہ میں کچھ بن رہا ہوں۔

"پڑے رہو۔ کون سا تمہیں اب کہیں جانا ہے!"

اُس دن سُدھا کی آواز مجھے چیر گئی۔ سوچا تھا چلو ریستوران صبح ہی میں کھول دیا کروں۔ سنتے ہی غصے میں ریستوران جانے والی سڑک پر نکل آیا۔ شانت ندی، پُل، اُڑتے سفید بگلوں کی قطار، ودر درشن کا مینار، اُونچی عمارتیں۔۔۔ سب پُرانی لگ رہی تھیں۔ ہاتھوں میں چھڑیاں پکڑے، چہکتے کھلکھلاتے ہوئے بیس پچیس بوڑھوں کا قافلہ پاس سے گزر گیا۔ سب نے مجھے دیکھا اور مسکرائے۔ وہ آزاد تھے اور بے فکر۔ کیا ان میں سے مجھے ایک بھی نہیں پہچانتا۔ ایک کڑواہٹ اندر سمو گئی۔

رات کو بڑی بہو کی بات نوک دار کیل کی طرح اندر گڑ گئی تھی۔ "ڈیڈی کے ساتھ بیٹھنا بہت آڈ لگتا ہے۔ نروس فیل کرتی ہوں۔" اور بڑے بیٹے نے ہنس کر کہا تھا کہ "اولڈ مین پر ترس کھاؤ۔"

"کیوں جا رہا ہوں ریستوران۔ سانس گھٹ رہا ہے، گھٹے، مجھے کیا مطلب؟ لیکن یہ سب تو میرا ہے۔ میں نے بنایا ہے۔ اس میں میرا خون شامل ہے۔" میں تیز قدموں سے چلنے لگا۔

"تالا کیوں نہیں کھلا ابھی تک؟" جانتا تھا کہ اب دروازہ دیر سے کھلتا ہے۔ جب سے گیا ہوں بکری کا کھاتا ایک دن بھی نہیں چلا۔ سامان روز کم ہو جاتا ہے۔ گھی کی کھپت بڑھ گئی ہے۔ چوری ہو رہی ہے اور اب تو صاحب گھر پر ہی موج اُڑاتے ہیں۔

"اب پرانے نوکروں کو نوٹس مل رہے ہیں حضور!" نامر نے جیسے برف توڑنے والا سوا چبھو دیا مجھے۔

"بغیر مجھ سے پوچھے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اندر ہی اندر شرمندہ بھی ہوا کہ اب میری پہچان

کیا حیثیت؟

اندر پہنچتے ہی بیرے نے چائے کا کپ لاکر سامنے رکھ دیا۔ مجھے تکتا دیکھ کر بیرا بولا کہ "کل گیس ختم ہو گئی ہے۔"

"گیس" میں بھنّا اٹھا۔ "جانتے ہو اس سے کتنا خرچ بڑھ جائے گا۔"

تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ چھوٹے کی آواز تھی کہ "پاپا آپ پھر وہاں پہنچ گئے؟ گاڑی بھیج رہا ہوں...۔"

تنگ آکر میں نے فیصلہ کیا کہ جو زمین جائیداد ہے سب لڑکوں کو سونپ کر خود ہری دوار کے کسی آشرم میں دو کمرے بنوا کر رہوں گا۔ باقی زندگی سیوا بھگتی میں گزار دوں گا۔ وہاں مجھ جیسے سینکڑوں آدمی رہتے ہیں۔ آج مجھے جانا ہے۔

بار بار ناصر کا دھیان آنے لگا۔ اُس کا کیا ہوگا۔ وہ اب کیا کرے گا؟ چار دن پہلے چھوٹے بیٹے نے طعنہ مارا تھا کہ میں نے ہی اس بیماری کو باہر برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ میں نے تلملا کر کہا تھا۔ مجھ سے زیادہ اس کے خون نے اس ریستوراں کو سینچا ہے۔ اُسے پرے نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے میری بات سنی بھی نہیں تھی۔ وہ وہاں سے اُسے پرے کر کے آیا تھا۔

چار دن پہلے ــ شام میں اُوپر ریستوراں کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناصر کی آواز نیچے سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ میرے لڑکوں کی چاپلوسی میں لگا تھا...۔ یاد ہے حضور جب آپ پانچ برس کے تھے ایک دن آپ میرے ساتھ بیلی گارڈ گھومنے گئے تھے۔ کھنڈروں میں آپ سو گئے اور میں روتا ہوا آپ کو کھوج رہا تھا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔۔۔ ایک دن تو آپ کو اس کرسی پر بیٹھنا ہی تھا۔ لیکن حضور، بڑے مالک کی باتوں کو بھولیے گا مت۔ چھوٹوں پر کی گئی رحم دلی ہی بڑے بزنس کو جنم دیتی ہے۔"

"کیا بک رہے تھے نیچے؟" اُسے سیڑھیوں میں دیکھتے ہی میرے منہ سے نکلا۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے۔ اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ چھوٹے نے ہی اُسے اُوپر بھیجا تھا۔ آنکھیں موند کر نیچے بیٹھتے ہی بولا تھا کہ بک بک نہ کروں تو اور کیا کروں۔"

اپنے سامنے کافی کا پیالہ دیکھتے ہی وہ چونک اُٹھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"پیو، اب کیا فرق پڑتا ہے؟" لیکن مالک اور نوکر کا رشتہ برقرار تھا۔
چھوٹے اور بڑے دھڑ دھڑاتے اُوپر آ چکے تھے۔ کافی کے ان چھوٹے پیالے کی طرف دیکھے بغیر بولے کہ "ناصر میاں، کافی پی رہے ہو؟ خوب پیو۔ پاپا کی اس کافی نے ریستوران کو اُوپر اٹھا دیا ہے۔"

"پاپا، وکیل صاحب نے کاغذات بھیجے ہیں۔" چھوٹے نے کاغذات میز پر بچھا دیئے۔

"پاپا پلیز!"

"مجھے غصّہ آ گیا تھا کہ اس میں خوشامد کی کیا بات ہے۔ سب کچھ تو میں خود کر رہا ہوں لیکن دونوں اس طرح پیش آ رہے تھے مانو مجھے پھسلا کر دستخط کرا رہے ہوں۔"

"اُٹھاؤ!" میں نے چیخ کر کہا تھا۔ اور وہ اُٹھا کر نیچے اُتر گئے۔

ایک منحوس خاموشی چھا گئی۔ ناصر کی نگاہیں میرے اندر تک اُتر رہی تھیں۔

"مکّار!" اسٹول پر رکھا ہوا پیالہ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ "کیا کیا آپ نے کاغذ پڑھے بھی نہیں دستخط کر دیئے!" اس کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس کے منہ سے اپنے نالائق اور لالچی لڑکوں کے لیے مکّار لفظ سن کر بہت بُرا لگا، مگر میں پی گیا۔

"اب کیا ہوگا؟ آپ اس ریستوران کے بنا کیسے رہیں گے؟" وہ رونے لگا۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے حضور۔ بہت پڑتا ہے۔ یہی خدشہ تھا مجھے۔ جب وہ جگہ پاس نہ ہو، جہاں زندگی گزری ہو تب باقی زندگی کیسے کٹے گی؟ سب لٹا دیا آپ نے؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگایا اور اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ جو لٹنا تھا وہ تو بہت پہلے لٹ چکا تھا۔ اُس نے اپنا کوٹ اُتارا۔ قمیض دور پھینک دی۔ پیٹھ میری طرف کرتے ہوئے بولا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ اپنی جگہ سے دور ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے۔

"ایسے ہی نہیں چلا آیا تھا آپ کے پاس دوبارہ۔" وہ بچّوں کی طرح بلک رہا تھا۔ اب میرا کیا ہوگا حضور؟ کہاں جاؤں گا؟ مجھے تباہ کر دیا آپ نے؟"

اس کی پیٹھ پر زخموں کے نشان دیکھتے ہی میں کانپ اُٹھا تھا۔ کیا میری خود غرض اولاد بھی مجھ سے ایسا ہی سلوک کرے گی۔

"ہم یہیں برآمدے میں رہ لیں گے۔ ہمیں کون اُٹھا سکتا ہے یہاں سے؟"

ناصر کو روتا سسکتا دیکھ کر لگا تھا میں نے جھوٹ کہا ہے۔ کاغذات پر دستخط کر کے میں نے خود کو چاہے نہ ختم کیا ہو، اُسے ضرور برباد کر دیا، جو اُس کے پاس ہے میرے پاس نہیں ہے، جو میرے پاس ہے اُس کے پاس نہیں ہے۔

اچانک خیال آیا کہ تیرتھ استھان جانے سے پہلے دنیاوی اور خاندانی جھنجھٹوں سے مکتی پانے کے لیے سب کچھ اپنی خود غرض، مکار اور بے رحم اولاد کے نام کرتے ہوئے مجھے ایک بار بھی ناصر کا خیال کیوں نہیں آیا۔ کیا اس کا کوئی حق نہیں تھا؟ اُس پر ترس کھانا اور ہمدردی جتانا اپنے ہی منہ پر ایک گالی لگی۔

(آج کل، نئی دہلی مئی ۱۹۸۴ء)

دیویندر اِسّر

خوشبو بن کے لوٹیں گے

—— شاید تمہیں کینسر ہے۔

—— (خاموشی)

—— یہ مسّا کب سے ہے؟

—— قریب ۲۵ برسوں سے۔

—— پہلے بھی اتنا بڑا تھا

—— نہیں۔

—— اور اس کا رنگ

—— معلوم نہیں

—— ابھی تو یہ باہر کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کی جڑیں اندر بھی گہری ہوتی جائیں گی۔ اور....

.... پھر

—— (خاموشی)

—— موت بھی ہو سکتی ہے.... آپریشن ضروری ہو جائے گا۔ بایوپسی بھی کرا لو۔ اسی مہینہ

—— میں چلا آیا۔ اگر یہ کینسر ہی ہے تو مجھے موت کے دہانے تک لے جانے کے لیے اسے ابھی پانچ سات برس اور لگیں گے، اور تب تک میں ۵۵۔ ۵۷ سال کا ہو جاؤں گا اور اس سے زیادہ زندہ رہنے کی نہ تو میری خواہش ہے اور نہ ہی مجھے پسند ہے۔ اگر علاج ہو بھی گیا تو کتنی عمر بڑھے گی۔ یہی ۵۔ ۷ برس، اور موت شاید پھر بھی کینسر ہی سے ہو گی۔ اگر اس دوران کوئی حادثہ نہ ہو گیا تو! اتنے سال تو اسپتالوں کے چکر کاٹتے اور مرض کی تشخیص اور علاج ہی میں کٹ جائیں گے۔ کیوں نہ میں یہ برس کچھ ہوش میں اور کچھ جنوں میں گزار دوں۔

فکر ہے تو مجھے اس کینسر کی جس کی جڑیں تو باہر ہیں لیکن جو پھیل رہا ہے میری روح کے اندر کتنے برسوں سے۔ اس کینسر سے ہر روز مجھے چھوٹی چھوٹی موتیں ملتی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑی اور آخری موت نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ تمہاری روح گہنا جائے گی۔ اور میں ان چھوٹی چھوٹی موتوں سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے اس لمحہ اگر بڑی اور آخری موت ہو بھی جائے تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔ میں نے موت کو کئی بار کئی طرح سے، کئی زاویوں سے سوچا ہے کہ اب وہ جسم کے فنا ہونے کا نہیں روح کی نجات کا مسئلہ بن گئی ہے۔ میں اپنے احساس کو بچانا چاہتا ہوں۔ جسم اپنی راہ خود ڈھونڈے گا۔

——جب میں پانچ برس کا تھا تو ایک دن نوکر آیا۔ میں سو رہا تھا۔

——ماں بلا رہی ہے۔ اس نے کہا۔

——سونے دو، بڑی نیند آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل لی۔

——نہیں، ماں جلدی بلا رہی ہے۔

——صبح مل لوں گا۔

——اس نے مجھے زبردستی گود میں اٹھا لیا اور نیچے لے آیا۔ میں روتا جاتا اور اس کے کاندھے پر وار کرتا جاتا تھا۔ ماں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر چارپائی سے لگے پتا ماں کا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ موسی، نانا، ماما بھائی اور کئی لوگ کمرے میں موجود تھے۔ ماں نے مجھے قریب بلایا۔ میں اس کی چھاتی پر سر رکھ کر سو گیا۔ شاید اس نے میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔ دعائیں دی تھیں۔ کچھ یاد نہیں۔ سب خواب تھا۔ جو ٹوٹا تو سب رو رہے تھے۔

ماں نہیں رہی تھی۔

مجھے ماں کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔ بس ایک چہرہ کچھ سہما سہما سا۔ جب ہم مکان میں داخل ہوتے تھے، گھر کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ کمروں میں سب صندوق، الماریاں، دراز کھلے ہوتے تھے۔ ان کا سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ فرش پر ریشمی، مخمل، کمخواب، رنگ برنگ کے کپڑے ساڑیاں بکھری ہوتی تھیں۔ چور آئے تھے۔ ماں کہہ رہی تھی۔ تمہارے پاس اتنے خوبصورت کپڑے ہیں۔ تم پہنتی کیوں نہیں۔ میں کہہ رہا تھا۔ یہ سفید گاڑھا کیوں پہنتی ہو؟

ماں مسکرا دی تھی۔ خوف کی کالی چھایا اُڑ گئی تھی۔

جب تو بڑا ہو جائے گا تو سب کچھ جائے گا۔

میں بڑا کب ہوں گا!

میرا جنم ۲۴ اگست کو ہوا تھا۔ ۱۴ اور ۱۵ کی رات وطن آزاد ہوا تھا۔ میری پیدائش کے ۱۹ برس بعد۔ اس لحاظ سے میں بھی اپنے کو ان بچوں میں سمجھتا ہوں جن کا ذکر سلیمان رشدی نے اپنی کتاب "مڈ نائٹ چلڈرن" میں کیا ہے۔

ماں شاید میٹرک پاس تھی، یا مڈل پاس ۱۹۲۴ کی بات ہے اور مجھے یاد آیا وہ چہرہ، جس نے میری پانچ سال کی عمر میں ہی مجھے ہندی اردو پنجابی اور انگریزی پڑھانا شروع کر دیا تھا اور دیا لمس کا احساس اور پیار کا شعور۔

مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ دو پترکار بات چیت کر رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تمہارے سامنے عیدی امین بیٹھا ہو اور میں تمہیں بندوق دیدوں تو تم کیا کرو گے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ وہ بندوق میں عیدی امین کو دیدوں گا اور کہوں گا۔ یہ تمہارا ہتھیار ہے میرا نہیں۔

نفرت کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے سیاہ۔ اور پیار کے رنگ ہزار۔ میں نے لکھا۔ ہر آدمی جب کسی دوسرے آدمی کے قریب آتا ہے، تو اس سے کچھ لیتا ہے اور کچھ دیتا ہے۔ مجھے تمہاری زندگی سے کئی بار ادھار لینا پڑا ہے۔ اور بار ہا ملی ہے، کسی بھی پرانی کرنسی اور کھوٹے سکے۔ لیکن میری یہی کوشش رہی ہے کہ اگر میں بیاج نہیں دے سکتا تو کم از کم اصل زر کو ہی نئی کرنسی اور چمکتے کھنکتے سکوں میں لوٹا دوں۔ میری زندگی اور تخلیق کے بیچ لین دین کا یہی چلن رہا ہے اور تمہارے اور میرے درمیان بھی یہی طریقہ چلتا رہے گا۔

میرے ذہن میں یہ سب کچھ گڈ مڈ کیوں ہو رہا ہے۔

کچھ گڑ بڑ نہیں برخوردار، تم ایڈی پس کامپلکس کا شکار ہو۔ مدر فکسیشن (Mother Fixation) ان فینٹ سیکس سٹریلیٹی (Infant Sexuality) یعنی ان فنٹائل سیکسوئل ازم۔ (Infantile Sexualism)

۔۔۔ گرودیو علاج۔۔۔

۔۔۔ بالکل سادہ اور آسان۔ ماں کو بھول جاؤ۔ اس کی ہر یاد کو، ہر عکس کو مٹا دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن میں ماں کو نہیں بھول سکا۔

میں تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اس کا علاج ہے، اپنے اندر زندہ ماں کی ہتیا کر دو، ایک بچے سے بڑھ کر بالغ ہو جاؤ، اس بچے کو بھی قتل کر دو، ہر اُس چیز کو جس کا تعلق تمہاری ماں سے ہے، تمہارے بچپن سے ہے، اسے فنا کر دو۔

میں نے فرائڈ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔ کیا میں اب کسی عورت سے نارمل رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔

لیکن فرائیڈ کی موت ہو چکی ہے۔

کتنا سمے بیت گیا۔ میں نہ اپنی ماں سے الگ ہو سکا اور نہ ہی اپنے اندر کے بچے ہی کو پیچھے چھوڑ سکا۔ اپنی ماں کی نابھی ڈور سے بندھا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھائے کوئی کتنا لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔ لیکن سوال تو اس بچے کا ہے۔

اس بچے کا کیا ہو گا؟

اس کیو مین یا (Caveman) کا کیا ہو گا؟

کیا کوئی تہذیب اپنے آدم پرش کی لاش پر پرورش پا سکتی ہے۔

جب ہمارا آدم پرش مر جاتا ہے تو دوسرے تمام انسانوں سے ہمارے سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

میں نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"میں کب سے سفر میں ہوں، ایک بے منزل سفر میں، میں جنگل میں پیدا ہوا، جوان خوبرو اور باشعور اور باحس وہیں میری موت ہو گئی۔ جب میں نے دوبارہ جنم لیا، بالغ ہوا تو میں نے ایک جنگل بنایا۔ لیکن یہ وہ جنگل نہیں تھا جس میں میں جوان، خوبرو، باشعور اور باحس ہوا تھا، بلکہ وہ جنگل تھا جس میں، میں جواں مرگ، بے چہرہ اور بے حس ہو گیا۔ ۔ ۔

تم جہاں پیدا ہوتے ہو، اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے، اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو۔ لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو، اس نگر کو، اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے۔ لیکن میری تہذیب، میرا سماج، میری حکومت، میرا مذہب، میری تعلیم، میری معیشت، روزگار، رشتہ دار، بیوی، بچے مجھے ایک گھیرے میں بند کر کے میرے اندر کے اس بھوت کو نکالنے کے لیے مجھے ہر روز اذیت دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھوت یا پرچھائیں میرے اندر سے نہیں نکلتی۔ وہ لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے میرے سارے جسم کو

داغ دیتے ہیں۔ بھوت چھٹپٹا کر رہ جاتا ہے۔ لیکن نکلتا نہیں۔ میں اسے مار نہیں سکتا وہ اُسے نکال نہیں سکتے۔ یہ میری قسمت ہے یا میری ٹریجڈی، کہہ نہیں سکتا۔

اسی پانچ اور پچاس برس کے دوران ۱۵ سال کی عمر میں مجھے کسی نے اپنے جسم سے میرے جسم کا شعور دیا۔ بات کتنی سادہ تھی۔

—— میں نہانے جا رہی ہوں۔ میرے کپڑوں کا دھیان رکھنا۔ جہلاٹ ندی کے کنارے اس نے دھیرے دھیرے ایک مخصوص انداز میں اپنے کپڑے اتارنا شروع کئے۔ ہر کپڑے کی ہر حرکت پر اس کا جسم تھرکتا، وہ مسکراتی، بالوں کو جھٹکا دیتی۔ دوپٹہ، شلوار، قمیص، انگیا اور کچھ بھی نہیں شاید ان دنوں کچھ بھی نہیں کا رواج تھا۔ میں محو حیرت اس بدن کو دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت، سڈول، تھرکتا ہوا منہ زور گھوڑے کی طرح بے قابو ہوتا ہوا۔

—— تم بھی نہاؤ، پانی بڑا ٹھنڈا ہے، اس نے اچانک کہا اور ایک چھینٹا پانی کا میرے منہ پر پھینک دیا۔

—— لیکن تمہارے کپڑے۔

—— اپنے کپڑوں کے نیچے رکھ دو۔ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ وہ پانی میں تھی۔ میں پانی میں تھا سورج دھیرے دھیرے اُگ رہا تھا۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے سے۔ اس کی سرخ سنہری کرنیں، اس کے سنولائے، گدرائے بدن سے پھسل کر پانی کی لہروں پر تیر رہی تھیں۔ پانی کی آئینہ لہریں، سورج کی ست رنگی کرنیں بدن پر بدہوائی شبنمی بوندیں، تھرکتے انگوں کے رقص کے پس منظر میں بہتے پانی کا گیت۔

—— میری پیٹھ کو ذرا دھو دو۔ میل چھوٹ جائے گی۔ میرے ہاتھ نہیں پہنچتے۔ اس نے کہا تھا۔

اور میری انگلیوں نے پہلی بار آنچ محسوس کی تھی۔ آنچ اتنی شیتل اتنی راحت بخش ہو سکتی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔

یہ خواب تھا یا مدہوشی۔

کتنے برس بیت گئے۔ اس منظر اور جسم کی بیداری کو۔ حسن کی ایک حیرت کن تصویر جل کی کے درپن کے پیچھے، سات رنگ سے اندر دھنش کے۔ بدن کے لمس اور گداز اور رنگ اور تھرکن کا احساس۔ اُف۔ آج بھی جب کوئی خوبصورت بدن دیکھتا ہوں تو انگلیوں میں ہلکی ہلکی آنچ

اُٹھنے لگتی ہے۔ اور اس بدن کے پرے اُگتے ہوئے سورج کا منظر پیتے پانی کا گیت دیکھتا سنتا ہوں، تو روشنی پانی میں بدل جاتی ہے اور پھر وہی مدہوشی۔

اور ایک بار پھر میں جسم کے نارمل رشتے سے الگ ہو جاتا ہوں۔ بدن برف کی سِل بن جاتا ہے اور سلگتی آنچ ٹھنڈی راکھ۔

ہے ایشور۔۔۔کیوں تم بدن کے سورج کو اُگنے اور گِرتے ہوئے پانی کے گیت کو بہنے سے روک نہیں دیتے۔

بچپن کے پانچ برس تو ہوش آنے سے قبل ہی نیم بے ہوشی میں گزر گئے۔ قریب نصف صدی تک میں نے زندگی کو شعوری طور پر جیا۔ ایک دو سالوں میں، میں ۵۵ برس کا ہو جاؤں گا۔ اور پھر میں زندگی کے پورے جسم کو اپنی انگلیوں سے چھوؤں گا اس کے ہر ایک ایروجنیک زون (Erogenic Zones) کا لمس محسوس کروں گا کہ مجھ میں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں جو چالیس سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔

لیکن میرے اور دوسرے جسم کے بیچ یہ فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، بڑھتا جائے گا۔ جب تک کسی جسم کے پیچھے سورج نہیں اُگتا۔ جب تک کوئی بدن ندی کی لہروں میں نہیں ڈوبتا۔

پانچ ستاروں والے ہوٹل کے بند کمروں میں سمٹے پلش بستروں پر لیٹے جسموں اور کھلے تلے آکاش کے تاروں کی چھاؤں میں بیکراں ریت پر پھیلے جسموں میں شاید ہی فرق ہے۔ ایک دوسرے سے ہم آغوش جسموں میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے اس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔

کچھ سال پہلے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں سے دوسری گاڑی پکڑنی تھی میں جس بنچ پر بیٹھا تھا۔ اس پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ سیدھی سادی۔ کتاب پڑھنے میں مگن۔ وہ کتاب تھی۔ نینا اونیل اور جان اونیل کی "شفٹنگ گیئرز"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کچھ عرصہ پہلے اس کتاب کو پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ کیسی لگی ہے کتاب، اچھی ہے۔ جواب ملا۔ پھر چند ایک باتوں کے بعد بولی۔

۔۔۔میں نے اِس کتاب کو پڑھنے سے پہلے ہی زندگی کا گیئر بدل لیا تھا۔ لیکن جب دوبارہ گیئر بدلنے کی کوشش کی تو گاڑی پٹری سے اُتر چکی تھی۔

۔۔۔مطلب

میں پری میچیور ایجیکولیٹر...

— اوہ، میں نے ہمدردی ظاہر کی۔
— اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔ وہ مسکرائی۔
— لیکن۔
— دراصل میں ورمن لب کا شکار ہو گئی تھی۔
— آپ کو افسوس ہے۔ کیا آپ مردوں سے آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتیں۔ آپ کے ہندوستانی سنسکار۔۔۔ میں تقریر کے موڈ میں تھا۔
— سوال مردوں سے آزادی یا عورتوں سے آزادی کا نہیں۔ سوال ان سنسکاروں اور فینٹسی سے آزادی کا ہے۔ جو آزادی کے نام پر باہمی رشتوں کو توڑ دیتے ہیں۔

اب وہ بول رہی تھی۔

— شادی کرنا، بچے ہونا ہی کافی نہیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن آزاد کاروبار یا نوکری بھی تمہیں نجات نہیں دے سکتی۔ سماج میں اسٹیٹس یا رتبہ سب بے سود ہے۔ اگر تم دوسرے انسانوں سے دور ہو جاتے ہو تو تمہاری زندگی کے بھی کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔
— کیا آزاد ہونے کا احساس آپ کو تسکین نہیں دیتا۔ آپ کے پاس اپنا پیسہ ہے جسے چاہے جیسے خرچ کریں۔ سوشل سرکل ہے۔ جسم اور من آزاد ہے، پیسہ، اسٹیٹس، آزادی، کچھ بھی تمہارے من کی تنہائی کو بھر نہیں سکتا۔ ہر چیز کی اہمیت دوسری چیزوں سے اس کے رشتے میں ہے۔

پھر اس نے جو کچھ کہا، وہ یہ تھا۔

ہر آدمی اپنے گہرے جذبے اور تخیل کی بلند ترین اڑان میں تنہا ہوتا ہے۔ صحیح ہے۔ لیکن انسان کا دوسرے انسان سے ایک رشتہ ہوتا ہے۔ درد کا رشتہ اور یہ رشتہ این کاؤنٹر (encounter) اکیلے انسان کا نہیں، دو انسانوں کا باہمی تجربہ ہے۔ یہ لوگ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں۔ جسم کا کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہ این کاؤنٹر نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنی حفاظت کے لیے پہنے زرہ بکتر اور ہیلمٹ اتار پھینکنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ انھیں یہ ڈر رہتا ہے کہ ننگے من کے ساتھ وہ محفوظ نہیں۔ اگر کوئی انسان کسی دوسرے کو یہ وشواس دے سکتا ہے کہ وہ اس کے تخیل اور جذبے میں داخل ہونے کا جوکھم اٹھانے کو تیار ہے۔ تو این کاؤنٹر پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم تشویش اور خوف اور خدشے

سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ سیکس یا نو سیکس یا جسم کا کوئی سوال نہیں۔ یہ بندہ پیرا سیکچوئل (Parasexual) (ماورائے جنس) ہے۔ مکمل انسان کے تجربے کا جسم کا عریاں ہونا یا کمرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اپنا جسم شیئر (Share) کر سکتے ہیں لیکن عینشنسی نہیں۔ خواب، خوف، جنون، کامنا، ہم ڈرتے جسم سے نہیں، دل سے ڈرتے ہیں۔

—— لیکن اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

—— یعنی...

—— آپ کا رشتہ ہے دل کا لیکن جسم کا رشتہ نہیں۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ دوستی یا انٹی میسی میں عورت کو عورت کے روپ میں، اور پرش کو پرش کے روپ میں لینا ایک طرح کا سستا پن ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

—— ہاں۔ عورت اور مرد کا رشتہ جنس سے عاری بھی ہو سکتا ہے اور جنس پر مبنی بھی۔ لیکن میرے خیال میں عورت اور مرد کی دوستی میں بھی جنس کا کچھ نہ کچھ عنصر کسی نہ کسی روپ میں ضرور شامل رہتا ہے۔ شاید یہ پرسنل ہوتا ہے۔ ہر انسان کی دُنیا میں کتنا کچھ ہے۔ شاید وہ اپنے ہم راز دوستوں کے سوا کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ایسا کچھ رہ جاتا ہے جو وہ ان سے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ ماسوائے اپنے سے لیکن حالت تب اور بھی پر اسرار اور سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ جب وہ یہ جو باقی بچا رہتا ہے۔ اپنے سے بھی شیئر کرنے سے ڈرتا ہے۔

برسوں بعد میں نے محسوس کیا کہ جسم سے پرے بھی کئی رنگ ہوتے ہیں۔ کئی آوازیں ہوتی ہیں۔ میں جسم سے پرے اور پریا الگ نہیں ہوں۔ لیکن جسم محض بستر نہیں۔ جسم ایک چھوٹا سا گاؤں بھی ہے اور وسیع شہر بھی۔ جسم ہمالیہ بھی ہے اور بگولے اُٹھاتا ریگستان بھی۔ جسم جنگل بھی ہے اور خواہشوں کا آباد نگر بھی۔ جسم جسم بھی ہے اور نہیں بھی۔

—— جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس میں تضاد ہے۔

—— لیکن جب تک یہ تضاد رہے گا، میں زندہ ہوں۔ جس دن یہ تضاد مٹ جائے گا میں بھی نہیں رہوں گا۔

بھری محفل میں ایک راز کی بات کہہ دوں۔ میں نے کئی بار یہ کیفیت محسوس کی ہے۔ سردیوں کی دوپہر کو ایک گھماؤ دار چھوٹی سی گلی سے گزرتے ہوئے ننھے ننھے گھنگھروؤں کی نرم کھنک، لمبے بکھرے بالوں کی مہک ہوا میں اُٹھتی ہوئی۔ جسم کی تھرکن ہر بڑھتے قدم کے ساتھ ایک نغمہ

جسم کا ہر مسام بیدار ہو کر کھل جاتا ہے اور ہاتھ بڑھتے ہیں اس کی کمر کے گرد، ہالا بن کر لہرانے کے لیے اور رک جاتا ہوں۔ اور گلی گزر جاتی ہے۔ یا ایک شام کے امڈتے ہوتے اندھیرے میں کسی پارک کی روش پر چلتے ہوتے درختوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوتی روشنی اور جنتر منتر کی دیواروں سے جھانکتے ہوتے چاند کے سائے میں اس کے ساتھ۔ اس کے چہرے اور بالوں پر روشنی اور اندھیرے کا چھایا نرتیہ اور پارک پار ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی منظر ہیں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے ابھرتا تصویر سا چہرہ سڑک پار کرتے ہوتے لوگوں اور ٹریفک کے ہجوم میں تنہا۔

— کیا تم سیکسوئل رلیشن شپ نہیں کرتے۔

— کرتا ہوں۔ جسم کی زبان ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ لیکن جس ماحول میں ہمارا سماجی کرن ہوا ہے اس میں ہر وقت یہی احساس ہوتا ہے۔ پھول توڑنا منع ہے۔ گھاس پر چلنا منع ہے۔ یہ عام راستہ نہیں۔ ڈینجر۔ ہائی وولٹیج۔

میری دلچسپی پردے میں کم۔ اُڑان میں زیادہ رہی ہے۔ پھول میں کم خوشبو میں زیادہ۔ دل میں کم دھڑکن میں زیادہ، جسم میں کم روح میں زیادہ، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روح کا راستہ جسم سے ہو کر گزرتا ہے۔ جسم اور روح کے اس لمبے سفر میں کیا ملا؟ "شبد" شاید نہیں۔ بس کچھ نگاہیں، کچھ آوازیں، کچھ لمس، کچھ خوشبوئیں، کچھ ناکامیاں اور کچھ بے خواب راتیں جو جسم سے دل کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں وہ رشی بن جاتے ہیں اور جو دل کو نظرانداز کرتے ہیں اور بستر بہ بستر چلتے ہیں وہ بے حس۔ اس کشمکش میں کبھی دل ٹوٹتا ہے اور کبھی جسم شکست ہوتا ہے۔

کبھی آپ نے کسی عورت کو صبح کی پہلی کرن کی پہلی روشنی میں رات کے بستر کی شکنیں درست کرتے گنگناتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ آسودگی ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ ہمارے چہرے اور دل پر ہر روز کتنی شکنیں پڑتی ہیں۔ لیکن ہم انھیں درست نہیں کرتے یا کر نہیں پاتے۔ وہ گہری ہوتی جاتی ہیں۔ مستقل بن جاتی ہیں۔ ان میں دھول اور میل جمع ہو جاتی ہے اور ایک دن وہ ہمارے جسم، دل اور دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اس کا رنگ اور اس کی بو ہر کسی کو جو ہمارے قریب سے ہو کر گزرتا ہے۔ اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ کاش ہم کچھ اور پیش کر سکتے۔ پھول کی ایک پتی، اوس کی ایک بوند، تتلی کا پنکھ، دھنک کا رنگ، لمس، شکن درست کرتی عورت کی گنگناہٹ۔ لیکن میلے شیشے سے دیکھتے دیکھتے دوسرے کے چہرے تو میلے نظر آتے ہیں۔ اپنا چہرہ بھی میلا ہو جاتا ہے۔ دھول اور میل چہرہ بن جاتے ہیں۔

[redacted]

تو سوال درد کے رشتے کا ہے اور میں اس رشتے کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں بغیر کسی گہری سطح کو چھوتے، ہم زندگی کی باہری سطح کو محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن سوال اس درد کا ہے جو روح کی گہرائیوں تک سرایت کر چکا ہے جس کے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ اس کے لیے درد کی کس کس گلی سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر ہم حوصلے، وشواس اور جذبے سے اس گلی سے گزر جاتے ہیں تو ہماری محرومیاں الجھنیں اور اضطراب ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یاترا کا یہ انت نہیں کبھی کبھی انجانی راہوں پر بھٹک جانا۔ فقیروں کے بھیس میں نکل پڑنا زندگی کی پُراسرار دُنیا میں سفر کرنے کے لیے بڑا ضروری ہے۔

کچھ سال پہلے میں بنگلور سے دلّی آ رہا تھا۔ گاڑی میں میرے سامنے والی برتھ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ بات بزنس سے ادب تک آ پہنچی۔ کمرشیل اسٹریٹ میں دستکاری کی چیزوں کی اس کی دُکان تھی، وہ سارتر، نطشے اور دوستوفسکی کی تحریروں کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی کتابوں کے پیراگراف کے پیراگراف سنا رہا تھا۔ وجودیت سے کر ٹرانس ڈینٹل میڈی ٹیشن کی تشریح کر رہا تھا۔ میرا تجسّس بڑھ رہا تھا۔ راجستھان کے مارواڑی خاندان کا لڑکا اور وجودیت۔ اس نے بتایا کہ اس کی دوکان پر ایک بدیسی عورت آئی۔ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں۔ اس نے کچھ خریدا اور دوکان کے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ کتابیں وہیں بھول گئی ہے۔ اس نے باہر جا کر چاروں طرف دیکھا، لیکن وہ جا چکی تھی اس نے کتابیں اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔ شاید وہ کبھی آئے گی اور لے جائے گی۔ کتابیں اس کے کس کام کی تھیں۔ وہ پھر نہیں آئی۔ دوکان میں نئی اشیا۔ رکھنے کے لیے جگہ چاہیے تھی وہ کتابیں اُٹھا کر گھر لے آیا۔ اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیں۔ ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کی کچھ نئی چیزیں آ گئیں۔ کتابیں وہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور ایک کونے میں رکھ دیں۔ ایک دن بارش زوروں سے ہو رہی تھی، دوکان کی چھٹی تھی۔ بیکار وقت نہیں کٹ رہا تھا، سوچا، دیکھوں ان کتابوں میں کیا ہے؟ اُن پر دھول جم گئی تھی، صاف کی۔ ایک کتاب پڑھنے کے لیے اُٹھائی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن کچھ اچھا لگا۔ کتاب تھی سارتر کی نو اگزٹ (No Exit) اور پھر پڑھتا چلا گیا بارش تھم گئی تھی۔ لیکن میں اپنے کمرے سے نہیں نکلا جب تک کہ کتاب ختم نہیں کر لی۔ دوسرے دن میں دوکان پر نہیں گیا۔ ایک دوسری کتاب پڑھنا شروع کی۔ کافکا کی ٹرائل (The Trial) اور اسی طرح تیسری کتاب دوستوفسکی کی۔ نوٹس فرام دا انڈرگراؤنڈ (Notes From The Underground) بھی پڑھ

ڈالی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی کال کوٹھری میں بند ہوں جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں شاید کافکا نے کہا تھا اپنے خطوں یا ڈائری میں۔ اور اس دن سے میں اس کال کوٹھری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ کال کوٹھری چاہے سماج کی ہو، اپنے جسم کی ہو یا اپنے من کی ہم سب سزائے موت بھگتنے کے لیے اس کال کوٹھری میں بند ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا ہمیں مکت ہونا ہے۔ ایشور کی موت ہو چکی ہے۔ ہم نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ شاید نطشے نے یہ کہا تھا۔ انسان مر چکا ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ بریخت نے کہا تھا۔ کوئی مسیحا نہیں اتر رہا ہے۔ ہم گودو کے انتظار میں کب سے کھڑے ہیں اور اس نے کہا کہ ہر انسان کو اپنی نجات کے لیے اپنی صلیب خود اٹھانی ہے۔

سنسکار کس طرح بدلتے ہیں۔ زندگی کو نئی بصیرت کس طرح ملتی ہے۔ کتنے تجربے ہوتے ہیں ایک زندگی میں۔ جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور آزادی کی تحریک کے سلسلے میں شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہم کچھ طلبا گئے تھے دن بھر چلچلاتی دھوپ میں گھومتے گھومتے بہت تھک گئے تھے۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شام کو ایک گاؤں میں پڑاؤ تھا۔ جب ہم اس گاؤں میں پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ قبائلی پٹھانوں اور ان کے سرداروں سے بات چیت شروع ہو گئی۔ مٹیالی پتھریلی پہاڑیوں کے پیچھے سورج دھیرے دھیرے پھسل رہا تھا۔ نیچے کھلے آسمان پر سرخ رنگ بکھیر رہا تھا بھوری بھوری پہاڑیوں پر لمبے تگڑے پٹھانوں کے سائے پھیل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سائے سمٹنے لگے۔ بہت کچھ تاریکی نے نگل لیا۔ اور پھر جل اٹھیں مشعلیں۔ وسیع میدان کے بیچ میں الاؤ جل رہا تھا۔ اور اس پر لوہے کی ایک لمبی چھڑ میں بندھا مینڈھا بھونا جا رہا تھا ہوا میں کچھ کچھ خنکی تھی۔ پھر شروع ہوا ان کا ناچ اور گانے۔ کالی بھوری واسکٹیں، کالی نیلی پگڑیاں، لمبی لمبی گھیرے دار شلواریں اور گاڑھے کے کرتے۔ چمکیلی بڑی لاٹھیاں اور دونالی بندوقیں فضا میں ایک پُرزور حرکت تھی۔ ایک لے، ایک سنگیت، ایک بھونچال ایسا احساس جو افریقی ڈرم بیٹرز کو سن کر ہوتا ہے۔ نان کی خوشبو، بھونے ہوئے گوشت کی گرم مہک، ایک عجیب سماں تھا، اور بھوک بڑی ستا رہی تھی۔ انہوں کی رکابیوں میں نان اور گوشت، مٹی کے چھنّوں میں پانی اور گھر بلو کشید کی ہوئی شراب۔ مجھے نان اور پانی کے سوا کچھ راس نہیں تھا۔ نہ گوشت نہ شراب۔ بڑا سنکٹ تھا۔ بھوک اور سنسکار کا تصادم، دونوں طرف بیٹھے دوست بھی تذبذب میں تھے۔ کسی ترکاری کا بندوبست ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ پنڈت جی شہد سے کام چلے گا۔ ہماری کھسر پھسر سن کر ایک معمر پٹھان ہمارے قریب آئے۔ وہ سمجھے شاید مہمان نوازی میں کوئی کسر رہ گئی ہے اور

انھوں نے پوچھا۔ نہیں سب ٹھیک ہے۔ میں نے کہا لیکن ایک دوست کے منہ سے نکل گیا۔ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ ان کے چہروں کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ بس تھوڑی دیر میں آلو تیار ہو جاتے ہیں۔ بس تھوڑی دیر میں ایک کھلبلی سی مچ گئی ان کی پریشانی، الاؤ کے نیلے پیلے لپکتے شعلے۔ ان کا زمین کی چھاتی پر مست زور ناچ پہاڑوں سے گونج کر لوٹتی ڈھولوں کی آواز، دمکتے ہوئے چہرے۔ کسی کا دل بجھ جانے کا احساس میرے سامنے ایک جذبے کا قتل ہو رہا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل غلط۔ میں نے سوچا۔ محبت کی توہین۔ میں نے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دوستوں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور ہلکا سا دبا دیا وہ مسکرا دیئے۔ میں نے نان کا ٹکڑا توڑا۔ اور شوربے میں ڈبو کر کھانا شروع کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے اندر بچپن سے جو کچھ تھا، ایک دم کلبلا کر حرکت میں آ گیا۔ اور پھر سب کچھ شانت ہو گیا۔

آج جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ ایک دم کیسے ہو گیا۔ بھوک یا جادوئی منظر، سنگیت یا رقص یا دونالی بندوقیں یا جذبہ محض جذبہ، میں نے بھوک سے کبھی شکست نہیں کھائی۔ جسم کی حدوں کو توڑ دینے والا پیشن (Passion) زندگی بھر اس نے میرے سنسکاروں اور وچاروں و قدروں کو چیلنج کیا ہے اور اس کے سامنے میں خود سپردگی کرتا آیا ہوں۔ ہماری بھوگی سنبھوگی حقیقت تو دو جسموں کا فاصلہ بھی دور نہیں کر سکتی انسانوں کے بیچ پل کیا بنے گی۔ سنسکار بوجھ ہیں اگر جکڑ میں لے لیں۔ علم کی کوئی حد نہیں۔ ہم عمل کرتے ہیں اس علم سے جو اس علم کا محض ایک جزو ہے جو موجود ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ تو اس کا بہت ہی کم حصّہ ہے جسے ابھی ہم نے جاننا ہے تو پھر کیا شراپ پائی ہوئی اہلیا کی طرح پتھر بنے بنے صدیوں سے ایک مقام پر بے حرکت بے حس کھڑے رہیں کہ کوئی آئے اور اپنی ٹھوکر سے ہمیں پھر زندہ کر دے۔

ہر بار زندگی سے ہمارا سامنا ایسے ہوتا ہے جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہوئی ہو۔ ایسے جزیرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں کسی کے قدم نہیں پڑے۔ ایسے جنگلوں میں جاتے ہیں جہاں کوئی پگڈنڈی نہیں اور جو بھی اس میں ایک بار داخل ہوتا ہے، واپس نہیں آتا۔ یہ خلا سے بھی سر و برو ہونا ہے جسے صرف آپ کا وجود ہی پُر کر سکتا ہے۔

مشہور ناول آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ (All Quiet On The Western Front) پر بنی فلم میں ایک فوجی سپاہی خندق میں پڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بندوق

ہے۔ اس کے سر کے قریب ایک تتلی اڑتی ہے وہ اُسے پکڑنا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اپنا ہاتھ خندق سے باہر نکالتا ہے تو دشمن کی گولی اس کو چیر سکتی ہے۔ لیکن تتلی کو پکڑنے کی خواہش میں وہ اپنا ہاتھ خندق سے باہر نکالتا ہے، دن سے ایک گولی اس کے ہاتھ کو چیرتی ہوتی نکل جاتی ہے اور ہاتھ مردہ ہو کر زمین پر آپڑتا ہے۔ کیا ہے انسان کے اندر جو اُسے خوشبو، رنگ، اور آواز کو پکڑنے کے لیے جنون کی حد تک لے جاتا ہے۔ جہاں موت زندگی بن جاتی ہے اس کی قوت بن جاتی ہے۔ اس کا خوف مٹ جاتا ہے۔ اُڑتی تتلی کو پکڑنے کی اُڑتے پرندے کو پیار کرنے کی جس کی خواہش مر جاتی ہے۔ وہ کب کا مر چکا ہوتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں بندوق ہے زندگی کی حفاظت کے لیے دشمنوں سے لڑنے کے لیے جوان گنت ہیں۔ مہلک ہتھیاروں سے لیس گھات لگاتے بیٹھے ہیں۔ ان سے اپنی جان بچانے کے لیے ہم سالہا سال خندقوں میں پڑے رہتے ہیں۔ لیکن ہم کہکشاں پر کمند پھینکنا چاہتے ہیں۔ آسمان کو مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ اور ایک دھنک رنگ تتلی کو پکڑنے کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ یہ پیشن (passion) ہے اور میں نے محسوس کیا کہ میں بھی کچھ لکھ سکتا ہوں۔

—— لیکن کچھ ایسا لکھو کہ آئندہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں۔

—— یہ میرا کام نہیں۔

—— تو!

—— یہ کام عظیم ادیبوں کا ہے۔

—— کیا تم عظیم ادیب نہیں بننا چاہتے۔

—— میں اپنے سے میں سانس لیتا ہوں۔ میرا تخاطب ان سے ہے جو میرے ساتھ سفر میں ہیں۔

—— اور کالی داس، ہومر، شیکسپئر، فردوسی، غالب۔

میں نے قلم رکھ دیا اور ادب کی بیرونی حد میں آ گیا۔ کیونکہ میں عظیم ادیب نہیں بن سکتا، میں ادیب ہی نہیں بن سکتا جس کی ساری تہذیب ادب، سیکس ہر چیز حاشیے پر آ گئی ہو وہ کیا لکھے گا۔

ادب کی حد سے باہر ہو جانے کی کئی وجہیں تھیں۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں حقیقت پرست نہیں ہوں۔ جو موجودہ ادب کے لیے بڑا ضروری ہے۔ میں چیزوں اور افراد

ایسا نہیں دیکھتا جیسا کہ وہ ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ اُن سے پرے دیکھتا ہوں۔ دوسرے میں
دی طور پر جذباتی اور رومانی ہوں۔ جذبات میں بہہ جانا اگر ادب کی تخلیق کے لیے مہلک ہے
ں ادب سے دور ہو جاتا ہوں۔ میں نہ خارجی حقیقت پر لکھ سکتا ہوں، نہ ہی اپنی ذات پر
ںکہ میں خود پسندی کا قائل نہیں این کا ونسڑ کا قائل ہوں۔

ایک بنجارہ یا خانہ بدوش ہی حدوں کو توڑ سکتا ہے۔ وہ ایک طرح سے انسانی انسان ہے
اج، اخلاق، ریاست، قاعدے قانون سے پرے، اس پار جانے کی تمنا نام ہے زندگی کا
اس حد کے پار جس کو ناگزیر اور دائمی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کسی دوسرے کی زندگی جینا زندگی سے
واس گھات ہے۔ میں ادیب بھی بننا چاہتا ہوں اور ایک متوسط طبقے کا نوکری پیشہ فرد
ں۔ شادی شدہ، گھر بار، خاندان، مکان، بینک بیلنس، آرام و آسائش، فنکار بھی بننا
ہتا ہوں اور فینٹسی کا خالق اور ایک کھلا پرش بھی۔ یہ قریب ۳۰ برس تک چلتا رہا۔ میں ایک
نہ بدوش ہوں جو تلاش کرتا ہے۔ جمع نہیں کرتا۔ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کیونکہ میں حدوں
ر رسموں رواجوں سے پرے نہیں جانا چاہتا تھا ہرمن ہیس نے لکھا تھا۔

میرے پاس بھی گھر تھا۔ میں نے بھی ایک مکان بنوایا، پیمائش کے مطابق دیواریں اور
ت، باغیچوں میں پگڈنڈیاں بنائیں۔ اپنی ہی دیواروں پر اپنی تصویریں آویزاں کیں۔ ہر آدمی
ں کرتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ ایک بار میں نے ایسی ہی زندگی بسر کی تھی۔ زندگی میں میری
خواہشیں پوری ہو گئیں۔ میں شاعر بننا چاہتا تھا۔ میں شاعر بن گیا۔ میں مکان چاہتا تھا
نے مکان بنا لیا۔ میں ایک بیوی چاہتا تھا۔ اور بچے، وہ بھی مل گئے۔ میں لوگوں کو متاثر
نا چاہتا تھا وہ بھی ہو گیا، لیکن خواہشوں کی تکمیل کو میں برداشت نہیں کر سکا۔ شاعری میرے
ے مشکوک ہو گئی۔ مکان میرے لیے تنگ ہو گیا۔ جو میں نے حاصل کیا وہ میرا مقصد نہیں تھا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ کس طرح میرے چھوٹے بچے نے ایک دم توڑتی چڑیا کو پانی پلا کر زندہ
کھنے کی کوشش کی تھی۔

مجھے یاد آتا ہے ایک فلم کا وہ منظر جب ایک سپاہی ایک تتلی کو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ
رق سے باہر نکالتا ہے، تو دوسرے گولی اس کے ہاتھ میں لگتی ہے۔

اور پھر ایک اور فلم کا منظر جب پولیس میگا فون پر اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی نکسلائٹ
ہیکا ہو تو سامنے آ جائے تو ایک چھوٹا سا بچہ اپنے ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک اور منظر جب سارا گاؤں ظلم کا خاموش تماشائی بن جاتا ہے تو ایک بچہ زمیندار کے گھر کی کھڑکی پر غلیل سے پتھر پھینک کر بھاگ جاتا ہے۔

اور مجھے یاد آتا ہے طلوعِ آفتاب میں پانی میں رنگ بدلتے بدن کا لمس۔

اور مجھے بسترِ مرگ پر پڑی ماں کا مسکراتا چہرہ یاد آتا ہے۔

ہے۔ الشور۔۔۔۔ یہ سب کچھ مجھے کیوں یاد آتا ہے۔ میں اتنا بے بس، بے سہارا اور کمزور کیوں ہو گیا ہوں۔

او مائی گاڈ، مجھ سے میرا شعور، میرا احساس چھین لے یا مجھے موت دیدے۔ لیکن مجھے خودکشی پسند نہیں۔ حالانکہ میری زندگی میں کئی بار ایسے موڑ آئے جب یہ احساس ہوا کہ یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں۔ دوستوں نے کہا کہ جس آگ کے دریا سے تم تیر، ڈوب کر نکلے ہو، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ میری رگوں میں خون گرم لاوے کی طرح بہنے لگا۔ شعلے کی طرح لپکتا ہوا۔۔۔۔ اُف! اگر خون کی رفتار مدھم پڑنے لگے گی یا وہ ٹھنڈا ہونے لگے گا یا اس کا رنگ بدل کر سُرخ سے سفید ہونے لگے گا تو ضرور کر لوں گا۔ اور نہ یہی میں گھاس پھوس بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں "ہوز لائف از اِٹ اینی وے" (Whose Life Is It Anyway?) کا ہیرو جب فالج کا شکار ہو کر بے حرکت ہو جاتا ہے تو اُسے زندہ رکھنے کے لیے مقوی انجکشن دیئے جاتے ہیں۔ وہ انکار کر دیتا ہے وہ کہتا ہے میں طبّی دُنیا کا ایک معجزہ بن کر زندہ رہنے کے بجائے ایک انسان کی موت مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

میں نیند کی گولیاں کھا کر شانتی سے مرنا نہیں چاہتا۔ نہ آگ میں جھلس کر۔ نہ پانی میں ڈوب کر۔ نہ ہی پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر۔ ایسا اگر ہو سکتا تو میں شہید بھگت سنگھ کے نقشِ قدم پر چلتا۔

زندگی بھر تمنا رہی کہ ایک کار خریدوں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ کبھی اتنی رقم نصیب نہ ہوئی۔

ایک بے چارہ اسکوٹر تھا، سو وہ بھی بک گیا۔

لیکن جب مجھے مرنا ہوگا تو میں ایک رینٹل کار لوں گا۔ اس کی ٹنکی میں لبالب پٹرول بھر لوں گا اور نیشنل ہائی وے پر نکل پڑوں گا۔ فلڈ لائٹ کی چندھیائی روشنی

میں کسی ایک پھول کا نام لے کر، کسی چٹان سے ٹکرا جاؤں گا۔ میرا جسم، میرا چہرہ، سب کچھ کٹ پھٹ جائے گا۔ گرم اور سرخ خون کار کے چمکتے شیشوں، سخت چٹانوں اور بھوری مٹی پر بہنے لگے گا۔ اور میں اپنی زبان کی نوک سے چکھوں گا کہ اس میں وہ حرارت ہے کہ نہیں جس کی تمنا میں نے زندگی بھر کی ہے۔

(آج کل نئی دہلی۔ نومبر ۱۹۸۵ء)

راجندر سنگھ بیدی

پربودھ اور میتری

امرکتھا سنتی ہوئی پاربتی اُونگھ گئی۔ شیو نے دیکھا بھی مگر بھانگ اور دھتورے کی مستی میں اپنی بات کہتے گئے۔ جو گپھا میں اُوپر کہیں بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری کے جوڑے، پربودھ اور میتری نے سُن لی اور امر ہو گئے۔

جگ ہی بیت گئے۔ کال کے کانٹے پربودھ اور میتری کے لیے کُند ہو چکے تھے۔ پربودھ نے کہا: "اب تو وقت ہی اور آ گیا ہے، رانی! مگر تمہیں وہ دن یاد ہے جب آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو ایک پتھر سے مار ڈالا تھا؟

"ہاں... " میتری بولی: "ایک بے شکل سی لڑکی کے پیچھے، جو اُن کی اپنی ہی بہن تھی۔"

پربودھ جھلا اُٹھا: "تمہیں ابھی تک نہیں معلوم۔ مرد اور عورت قدرت کے دو اصول ہیں۔ ان میں ذات اور رشتے کی بات ہی کیا ہے؟"

"ہاں۔ مگر... "

"مگر کیا...؟" پربودھ نے میتری سے کچھ پرے ہٹتے ہوئے کہا: "قدرت کیا اس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس پیڑ کا جو ہر کن ہواؤں سے کسی دوسرے پیڑ پر جا گرتا ہے؟ قدرت کا قانون افزائشِ نسل ہے چاہے وہ کیسے ہی ہو، کسی سے بھی ہو۔"

اس وقت پربودھ ان ہزاروں کبوتریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو بے حد حسین تھیں کیونکہ وہ فانی تھیں۔ ان کے گلوں کے حلقے راتوں کے پیار سے کالے اور چمکیلے ہو رہے تھے اور انڈے روئی کے گالوں ایسے نرم، گرم اور چٹے.... پربودھ جیسے خیالوں کے اختلاط سے خود ہی تھک گیا تھا اور بڑبڑایا: "عورت کی وجہ سے ہمیشہ لڑائی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔"

"عورت ہی کیوں؟" میتری چونک اٹھی "زر اور زمین بھی تو ہیں"
پربودھ نے شہوانی نظروں سے میتری کی طرف دیکھا اور بولا "زمین بڑی ہے اور زر اس سے بڑا۔ مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورت ہی کے دو روپ ہیں؟"
میتری نے اپنی نازک سی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر پیار کی کندیں پربودھ پہ پھینکیں، اپنا دایاں پر پربودھ کے بائیں پر میں پھنساتی ہوئی بولی "مجھے جھانجریں لا دو نا۔ جو ایتھنز کے کھنڈر میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل پڑی ہیں۔۔۔ پھر میں تمہیں وہ پیار دوں گی کہ۔۔۔"
پربودھ نے جھانجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی گھوں گھوں کرتے، پھولتے ہوئے اپنی چونچ میتری کی چونچ میں اس کے تالو تک کھبو دی اور پھر خود ہی علیحدہ ہوتے ہوتے بولا "کیا فائدہ اس پیار کا جس میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جیا نہیں مرا جا رہا ہے۔" اور پھر وہ کہہ اٹھا "سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"
میتری بھی جانتی تھی کہ پربودھ اس وقت تک جھانجریں نہ لا کر دے گا۔ جب تک اس کی سوچ میں کوئی خود غرضیاں نہ ہوں گی۔
پھر پربودھ بچھڑی صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور ان راسوں کی جو دمیتر یاس نے اسکندریہ میں الفرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رچائی تھیں۔ پھر ایڈے پس کی جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اور جب اسے پتہ چلا تو صدمے ہی سے چل بسا۔ وہ کنال کی باتیں جس کی محبوبہ اس کے باپ کے ساتھ ساجھی ہو گئی تھی اور جس کے کارن کنال کو اپنی آنکھیں دینا پڑیں۔ پھر بھرتری ہری کی جس نے حسن اور جوانی کو قائم دائم رکھنے والا سیب اپنی رانی کو دے دیا۔ مگر رانی نے اپنے عاشق دھوبی کے حوالے کر دیا جس نے اسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا جو ساری دنیا کا بھلا کرنے کے لیے اسے وقت کے بادشاہ بھرتری ہری کے پاس لے آئی۔
پربودھ اور میتری نے ابد سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ازل دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لاقانونیت دیکھ کر میتری بولی "آخر کوئی تو قانون ہونا ہی چاہیے" حالانکہ وہ آپ ہی اس سمت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو نیچے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے سے شہتیر رہتا تھا اور بے حد جوان اور لاجوردی گردن والا خوبصورت کبوتر

تھا۔ اس لیے کہ وہ فانی تھا۔ اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میتری کا پورا بدن مہک اُٹھا اور پیٹ میں ایک کسمساہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ من ست کی بات کچھ اس انداز سے کرنے لگی جیسے کوئی بات نہ ہو۔ مگر اس کا نام سنتے ہی پر بودھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اس کے پر پھڑپھڑانے لگے۔ پر بودھ کے غصے اور لرزے کو دیکھ کر میتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر سے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی۔ نظریں چراتی ہوئی بولی "زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں۔ کیا خود انہیں توڑ نہیں سکتے؟"

پر بودھ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا "قدرت کا قانون افزائش نسل ہے۔ چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو"، جلدی سے کہہ اٹھا۔

"نہیں"

ایک دن کبھی لمبی پرواز کے بعد پر بودھ اور میتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من ست اُڑتا ہوا امرناتھ کی گپھا تک پیچھے آیا تھا اور پھر مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ میتری کو اس بات کی خوشی تھی اور افسوس بھی تھا۔ خوشی اس لیے کہ اس کا پر بودھ اب بھی اُسے آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من ست نرسنگوں اس کے پیچھے اُڑ کر آ سکتا تھا اور مایوس ہو کر واپس جا سکتا تھا اور افسوس اس بات کا کہ پر بودھ اُسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روک سکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچتے ہی پر بودھ اور میتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پر بودھ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے میتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پاس پر پھیلا دیے اور کہنے لگا۔

"رانی! ہم نے کتنی دُنیا دیکھی ہے۔ کتنے جگ اور کتنے دیش۔ پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش ہے جس کی کوئی مثال نہیں"

"پنجاب" میتری نیچے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اُٹھی۔ اور پھر اُس نے ایک سرد آہ بھری جسے پر بودھ نے نہ دیکھا۔

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" پر بودھ نے ششدر ہو کر پوچھا اور اس کی لمبی چونچ نے ایک شرخی پکڑ لی۔

میترّی کہنے لگی :" وہی تو ایک دیش ہے، جس کی دھرتی میں سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی رہتی ہے، جس کا لمس بدن میں صحت کی خارش پیدا کرتا ہے۔"

"ہاں " پربودھ نے حامی بھری ۔" اس کے پربت آسمانوں کے ہمسائے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پہ ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اس کے دریا تو ایک طرف، پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔"

" جہاں کے مرد اکھڑ ہیں۔ عورتیں جھگڑالو۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انہیں توڑ بھی دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے بہت دُکھ دیکھا ہے۔ اُتر پچھم سے اُن پر سینکڑوں حملے ہوتے۔ مگر انہوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنایا اور آلام کی سب ضربیں ان پہ لے لیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دے دی، پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں۔ عجیب کیمیا گر ہیں وہ۔"

" نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جمتی ہوئی برفوں اور تپتی ہوئی ریتوں میں وہ بس گئے ہیں۔ جہاں دُنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں۔"

" وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن۔ جہاں بھی لوگ تمہیں ایک بلند آواز سے ہنستے، قہقہے لگاتے ہوتے سنائی دیں وہاں مزید کوئی پنجابی ہوگا۔ کیونکہ وہ دُنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے۔ وہ جوا سے ہے وہی باہر سے اس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں۔"

" وہ ایک ایسا پودا ہے رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں۔"

" رانی! پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم اُنھوں نے کون سی امرکتھا سنی ہے میں وہ اُونگھ بھی گئے اور بچ بھی گئے۔ پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری نہیں ہوتی۔ ہاں۔ ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے میں ان کا موکش ہے۔"

(آج کل نئی دہلی، فروری ۱۸۴

رشید امجد

چلتے رہنا ہی ایک موت ہے

جوں ہی رات دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتی ہے، کارنس پر رکھا مجسمہ آہستہ سے نیچے اُترتا ہے اور اس کے سرہانے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، وہ پوچھتا ہے "کون؟"

مجسمہ کہتا ہے "میں؟"

"میں کون؟"

"میں ماضی ہوں"

وہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھتا ہے "لیکن میں تمہیں نہیں پہچانتا" مجسمہ مسکراتا ہے "ماضی سے سب کو خوف آتا ہے"

وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور مجسمہ کی پتھرائی آنکھوں میں منجمد یادوں کو کریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجسمہ کی پتھرائی آنکھوں میں شناسائی کی گرماہٹ سر اُبھارتی ہے، اُسے اپنا آپ ڈوبتا نظر آتا ہے۔ چند لمحوں میں کمرے کی ساری چیزیں ایک ایک کر کے گم ہونے لگتی ہیں۔ چار دیواری اپنا دامن سمیٹ لیتی ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ موجیں مارتا دریا اس کے سامنے ہے، اور وہ مجسمے کی انگلی تھامے اس کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔

"یہ کون سا دریا ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔

مجسمہ لمحہ بھر کے لیے دریا کو دیکھتا ہے پھر کہتا ہے "یہ وقت ہے اور وقت کسی کا نہیں بنتا"

کچھ آگے جا کر کسی شہر کے آثار شروع ہوتے ہیں۔

"یہ کون سا شہر ہے؟"

٭یہ ہمارا وجود ہے، جسے ہم جانتے ہیں اور نہیں بھی جانتے۔

وہ شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

سڑکوں پر عجب ویرانی ہے۔

وہ چلتے چلے جاتے ہیں، لیکن کسی سے ملاقات نہیں ہوتی۔

"یہ کیسا شہر ہے جہاں کوئی نہیں رہتا"

مجسّمے کی پتھریلی آنکھوں میں زندگی رینگنے لگتی ہے اور اس کی پتھریلی انگلی میں لمس لہراتا ہے۔

وہ پھر اپنا سوال دہراتا ہے "یہ کیسا شہر ہے؟"

مجسمہ ہنستا ہے اور ہنستے ہنستے اس کا پتھریلا جسم ملائم ہوتا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس جیسے جیتے جاگتے آدمی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

وہ چونک کر اس قلب ماہیت کا منظر دیکھتا ہے۔

مجسمہ جواب آدمی بن گیا ہے، اپنے ہاتھوں کو جھٹک کر پورے جسم کو ہلاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہر کی گلیوں، سڑکوں پر آدمی ایسے نمودار ہوتے ہیں جیسے پلک جھپکتے میں زمین سے اُگ آئے ہوں۔

وہ لمحہ بھر کے لیے ڈر جاتا ہے۔

چاروں طرف لوگوں کے بولنے کا شور اور ان کے چلنے پھرنے کی حرکتیں اُسے بوکھلا دیتی ہیں۔

"یہ کیا ہے۔ کیا میں کسی طلسم میں پھنس گیا ہوں؟"

مجسمہ جواب آدمی بن گیا ہے۔ کہتا ہے "یہ سب میں ہوں اور میں تم ہو۔ اس لیے یہ سب کچھ تم ہی ہو"

اسے کچھ سمجھ نہیں آتا۔

شہر کا منظر کھلتا چلا جاتا ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں باتیں کرتے لوگ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی اپنی دُنیا میں گم ہیں۔ دفعتاً منظر بدلتا ہے، ایک دوسرے کی باہنوں میں باہنیں ڈالے لوگ یک دم کسی غیبی اثر سے، اپنی باہنیں چھڑا کر دُور دُور ہٹ جاتے ہیں اور پھر چشم زدن میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ چیختے چلاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ بھی اس دھکم پیل اور مار دھاڑ میں

بھاگ پڑتا ہے، بھاگتے بھاگتے اس کی نظر ایک بچے پر پڑتی ہے۔ جسے دوسرا بچہ نیچے گرا کر مارنے لگتا ہے۔ وہ چیختا ہے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے، نہیں یہ میں ہوں، پھر دفعتاً ایک اور خیال آتا ہے، نہیں یہ میرا باپ ہے۔ نہیں یہ نہیں۔ نہیں میرا بیٹا۔ نہیں میرا باپ ہم ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ وہ مارنے والا ہے اور نیچے گرا ہوا وہ ہے۔ وہ چیختا ہے۔ مجھے مت مارو مجھے مت مارو۔ وہ چیختا چلا جاتا ہے۔ منظر آہستہ آہستہ بدلتا ہے۔ شہر اور لڑتے لوگ دھندلے ہوتے ہوتے گم ہو جاتے ہیں۔ اس کا کرہ آہستہ سے اسکرین پر اُبھر آتا ہے، رات دبے پاؤں اس کے کمرے سے نکل جاتی ہے اور مجسمہ کارنس پر جا کر پھر سے پتھر ہو جاتا ہے۔

وہ گھبرا کر ساتھ والے بستر پر سوتی بیوی اور بیٹے کو دیکھتا ہے۔

"شکر ہے" وہ اطمینان کا لمبا سانس لیتا ہے۔ دن دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ بستر سے اُٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا ہے "آج کی رات بھی بیت گئی" لیکن اسے خوف ہے کہ کسی صبح جب وہ سو کر اُٹھے گا تو یا تو ساتھ والے بستر پر اس کا بیٹا نہیں ہوگا، یا وہ خود نہیں ہوگا۔

اور کارنس پر رکھے مجسمہ کے ساتھ ایک اور مجسمہ کا اضافہ ہو جائے گا!

(کتاب نما، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۵ء)

سلیم اختر

آخری سبق

ماں نے صحن میں دو قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے دہلیز پر رُکے پایا۔

"ارے آجاؤ رُک کیوں گئے؟"

حامد نے صحن میں بیٹھے لڑکے اور لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھا جو اب تک کتابوں پر سے گردنیں اُٹھا کر اسے گھور رہے تھے، اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی پیدا ہو گئی۔ پاؤں جیسے دہلیز نے جکڑ لیے۔

حامد نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا پھر اُن بچوں کو جو اب اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور پھر استانی جی کو۔ چوڑے کندھوں اور بھرے بھرے ہاتھ پاؤں والی لمبی تڑنگی اُستانی کو دیکھ کر ویسے ہی اُس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سب اُسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔"

ماں نے اب لاڈ میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لا کر استانی جی کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا تھا۔ تپتے گال اور سُرخ چہرہ لیے۔ اُسے بچوں کی ہنسی اپنی پشت پر کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے لمبے قد کے باوجود وہ خود کو بونا محسوس کر رہا تھا۔ ایسا بونا جسے ابھی قلا بازی لگانے کو کہا جائے گا اور وہ اُس معمولی سے کام میں بھی ناکام رہے گا۔ دھڑام سے گر پڑے گا اور پھر سب اُس پر دل کھول کر ہنسیں گے۔

شاید وہ ہنس ہی رہے تھے مگر نہیں اب کوئی نہیں ہنس رہا تھا۔ استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے ان سب کی ہنسی بند کرا دی تھی، مگر وہ ابھی تک مجرم بنا کھڑا تھا جس

اسرار مس آنکھیں اُستانی جی کے سانولے پاؤں پر ٹکی تھیں، کھلی چپل میں سانولے پاؤں اس وقت کششِ ثقل کا کام کر رہے تھے۔

"ارے واقعی" استانی جی بولیں "یہ تو بہت ہی شرمیلا ہے" یہ سن کر وہ شرم سے اور بھی سکڑ گیا اور ماں فخر سے بولی "یہ میرا حامد سات بیٹیوں جیسا ہے" اس پر سب کی پھیس پھیس پھر اس کی پشت پر سوئیوں کی طرح چبھی مگر آستانی جی کی ایک ہی نگاہ نے سب کو سن کر دیا۔

باقی بچے سن ہوتے یا نہ ہوتے مگر حامد خود یقیناً سن ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل سُن رہنا حامد کی خصلت تھی غالباً اس کے خون میں سُرخ خلیوں کے علاوہ کچھ ایسے خلیے بھی تھے جو اُسے خواہ مخواہ سن رکھتے تھے۔ ڈرنے کی بات ہو یا نہ ہو وہ خود بخود ہی ڈرا رہتا تھا خاص طور پر لڑکیوں سے تو اُس کی جان جاتی تھی، اسے یہ لڑکیاں عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کی مخلوق نظر آتیں، ایسی مخلوق جس سے بچنے میں ہی عافیت ہو اور اب جو اُستانی جی کی صورت میں وہ ایک بہت بڑی لڑکی کے حضور میں پیش ہوا تو خود کو مجرم سمجھنا لازم تھا سو نظریں ابھی تک سانولے پاؤں پر ہی تھیں۔

اس کی ماں جھنجھلا کر بولی "او کھوتیا"

اس پر پھر اس کی پشت پر سوئیاں چبھیں۔

اُستانی جی بولیں "رہنے دیں۔ مت ڈانٹیں اِسے، ابھی نیا نیا ہے اس لیے گھبرا رہا ہے"

اس نے مشکور ہو کر اُستانی جی کو دیکھا تو انہیں اپنی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پایا۔

اس مسکراہٹ سے اس کی جان میں جان آئی مگر مکمل طور پر نہیں! ماں کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے چنانچہ وہ جھنجھلا کر بولی "بڑا شرمیلا ہے میرا حاما"

قصور حامد میاں کا بھی نہ تھا۔ ماں دُنیا سے خوفزدہ تھی اس لیے مُرغی کی طرح حامد کو اپنے پروں میں لیے رہتی وہ وقت جو بچوں کے ساتھ باہر گلی میں کھیلنے میں گزارنا چاہیے تھا وہ صرف گھر میں ماں اور خالاؤں اور پھپھیوں کے ساتھ گزارتا، وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کراتا۔ بلکہ بعض کام تو اسے بے حد پسند تھے، مثلاً سل بٹے سے مسالہ پیسنا، ماں کی سہیلیاں آتیں تو یہ اُن کے دائرہ کے قریب ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے ان کی باتیں سنتا رہتا ساسوں کی باتیں، خاوندوں کی باتیں، پڑوسیوں کی باتیں۔ کچھ سمجھ پاتا، بہت کچھ سمجھ میں

آتا مگر باتوں میں مزا ضرور آتا۔ ان باتوں کے سننے میں اُس کے لیے سب سے زیادہ مزا تھا
بہی اس کی سب سے بڑی تفریح تھی! پھر یہ ہونے لگا کہ کوئی ایک کہتی "دیکھو تو کیسے
کائے رہا ہے"

"چلو حامد بیٹے" اس کی ماں چمکار کر کہتی۔

اور وہ عورتوں کی جنت سے جلا وطن کر دیا جاتا۔

پھر اس نے چھپ کر باتیں سننی شروع کر دیں گو اب بھی بہت سی باتیں پلّے نہ پڑتیں۔
یوں چھپ کر سننے میں مزا اور بھی زیادہ تھا چنانچہ وہ اور بھی زیادہ رگڑ رگڑ کر مسالہ پیسنے لگ گیا۔

پھر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کا قد بے حد طویل ہو چکا ہے اور اپنی ماں کے
ے نکلی باتیں اُسے مکمّل طور پر سمجھ میں آگئیں۔ اس رات وہ خواب میں بلا وجہ ہی روتا
۔ اگلی صبح اس نے مسالہ پیسنے سے انکار کر دیا اور تب ماں کو احساس ہوا کہ بیٹا خاصا
ہو چکا ہے۔

اب اُسے پڑھانا چاہیے اور تعلیم کے لیے اُستانی کے گھر سے بہتر بھلا اور کون سا
ل ہو تا تھا۔

استانی جی محلّہ بھر میں آپا جی اشرف کے نام سے مشہور تھی۔ غریب کی جورو تھی آٹھویں
تھی اور پرائمری تک کے بچّے پڑھاتی تھی کیونکہ باقی عورتیں آٹھویں پاس تو کجا آٹھویں
بھی نہ تھیں اس لیے استانی جی محلہ بھر کی میٹر تھیں، عمر زیادہ نہ تھی مگر محلّہ بھر کی کنواریوں،
ں، سوکنوں، ساسوں اور متفرق عورتوں کے دُکھ سکھ کی کہانیاں سن سن کر بڑی بوڑھیوں
یادہ تجربہ کار اور سمجھ دار بن چکی تھی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خفیہ باتوں کی پٹاری
ہتی تھی جب کوئی ہونٹوں پر آنچل رکھے سر جوڑے بیٹھی سرگوشیاں کرتی نظر آتی تو
وہ خفیہ مذاکرات ہوتے اور اللہ کے فضل سے ایسا بابرکت محلّہ اور ایسی نیک بیبیاں
کہ خفیہ مذاکرات کی کبھی کمی محسوس نہ ہوتی، بلاشبہ وہ محلہ کی مقبول ترین عورت تھی
لیے کہ وہ ان نایاب عورتوں میں سے تھی جن کے کان کوؤں جیسے ہوتے ہیں کہ بات گری
گم بڑی سے بڑی بات سنتی مگر کیا مجال جو چہرہ پر ہر تک آجائے وہ سب کی راز دار
گر اس کی راز دار کوئی نہ تھی، اس نے اتنی باتیں اور ایسی باتیں سن رکھی تھیں کہ ایک
[illegible]

احسان کا بدلہ یوں چکاتیں کہ اپنے بچے پڑھنے کو بھیجتیں۔

عید، شبرات کو تحفے ملتے تو شادی بیاہ کے موقع پر جوڑے اور گھر میں اچھی چیز پکتی تو اسے بھجوانا نہ بھولتیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کی بدخلقی نہ کرتیں۔ بلاشبہ وہ محلہ کی مقبول ترین عورت تھی اسی طرح وہ بچوں کی مقبول ترین استانی بھی تھی اور حامد کے لیے سب سے پسندیدہ ہستی! اتنی کہ اس کے مقابلے میں اُسے اپنی ماں کچھ بھی نہ لگتی، چنانچہ اس نے ماں کے ساتھ زنانہ کام کرانے بند کر دیئے وہ جب بھی کچھ کرنے کو کہتی وہ جھلا کر بولتا "اماں دیکھ نہیں رہی میں آپا جی کا کام کر رہا ہوں۔

اگرچہ اب ماں کو مسالہ خود پیسنا پڑتا۔ کوٹھے پر جا کر دیواروں پر ڈھلے ہوئے کپڑے خود کھولنے پڑتے اور اسی طرح کے اور چھوٹے موٹے کام جن میں حامد کو پہلے عجیب طرح کی لذت اور پھر اُس سے مسرت ملتی تھی۔ اب سب اس کے لیے غیر ضروری اور بے کار ہو کر رہ گئے تھے، ہاں! استانی جی کے کاموں سے اس کی دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ سب بچے چلے جاتے مگر وہ وہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے بازار سے بھاگ بھاگ کر سودا لاتا، باورچی خانہ میں مسالے کے ڈبے قرینے سے سجاتا، تکیوں کے غلاف تبدیل کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر سے بھی زیادہ باریک مسالہ پیستا۔ پیستا جاتا۔ پیستا جاتا، حتیٰ کہ ہاتھ میں پکڑا بٹہ سل اور ان دونوں کے درمیان مصالحہ یک جان ہو جاتے مگر وہ دیوانہ وار پیسے جاتا۔ جب شام کو کام کاج سے تھک کر استانی جی لیٹ جاتیں تو پورے پورے ہاتھوں سے سر دباتا اور سخت سخت ہاتھوں سے ٹانگیں۔

اُستانی جی کے میاں عمر میں بڑے تھے اور سدا کے روگی! گھر میں ہوتے تو ان کی کھانسی کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔

حامد کو آپا جی جتنی اچھی لگتی تھیں اُن کے میاں صاحب اتنے ہی بُرے لگتے تھے۔ وہ گھٹنوں پر کتاب دھرے دونوں کا موازنہ کرتا رہتا۔ استانی جی کا چہرہ کیسا گول کٹورے سا تھا جب کہ میاں جی کا لمبوترا چہرہ، چہرہ نہ تھا بٹہ تھا، استانی جی کے چہرہ پر کیسے نمک گھلا تھا جبکہ میاں جی کے چہرے پر چیچک کے داغ دیکھ کر گندی سل کا خیال آتا، استانی جی ہنستی تو بھورے بھورے گالوں میں گڑھا پڑ جاتا تھا جب کہ بڑھی ہوئی شیو سے میاں جی کے پچکے گالوں کے گڑھوں میں چیونٹیاں چلتی محسوس ہوتیں، اُستانی جی مسکراتی تو سفید

[redacted]

چمکیلے دانت لشکارا مارتے جب کہ پورا منہ کھول کر کھلانے پر میاں جی کے گندے دانت اور پیلے مسوڑھوں کے عقب میں سیاہ بلغمی حلق کا غار نظر آتا۔ اُستانی جی کے لمبے بال دیکھ کر ایک دن اس نے کہا "آپا جی! میں تیل لگا دوں"

"تم؟" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں! آپا جی" وہ جوش سے بولا "اپنی ماں کے سر میں، میں ہی تیل لگایا کرتا ہوں"

"اچھا، تو آؤ"

اس نے ہتھیلی پر تیل ڈالا اور مانگ کے بیچ میں سے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تیل کی باریک دھار سر پر ڈالی اور پیشتر اس کے کہ تیل اِدھر اُدھر ہوتا اس نے اسے بالوں میں سمونا شروع کر دیا اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ ہاتھ ہلاتا گیا۔ اس کے نرم نرم ہاتھوں کا لمس سر کے ذریعے سے تمام اعصاب میں سکون کی لہریں دوڑا رہا تھا یوں کہ آنکھیں نیند سے بوجھل محسوس ہونے لگیں۔ اُسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ یوں تیل لگانا اُستانی جی کو بھایا ہے اُستانی جی کو یوں مزا دے کر اُسے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی اس کی وجہ سے اُس کے ہاتھوں میں اس کا دل سمٹ آیا یوں کہ تیل کے قطرہ قطرہ میں اس کا وجود بھی شامل ہو گیا۔

وہ صبح سویرے سب سے پہلے آتا، پھٹی دری پر چپلی میں جھولتے سانولے پاؤں کے قریب تر بیٹھتا اور سب سے آخر میں جاتا۔ ماں خوش تھی کہ بیٹے کی تعریف کرتے اُستانی جی کی زبان نہ تھکتی، استانی جی خوش تھی کہ اتنا فرمانبردار شاگرد آج تک نہ ملا تھا اور شاگرد رشید کا یہ حال تھا کہ اس کا بس نہ چلتا ورنہ اپنا بستہ بغل میں دبا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے استانی جی کے سامنے بیٹھا رہتا۔

وہ اب بھی ویسا ہی شرمیلا تھا، اس کا اب بھی زیادہ باتیں کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو بالکل ہی بولنے کو جی نہ چاہتا۔ بس پلکیں جھپکائے بغیر استانی جی کے کھلتے لبوں، سفید دانتوں اور ان میں بل کھاتی ننھی سی گلابی زبان کو تکتا رہتا۔ وہ اب بھی محلے کے لڑکوں سے کھیلنے میں شرم محسوس کرتا۔ اس کا گھر میں بھی کھیلنے کو جی نہ چاہتا تھا بس گھٹنوں پر کتاب رکھے پہروں بیٹھا سبق یاد کرتا رہتا، ہونٹ رٹنے میں محو ہوتے آنکھیں کہیں اور ذہن میں کچھ اور!

اور پھر ایک رات اس نے عجیب خواب دیکھا وہ سر میں تیل لگا رہا ہے مگر یہ نہیں معلوم

کہ ہر کس عورت کا ہے مگر بالوں میں تیل کی دھار گرانے سے پہلے ہی بال سانپوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے پلنے کلبلاتے جھومتے۔ وہ ان سے ڈرتا بھی ہے لیکن اسے یہ بھی احساس ہے کہ اگر وہ اسی طرح تیل انڈیلتا رہا تو یہ سانپ مر جائیں گے چنانچہ وہ نئے عزم کے ساتھ بوتل اٹھاتا ہے مگر بوتل کو ہاتھوں میں لیتے ہی جیسے ہوا بھرا لفافہ پھٹ گیا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے خود سے گھن آ رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اُسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اُس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے اُستانی جی نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اسے جو سکھا سکتی تھی سکھا چکی ہے اور یوں وہ اسکول پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو ڈرنا ضرور سیکھ لیا، ماسٹروں سے اُن طاقتور لڑکوں سے جو چھوٹے بچوں پر حکومت کرتے تھے، کتابوں سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے جسم سے۔

آپا جی کے ہاں جانا موقوف نہ ہوا تھا مسالہ پیسنے اور بالوں میں تیل لگانے کے لیے نہیں بلکہ ویسے ہی انہیں سلام کرنے کو اُسے یہاں آ کر عجیب سے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ اسکول اور کلاس روم میں وہ سکڑا سہما رہتا مگر یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا گویا اب دُنیا بھر کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گیا ہو وہاں بیٹھ کر اسکول کا کام کرتا اور سب سے بڑھ کر اسکول کے لڑکوں کی اور ماسٹروں کی باتیں کرتا اور یوں دونوں کی شعوری کاوش کے بغیر اُستانی اور شاگرد میں دوستی کے ایک نئے رشتہ نے جنم لے لیا۔ وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سُنتی، اسے مشورہ دیتی، اُونچ نیچ سمجھاتی اور وہ سُن کر سر ہلاتا رہتا۔ محلہ کی عورتوں کی بک بک سننے کے بعد اور بچوں سے مغز ماری کے بعد حامد سے گفتگو اُسے بھی بہت اچھی لگتی۔ چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ میاں کی بیماری کی باتیں، کپڑوں کی باتیں، زندگی کے دکھ سکھ کی باتیں۔

حامد کے لیے دن میں درست بنانا ناممکن ہو چکا تھا اور رات کے خوابوں سے پیچھا چھڑانا بھی ناممکن ہو چکا تھا۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اُس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے کیونکہ تعلیم ختم کر کے ملازمت کر رہا ہے اور اب دُنیا کی کوئی طاقت اُسے اس کی شادی سے نہیں روک سکتی، روکا کس نے تھا،

بلکہ استانی جی نے تو ایک رشتہ بھی بنا دیا، حامد نے بہت شور مچایا کہ اس نے صرف میٹرک پاس کیا ہے اور وہ معمولی سا کلرک ہے اور ابھی محض انیس سال ہی کا ہے مگر اس کی کسی نے بھی نہ سنی۔ یہ سب خواب محسوس ہو رہا تھا۔ مہندی کی رسمیں، تیل کی رسمیں، سہرا، بارات، مولوی صاحب کے منہ سے ادا ہوتے ہوئے مقدس کلمات، کھانا، واپسی اور پھر کمرہ میں ایک اجنبی عورت، سُرخ جوڑا، مہندی والے ہاتھ، ٹیکے والا ماتھا اور۔ اور۔ اور وہ رو رہی تھی۔ وہ رونے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

شادی کے سہانے سپنے کی تعبیر یہ نکلی کہ دُلہن نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ عورتوں کی زبانیں سرگرم عمل ہو گئیں۔

اُستانی جی اس کی ماں سے ملیں، دُلہن کی ماں سے ملیں پھر دُلہن سے ملیں۔ وہ سب سے زیادہ پریشان تھیں کہ لڑکی اُنہوں نے پسند کی تھی اور حامد نے ان کے کہنے پر ہاں کی تھی سب اُن کی عزت کرتے تھے مگر اُلجھی ڈور کا سرا کہاں سے ملے۔

شادی کے بعد سے حامد صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور رات گئے تک گھر آتا اس دوران اس پر کیا بیتی ہے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کا کوئی دوست بھی تو نہ تھا، اُستانی جی کے گھر کا اس نے رُخ نہ کیا تھا۔

دفتر میں اس کی طبیعت بہت پریشان ہوئی تو چھٹی لے کر نکل آیا مگر جائے کہاں؟ بس اسٹاپ پر بیٹھا سواریوں کی بھیڑ دیکھتا رہا۔ دیواروں پر لگے پوسٹر اور لکھے اشتہارات پڑھتا پھرا، سینما میں تصویریں دیکھتا رہا اور آخر تھک تھکا کر سر جھکائے سوچ میں ڈوبا جو چلا تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے وہ اُستانی جی کے گھر آ پہنچا۔ وہ دہلیز میں مجرم سا بنا کھڑا تھا وہ صحن کے کونے میں چولھے پر بیٹھی تھی، بچے جا چکے تھے مگر وہ پھٹی دری ابھی تک نہ لپیٹی گئی تھی وہ کچھ دیر تک خاموشی سے نظریں دوڑاتا رہا۔ تب اچانک وہ آگے بڑھا اور اس نے دری لپیٹنی شروع کر دی۔ استانی جی خاموشی سے دیکھتی رہی مگر اُسے منع نہ کیا اس نے دری لپیٹ کر وہیں کونے میں رکھی جہاں وہ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ اُس کے بعد اُس کے سامنے آکر بیٹھ گیا وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اُس کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی کہ خاموش رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حامد نے بولنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر کھلے ہونٹوں سے الفاظ نہ نکلے صرف ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی

اور لگے لیے وہ استانی جی کے گھٹنوں پر سر رکھے روو رہا تھا۔ سسکیوں سے سارا جسم کانپ رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی پیٹھ سہلاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ سکون پذیر ہو گیا۔ آنسو رک گئے مگر وہ اب بھی سر رکھے سسکیاں لے رہا تھا اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر ابھی تک اسی طرح اس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا آنسوؤں نے اس کی شلوار گیلی کر دی تھی۔

وہ خاموش تھی اور خاصی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی اُسے بانہہ سے پکڑ کر اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئی۔

(چنگاری، دہلی، اپریل۔ مئی ۱۹۸۴ء)

شوکت حیات

وبا

سڑکوں پر ۔ ۔ ۔ ۔ جھونپڑیوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں اور پھر اُونچی اُونچی عمارتوں میں اس شہر کے کتے دھیرے دھیرے مرنے لگے اُونچی عمارتیں مزید اُونچی اور نیچی عمارتیں زیر زمیں ہونے لگیں۔ یہ سب شاید صرف اس لیے ہوا تھا کہ اِس شہر کے کتے دھیرے دھیرے مرنے لگے تھے اور کتے کیوں مرنے لگے تھے۔ اس کی طرف کسی کو دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔

پہلے پہل سڑک کے آوارہ اور ذلیل قسم کے لاوارث کتوں کی موت شروع ہوئی۔ میونسپلٹی کی گاڑی آتی اور کتوں کی لاشیں اُٹھا کر شہر کے ایک کنارے پھینک آتی۔ لوگ اپنی ناک پر سے رومال ہٹا کر آرام کی سانس لیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ کتے اتنے ذہین اور خوددار تھے کہ سڑکوں پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس مرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں مرنے والے کتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ لوگ منہ اور ناک پر رومال رکھے ہوتے چلتے تھے اور کتوں کی دھڑا دھڑ ہونے والی اموات کے لیے ایک دوسرے سے پوچھنا چاہتے تھے، لیکن ایسا لگتا تھا کہ ان کے ہونٹوں پر قفل لگا ہوا تھا اور اندر ہی اندر تیز چاقو سے کوئی انہیں ٹکڑوں میں تقسیم کیے جا رہا تھا۔

کتوں کے مرنے کی تعداد میں اتنا اضافہ ہونے لگا کہ لوگوں کا سڑکوں پر چلنا مشکل ہو گیا۔ انہیں تھوڑی تھوڑی دور پر اچھل اچھل کر کتوں کی لاشوں کو پار کرنا پڑا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈرتے ڈرتے لوگوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور تب کچھ لوگ جو سچ مچ کتوں کی لمحہ لمحہ ہونے والی موت سے بے چین تھے، محکمۂ صحتِ عامہ کی عمارت کے سامنے جا کر شور مچانے لگے۔ بہت دیر کے بعد ڈائرکٹر باہر آیا تو ان لوگوں نے

دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک مرا ہوا کتا جھول رہا تھا۔
اس نے آتے ہی کہا۔
"آپ لوگ گھبراتے نہیں۔ صرف سڑکوں کے غلیظ لاوارث اور مریل کتے ہی نہیں مر رہے ہیں بلکہ صاف ستھرے اور تنومند کتے بھی مرنے لگے ہیں۔ کم از کم یہ اطمینان بخش بات ہے کہ لاوارث اور مفلسوں کے ساتھ ساتھ متمول لوگوں کے کتے بھی زد میں ہیں۔ ویسے مٹھی بھر چند مالداروں کے کتوں کے مرنے کی خبر نہیں ہے۔ ہمارا محکمہ کتوں کے یوں دھڑا دھڑ مرنے کی بابت پوری تندہی سے تحقیق و تفتیش کر رہا ہے۔ جیسے ہی ہمیں بیماری کا پتہ چلا اخباروں میں اعلان کر دیا جائے گا۔"
واپس مڑتے ہوتے ڈائرکٹر کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی چند قدم چلنے کے بعد وہ مجمع کی طرف لوٹا اور اس نے کہا۔
"اب تک تو یہ بیماری چوہوں میں ہی ہوتی تھی جسے پلیگ کہتے ہیں۔ لیکن اس طرح کتوں کا مرنا اپنی نوعیت کے اعتبار سے پوری دُنیا میں پہلی دفعہ ہے...... نہ معلوم کیا بات ہے ... نہیں معلوم ...!"
وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے چیمبر میں چلا گیا اور کرسی پر گر کر ہانپنے لگا۔ جو لوگ شور مچاتے ہوئے صحت عامہ کی عمارت کے کیمپس میں گھسے تھے، ان کے چہرے بجھ گئے اور وہ لوگ جنہوں نے ڈائرکٹر کی پھیکی ہنسی پڑھ لی تھی، مایوسی کے سیلابی ریلے میں ڈوبنے لگے۔ بڑی مشکل سے مرے ہوئے کتوں کو بھلانگتے ہوئے وہ لوگ جب سڑک پر آئے تو کچھ لوگ جن کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا ایک دوسرے کے قریب آئے اور دھیرے دھیرے بولے۔
"اب تو بڑی بڑی عمارتوں کے موٹے تازے کتے بھی مرنے لگے ہیں اور عمارتوں کے مکیں شاید اپنے کتوں اور سڑک پر مرے ہوئے کتوں کے حشر میں فرق کا اندازہ لگانے کے لیے سڑکوں پر دیوانوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔"
جب کئی ایک دن گزر گئے اور کتوں کے مرنے کا سلسلہ جاری رہا تو پورے شہر میں سڑاند پھیلنے لگی۔ اخبار والے کتوں کے مرنے کی خبر کو خوب اُچھال رہے تھے۔ شہر والوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ شہر کے کنارے جہاں مرے ہوئے کتوں کی لاشیں پھینکی جانے لگی تھیں وہاں اب مزید لاشوں کے لیے گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ مردہ کتوں کی سڑتی ہوئی

لاشوں کی پہاڑیاں بن رہی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر لگتا کہ کتوں کی لاشیں اُوپر اُٹھتے اُٹھتے آسمان میں پہنچ جائیں گی۔

ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ آس پاس کے گاؤں میں بھی کتے مرنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور گاؤں والے اپنی سرحدوں کے پاس خالی اور بے کار جگہوں پر شہر کے مردہ کتوں کی اُونچی پہاڑیاں دیکھ کر غصے میں کتوں کی لاشیں شہر کی طرف پھینکنے لگے ہیں۔ شہر والے چاہتے ہوئے بھی گاؤں والوں کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کرنے سے اس لیے معذور تھے کہ وہ خود بھی اپنے یہاں کے مرے ہوئے کتوں کو گاؤں کی طرف پھینکتے تھے۔

ایک بات وہ اخبار کا رپورٹر محسوس کر رہا تھا کہ جیسے جیسے کتوں کے مرنے میں اضافہ ہو رہا تھا لوگوں کے خاموش رہنے کے عمل میں شدت سی آنے لگی تھی۔ ہر آدمی مجرموں کی طرح شرمسار سہمی سہمی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ شروع شروع میں کتوں کے مرنے پر چرچے کئے، حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن اب ---- اب تو لوگ زرد پھٹے ہوئے چہروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور فوراً اپنی گردنیں جھکا لیتے۔

آدمیوں کا انبوہ جو ہر قدم پر کتوں کی لاشوں سے بچنے کے لیے اُچھلتا تھا، اب شاید اس خوف میں مبتلا تھا کہ کتوں کے مرنے کے بعد کہیں ان کی باری نہ آجائے۔ لیکن لوگوں کو ایک ہی اطمینان تھا کہ جس تیزی سے کتے مر رہے تھے، اسی تیزی سے پیدا ہو رہے تھے۔ اور لوگوں کو تھوڑی حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ اتنے سارے کتے اس شہر میں آئے کہاں سے، جبکہ کچھ روز پہلے صرف رات کے کسی پہر سناٹے میں کتوں کے وجود کا کبھی کبھار احساس ہوتا تھا۔ ان کے بھونکنے یا رونے کی آواز سن کر۔

اخباروں میں ان دنوں صرف کتوں کی خبریں ہوتی تھیں۔ اس شہر سے پھیلتے پھیلتے یہ بیماری ہر شہر میں پھیل گئی۔ ہر گاؤں تک جا پہنچی اور اب اخبار کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ کتوں کی اموات کی خبر چھاپنے کے بعد اتنی جگہ بچتی ہی نہیں تھی کہ کوئی دوسری خبر بھی شائع کی جاتی۔ کتوں کے مرنے کی رفتار روز افزوں بڑھتی رہی اور ان دنوں تیسری دُنیا کے تمام مصوروں نے جب کبھی آدمی کی تصویر بنائی، اسے لنگڑا دکھایا۔ سڑک، گھر، آفس ہر جگہ قدم قدم پر کتوں کی لاشوں کی وجہ سے ہر آدمی کو اچھل اچھل کر چلنا پڑتا تھا، اور نتیجہ میں ہر آدمی کچھ ہی دنوں کے اندر اچھی بھلی ٹانگیں رکھتا ہوا لنگڑا نظر آنے لگا۔

اس رپورٹر کو جو شہر کے کئی اخباروں کو کتوں سے متعلق خبریں روانہ کیا کرتا تھا سب سے زیادہ دقت یہ پیش آتی تھی کہ کوئی آدمی کتوں کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اور ان کے متعلق اپنا تاثر ہی بیان کرتا تھا۔ اس نے عوام کا تاثر جاننے کے لیے کئی کئی دنوں تک شہر کی خاک چھانی۔ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی گیا۔ نفسیات کی کتاب میں بالتونی آدمیوں کے متعلق پڑھی ہوئی خصوصیتوں کو ہر چہرے میں ڈھونڈھا۔ لیکن ہر جگہ لوگ منہ پر رومال رکھے اچھلتے ہوئے خاموش خاموش کتوں کا جنازہ ڈھوتے ہوئے نظر آئے جس کی وجہ سے اُن کے چہروں کو پڑھنا مشکل تھا۔ اور کہیں کوئی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوتے مل بھی جاتا تو تیز رفتار مشینوں کے شور میں کچھ سننا مشکل ہو جاتا۔

جب سے کتے مرنے شروع ہوتے تھے سارے شہر میں مشینوں کی رفتار بے تحاشا تیز کر دی گئی تھی اور انھیں ایک لمحے کو بھی بند کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ تمام مزدوروں کی چھٹیاں کاٹ لی گئی تھیں۔ بے چارہ رپورٹر دل ہی دل میں اپنے پیشے کو گالیاں دیتا ہوا چند محوِ گفتگو آدمیوں کو دیکھتے ہی اُن کے پاس آیا اور نفسیاتی طریقہ کار کام میں لاتے ہوتے ان سے مخاطب ہوا۔

"آپ لوگ بڑے ذہین اور ذمہ دار شہری معلوم ہوتے ہیں آپ لوگ ضرور لمحہ لمحہ مرتے ہوتے کتوں کے متعلق کچھ سوچتے ہوں گے"

ان لوگوں نے پہلے تو رپورٹر کی طرف ناگوار مردہ سی نظروں سے دیکھا۔ پھر چپ ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر خاموش رہتے ہوتے بھی وہ لوگ یوں نظر آتے تھے جیسے ایک دوسرے کو اچھی طرح سن اور سمجھ رہے ہوں۔ دراصل یہ لوگ کچھ دوری پر رکھے ہوتے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے جہاں جوٹھن کے لیے چند زندہ کتے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔

رپورٹر مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ آج وہ کتوں کی اموات سے متعلق عوام کی رائے معلوم کر کے رہے گا۔ لہذا اس نے تامل کئے بغیر ان میں سے ایک کو ٹہوکا دیا اور وہی سوال دہرایا۔ لوگوں نے اسے پھر ناگوار نگاہوں سے گھورا اور اپنی خاموش گفتگو میں معروف ہو گئے۔

جب تیسری بار پھر رپورٹر نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوتے وہی سوال دہرایا تو ان سبھوں نے مل کر رپورٹر کا گریبان پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی گردن پر اپنی گرفت

سخت کرنے لگے۔ رپورٹر نے ردعمل کی اس صورت کے متعلق خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تو اس نے آخری کوشش کی۔

"وہ ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ دیکھو کتے آسمان میں اُڑ رہے ہیں ۔۔۔۔"

ان لوگوں نے ہڑبڑا کر اس کا کالر چھوڑ دیا۔ اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ رپورٹر نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان لوگوں کے پاس سے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دے۔ کتوں کو پھلانگتا ہوا وہ بھاگا جا رہا تھا اور لوگ اس کے تعاقب میں لگے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے پیچھے دوڑنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

عجیب منظر سامنے تھا۔ چاروں طرف کتوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ دور سرے پر کتوں کی لاشوں کی پہاڑی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ آگے آگے رپورٹر اچھلتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے جم غفیر جوار بھاٹا کی صورت اُبھرتا اور ڈوبتا رواں دواں تھا۔ رپورٹر کو اپنی جان بچانی مشکل ہوگئی۔ وہ بدحواسی میں بے اختیار کتوں کی پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ سارے لوگ نیچے کھڑے تھے اور سرخ زبان اور زرد آنکھوں سے اُسے کھا جانے والے انداز میں گھور رہے تھے کچھ دیر بعد اس کا پیچھا کرنے والے دھیرے دھیرے لوٹنے لگے۔ رپورٹر کی سانسیں معمول پر واپس ہوئیں تو اُسے اپنے قدموں کے نیچے پلپلاہٹ کا احساس ہوا اور وہ چیخنے لگا۔ جان بچانے کی فکر میں دوڑتے ہوئے وہ پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا تھا لیکن اب اُسے خیال آرہا تھا کہ وہ کتوں کی سڑتی گلتی لاشوں پر چل رہا تھا۔ اور دور دور تک صرف کتوں کی لاشیں تھیں۔ رپورٹر کے حلق میں چیخیں گھٹنے لگیں۔ گھن سے اُبکائی آنے لگی۔ وہ بے تحاشا گرتا پڑتا بھاگنے لگا۔ اس کے دونوں پیر بار بار کبھی کسی کتے کی اکڑی ہوئی ٹانگوں کے درمیان پھنس جاتے اور کبھی کسی کتے کے سڑے ہوئے گلے سے گوشت میں نہا جاتے۔ جب بہت دور تک دوڑنے کے بعد وہ پہاڑی کی ڈھلان کی جانب پہنچا تو اس نے چھلانگ لگا دی۔ نیچے آتے آتے ابکائی کرتا ہوا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"اٹھو ۔۔۔ اٹھو ۔۔۔ کتوں کی نگری کے مہربان رپورٹر ۔۔۔"

وہ اُٹھا اور "کتے۔۔۔۔کتے" بڑبڑاتا ہوا پھر بے ہوش ہو گیا اس کے جسم کا سارا خون جیسے نچوڑ لیا گیا تھا۔ بوڑھے نے اس کے چہرے پر پانی کے مزید چھینٹے مارے۔

وہ پھر "کتے۔۔۔۔یہ کتے نہیں چھوڑیں گے۔۔۔۔یہ کُتے مرنا نہیں چھوڑیں گے۔۔۔۔" بڑبڑاتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ بوڑھے کے چہرے کی دردمندی دیکھ کر اُسے کچھ ڈھارس ہوئی۔ آہستہ آہستہ اُسے ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

"گھبراؤ نہیں!۔۔۔۔میں تمہیں کتے کی پہاڑی کے نیچے سے اُٹھا لایا ہوں۔ اور وہ یہاں سے کافی دور ہے۔"

بوڑھے نے کہا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"تم رپورٹر ہو نا۔۔۔۔یہ دیکھو میں نے تمہارا کیمرا اور بیگ حفاظت سے کونے میں رکھ دیا ہے۔۔۔۔لیکن یہ تو بتاؤ۔۔۔۔" بوڑھا رُک کر بولا" تم اس شہر میں دوسرے آدمی ہو جو کتوں کی موت کے متعلق اتنے زیادہ پریشان ہو۔۔۔پہلا آدمی میں ہوں۔۔۔۔آخر تم اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔۔۔۔؟"

"مجھے۔۔۔۔مجھے اخبار میں کتوں سے متعلق خبریں ارسال کرنی پڑتی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اسمبلی، پارلیمنٹ، سکریٹریٹ اور تمام سرکاری اداروں میں بھی کتوں کی ان گنت لاشیں پائی جانے لگی ہیں۔ اور ان کی کارروائیاں روک دینی پڑتی ہیں۔ مجھے حیرت اُن آدمیوں پر ہے، جو ذہنی اعتبار سے اس قدر کتے ہو چکے ہیں کہ ان کتوں کی موت کے تعلق سے ذرا بھی انتشار اور بے چینی کا شکار نظر نہیں آتے۔ کچھ پوچھو تو اُلٹا مارنے کو دوڑتے ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔۔۔۔سوچا تھا کہ ہوش مندی اور صداقت کا تقاضا ہے کہ ان معاملات کے بنیادی اسباب کا پتہ لگاؤں۔۔۔۔میں بھی اوروں کی طرح بس کام سے کام رکھوں گا۔۔۔لیکن آپ کون ہیں؟"

"میں محکمہ صحت عامہ کا ڈائریکٹر ہوں اور جب سے کتے مرنے شروع ہوئے ہیں، یہاں آ کر کتوں کی اموات کا سبب تلاش کرنے کے لیے مستقل تگ و دو کر رہا ہوں۔۔۔۔"

کس نتیجے پر پہنچے؟"

"ابھی تک میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غالباً میرے محکمے سے کتوں کی موت کے سبب کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ہاں ان کی موت کے بعد پھیلتی ہوئی سڑاند کے تدارک کے متعلق ہمیں سوچنا

ہے۔ لیکن ان کی موت کی وجوہات کے سلسلے میں مجھ پر کہیں سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔"

"کامیابی ہوئی۔۔۔۔؟"

"کسی قدر۔۔۔ شاید ایک خطرناک شروعات کی ابتدا ہے۔۔۔۔ سڑاند ایسی ہے کہ گہرائی سے کچھ غور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔۔ ویسے جب سے کتے مرنے شروع ہوئے ہیں، پورے شہر کی مشینوں کی تیز رفتاری نے بھی کام میں بہت خلل پیدا کیا۔۔۔ کچھ لوگوں نے سوچا تھا کہ مشینوں کی تیز رفتاری اور مزدوروں کی چھٹیوں کی کٹوتی کتوں کو مرنے سے بچا لے گئی۔۔ لیکن ان کی ہلاکتوں میں اور بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔۔۔ ویسے دلچسپ بات یہ ہے کہ سب سے پہلے لاوارث اور غریبوں کے کتے مرنے شروع ہوتے۔ بعد میں بڑے لوگوں کے کتے بھی مرنے لگے۔۔۔ مٹھی بھر چند مالدار لوگوں کے کتے ابھی تک زندہ ہیں۔۔۔!"

دوسرے دن اخباروں میں کتوں کی موت سے متعلق ایک نئی خبر چھپی تھی۔

عوام کے لیے خوش خبری۔۔۔ کتوں کے مرنے کا سبب کوئی بیماری نہیں ہے۔۔۔ معلوم ہوا ہے کہ ۹ء۹۹ فیصد مرے ہوئے کتوں کی گردنوں پر آدمیوں کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ کتے گردن گھونٹ کر ہلاک کئے جاتے رہے ہیں۔

یہ خبر دھیرے دھیرے گشت کرنے لگی اور جب پورے شہر میں پھیل گئی تو ایک دوسرے کی طرف مجرموں کی طرح ادھ کھلی نظروں سے دیکھنے والے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے لوگ کتوں کی لاشوں پر اچھل اچھل کر ایک دوسرے کی گردن مارنے میں مصروف ہو گئے۔

رپورٹر کو اچانک یاد آیا کہ لوگوں سے انٹرویو لیتے ہوئے اس نے، ان کے کنکھیوں سے کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر پر بار بار دیکھنے کے گرسنہ عمل کو نظر انداز کیا تھا جہاں کچھ جوٹھن کو پانے کے لیے ایک کتا اور ایک آدمی ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ کتا، آدمی روبرو، اور درمیان میں کچھ پس خوردہ۔

(شب خون، الہ آباد، جون ۱۹۸۴)

طاہر نقوی

خلا میں اٹکے ہوئے آدمی

ہوا چپ ہے اور سیپ میں نفرت پرورش پا رہی ہے۔ تاریکی خوف اور دہشت کی صورت میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے اور دلوں کے درمیان ان دیکھی اور غیر شعوری دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہونے والوں کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہے اور ہر طرف پھیلا ہوا سناٹا اُن کی روحوں سے یوں چمٹا ہوا ہے گویا ان کے جسموں سے زہریلے سانپ لپٹے ہوتے ہوں۔ لیکن اس کیفیت کی شدت سے بے خبر چند لوگ کچھ دور ہٹ کر چوراہے پر سر نہوڑائے بیٹھے ہیں۔ کبھی ان میں سے کسی کی اُدھ کی آواز اس سفاک سی خاموشی میں گونج اُٹھتی ہے جیسے کوئی پیدائشی گونگا یکایک بول اُٹھا ہو اور کبھی اُن میں غلیظ گالیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ دن بھر کی کمائی روز وہ اسی طرح اس جگہ آکر داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ پھر اُن میں سے روزانہ ایک سینہ تانے اور باقی اپنے خالی ہاتھ جھاڑتے ہوئے وہاں سے اس لمحے اٹھتے ہیں، جب آس پاس کی مسجدوں سے اذانیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

اچانک ان میں سے ایک بیچ کھیل میں اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرے اُسے ابھی بیٹھ جانے کی تاکید کرتے ہیں مگر وہ جانے پر ہی مُصر رہتا ہے جس کی وجہ سے آپس میں گالی گلوچ کے بعد بات ہاتھا پائی تک پہنچتی ہے نتیجے کے طور پر اس گونگی فضا میں اس زبردستی اُٹھنے والے کی گھٹی گھٹی چیخ ابھرتی ہے اور یہ دیکھتے ہوئے باقی پریشان ہو ہو کر ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے ہیں۔ اس وقت سامنے سے سائیکل پر سوار علاقے کا چوکیدار سیٹی بجاتا ہوا انھیں نظر انداز کرتا ہوا گزرتا ہے تو ادھر یہ لوگ اپنے اپنے وجود کی دیواروں کے اندر کانپ کر رہ جاتے ہیں۔

زینہ بہ زینہ بڑھتی ہوئی رات کی تاریکی اور گہری ہو جاتی ہے۔ اس علاقے کے چائے خانے

اور پان کی دوکانیں حالات کی بنا پر اب کم ہی کھلتی ہیں، جو ایک آدھ دوکان کھلی ہوئی تھی، وہ کب کی بند ہو چکی ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے کارپوریشن کے کھمبوں کے بلب پہلے ہی ٹوٹ چکے ہیں۔ صرف اس چوراہے کے ایک کھمبے کا بلب روشن ہے جس کے نیچے بیٹھے ہوئے یہ لوگ اندر ہی اندر لرز رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اُن میں سے ایک سرگوشی کرتا ہے تو اس کے جواب میں دوسرا اسی محلّے کی سرسراتی ہوئی سنسان گلیوں کی طرف دیکھتا ہے جن میں اب ہر طرف مردنی کا بسیرا ہے اور اس وقت کے مناسب حالات اس کے چہرے پر سانپ بن کر لہرانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کے ان سانپوں کو اپنے ہونٹوں کی موریوں سے اپنے ساتھیوں کے کانوں میں ڈالتا ہے تو یہ سانپ اس کے دیگر ساتھیوں کے چہروں پر رینگتے ہوئے ان کے دلوں کے اندھے غاروں میں جا گھستے ہیں۔

جہاں عبادت کے لیے خدا کا گھر تعمیر ہوتا ہے وہیں کہیں قریب ہی شیطان بھی اپنا گھر بنا لیتا ہے اور بہت جلد یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے گھر لوگ زیادہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر دکھائی نہیں دیتے، بلکہ پھدکتی ہوئی ٹڈیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جنھیں پھدکنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس لیے وہ کھٹا کھٹ اپنے اپنے گھروں سے یوں باہر نکل آتے ہیں گویا اس موقع کی تاک میں بیٹھے ہوں۔ وقت کی راکھ نے اُن کے چہروں پر گہری تہہ جما دی ہے۔ یہ اب ساری کی ساری ایک ہی پھونک سے اُتر گئی ہے۔ چنانچہ یہ ان لوگوں میں آ شریک ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھوں میں وہی مردہ جسم اُٹھائے گھوم رہے ہیں۔ اس وقت یہ اُن ہی کے خلاف چلّا رہے ہیں جو اس نئے واقعے کی بنا پر مزید سہم کر اب اپنے اپنے وجود میں محصور ہو کر خود اپنے آپ سے مختلف سوال کرتے ہیں۔ ایسے سوال سماجی حقیقت بن کر ان کے ذہنوں پر چوٹیں مارنے لگتے ہیں اور ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ماضی کی طرح یہ اب بھی ایسے زنداں میں رہتے ہیں جس میں سانس لینے کے لیے کوئی سوراخ نہیں ہے اور جہاں زندگی ایسا اندھا کنواں بن کر رہ گئی ہے جس میں سکّہ پھینک کر صدیوں کھڑے انتظار کرنے پر بھی سکّے کے گرنے کی آواز نہیں آتی۔ اس شور سے آس پاس کا سنّاٹا لرز کر رہ جاتا ہے اور اس لمحے کوئی گھبرا کر کھڑکی سے کوئی پردہ ہٹا کر اور کوئی چھجّے میں آ کر باہر گلی میں جھانکتا ہے۔

گندھک کے ڈھیر میں اب پھر آگ پھینک دی گئی ہے اور گلیوں میں ہنگامہ لحہ بہ لحہ بڑھنے لگا ہے۔ اسی دوران بے ترتیب زندگی کے گڑھوں میں یہاں کے مکین یوں گرنے

لگتے ہیں کہ کوئی آواز تک پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کے ساتھ رہنے والوں نے دھکا دے کر اُنھیں گرا دیا ہے، اس وقت سے اُن کی اپنی آواز غائب ہو گئی ہے۔ انسانی ذہن سچائی کی دریافت کے لیے بنا ہے مگر اس بھٹی سے الفاظ نکال کر وہ سامنے نہیں لا سکتے۔ لفظ دھرتی کے بیٹے ہوتے ہیں، جب یہ بے صدا ہو جائیں تو چاروں طرف بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کا زنگ اب دلوں اور دماغوں کو کھوکھلا کر چکا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے یہ خبر پورے شہر میں وبا کی طرح پھیل جاتی ہے اور طوائفیں جو اُوپر سے بنی سنوری اور اندر سے کھوکھلی اور مکروہ ہوتی ہیں، اپنے اپنے گاہکوں کی تلاش کی خاطر اس علاقے میں نظر آنے لگتی ہیں جن کی باتیں سن سن کر اشتعال انگیزی کی منہ زور لہریں یہاں کے رہنے والوں کے وجود کے اندر بیٹھے ہوتے غبار کو ساتھ لیے اٹھتی ہیں یوں لگتا ہے جیسے اُن کے اندر ٹھہرے ہوئے جوہڑ کا پانی موقع پا کر اب باہر نکل رہا ہو۔

اگلی رات پچھلی راتوں سے کہیں زیادہ تاریک ہو چکی ہے گویا اتنی تاریک رات اب کبھی نہیں آئے گی۔ کیونکہ کوئی گلی اب مکمل طور سے اندھیروں میں ڈوب گئی ہے اور کوئی نیم تاریک ہے۔ البتہ اکا دکا گھر کے اندر سے اب بھی سہمی سہمی سی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے۔ جا بجا گھر جلے ہوتے ہیں، کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹے ہوتے ہیں۔ یا اکثر گھروں کے سامنے جلے ہوتے سامان کا محض ملبہ پڑا ہے۔ سمندر کے اندر جب سرکش لہریں باہم ٹکرا کر تلاطم پیدا کرتی ہیں تو آخر میں اُن کا شور کسی ماتم کدے کا سماں پیدا کرتا ہے اس کے بعد ہمیشہ مکمل سکوت چھا جاتا ہے۔ ایسی گہری خاموشی میں ایک کمزور بچے کی سسکی، نوجوان کے غصے سے زیادہ بڑا عذاب لا سکتی ہے۔ اور پھر شاخ زیتون پر فاختاؤں کے بسیرے اُجاڑنے کے بعد وہی چند لوگ جب حسبِ عادت اسی چوراہے پر اکٹھے ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک ہنستے ہوتے کہتا ہے۔ دیکھا اگر میں تمھیں یہ ترکیب نہ سمجھاتا تو آج رات ہم جیل کی کوٹھری میں پڑے پھانسی کے پھندے کا انتظار کر رہے ہوتے۔ یہ سُن کر اس کے ساتھی قہقہہ لگا کر ان گلیوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہیں جو اب مزید سنسان ہو چکی ہیں، جن کے گھروں سے اُٹھتا ہوا دھواں ماضی کے احوال پر رو رہا ہے اور جہاں زندگی کا سارا سکون بے اعتمادی کے اندھے پن میں لڑکھڑا رہا ہے۔

چھوٹے چھوٹے قرائن کی آتشیں چاپ، اب مستقبل کی طرف بڑھنے لگتی ہے!

(کتاب نمائی دہلی۔ جون ۱۹۸۴ء)

غیاث احمد گدی

سُرنگ

وہ دونوں!

وہ مرد اور عورت خاموشی سے چلتے رہے، گلی، محلے، شہر پھر شہر کو بھی پیچھے چھوڑ کر ندی کی طرف جانے والے راستے پر مڑے تو عورت نے ایک چٹان کو دیکھ کر پہلے اُس پر پھونکیں مار کر گرد اُڑائی، گرد اُڑ گئی تو اُچک کر اس پر بیٹھ گئی۔

مرد جو اس کے ساتھ ذرا دیر سے چل رہا تھا ذرا چڑھ گیا۔

"کیوں؟ تھک گئیں؟؟ تم نے تو کہا تھا۔۔"

"ہاں تھک گئی بالکل تھک گئی۔۔۔" عورت نے کچھ یوں کہا کہ مرد کو سمجھنے میں ایک پل کی دیر نہ لگی عورت کی باتوں کی تہہ میں جو وہ ایک چھوٹا سا مفہوم دُھندلا دُھندلا دکھائی دے رہا تھا مرد نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی چٹکی میں لے لیا۔

لیکن تم نے تو کہا تھا۔۔۔۔ تم جہاں تک گھومو گے چلتی رہوں گی، ساری دھرتی سارے آسمان کی سیر کروں گی اور کبھی نہیں تھکوں گی، تم نے کہا تھا بلکہ یوں ہوگا ایک دن تم تھک کر بیٹھ رہو گے کیونکہ تم مرد ہو۔

وہ صرف کہنے کی باتیں تھیں، جب آندھی چلتی ہے نا تو سب اپنی جگہ قائم نہیں رہتا جب گزر جاتی ہے، ٹھہراؤ آجاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ تھا اب نہیں ہے۔ وہ آندھی سے پہلے کی باتیں تھیں۔

مرد۔۔۔ جس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی جیب سے رومال نکالتا ہے پسینہ پونچھتا ہے اور تھکی تھکی آنکھوں سے عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر گمبھیر ہو کر کہتا ہے۔

"تم اک ذرا آندھی سے ڈر گئیں زندگی کے معمولی جھٹکوں نے تمہیں اتنا تھکا دیا تمہیں تو میرے ساتھ ابھی پہاڑ کی چوٹی تک چلنا ہے۔"

"مجھے نہیں چلنا تمہارے ساتھ۔" یہ عورت کی الگ بھگ فیصلہ کن بات تھی۔

"مطلب؟" حیرت سے مرد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تم مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

"کیوں؟" مرد نے سرگوشی میں پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" یہ عورت کی آواز تھی۔ "تمہیں یاد ہے ہم نے وعدہ کیا تھا، جب ایک دوسرے کو تھکان کا احساس ہونے لگے گا، ہم صاف صاف کہہ دیں گے۔"

"ہاں کہا تھا۔" مرد اُس کے پاس چٹان پر بیٹھ گیا "لیکن یہ بھی کہا تھا کہ ہم اس کی وجہ بیان کریں گے۔"

"لیکن وجہ مجھے معلوم نہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ آندھی ہو۔"

"آندھی میں جو چیز اُڑ گئی وہ کیا تھی؟"

"مجھے پتہ نہیں وہ کیا چیز تھی۔" عورت نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔

"وہ چیز.....؟"

جب عورت بہت دیر تک خاموشی سے اِدھر اُدھر تکتی رہی تو مرد نے چپکے سے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ذرا دیر تک دونوں خاموش جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے پھر جب دھوپ نے ان کے سروں پر چنگاریاں بکھیرنا شروع کر دیں تو مرد نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں لگاتار بھونکتے رہنے والے خونخوار کتے کی آواز کمزور پڑ رہی تھی اور اس کے پاس کی فضا جو ایک عجیب ہیجانی وحشت کے دامن میں لپٹی ہوئی تھی اس سے راحت کا احساس ہونے لگا۔

مرد نے سورج سے آنکھیں ہٹا کر عورت کی طرف دیکھا اور دفعتاً ہنس پڑا لیکن ایکا ایک عورت کی تیز نگاہ نے اس ہنسی کو جھپٹ لیا۔

"تم ہنسے کیوں؟"

"تمہاری بات پر!"

"کس بات پر؟" عورت کی پیشانی پر کئی رگیں اُبھر گئیں۔ اس نے مرد کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور اندھیری کوٹھری میں گھس گئی۔

"تم نے ایک دن کہا تھا۔" مرد پھر مسکرایا، عورت کی ٹھوڑی کو ملائمت سے پکڑ کر ایک لمحہ میں انگلیوں پر لذت کی انشاں کو محسوس کر کے چھوڑ دیا۔

تم نے ایک دن، جب ہم کھلی چھت پر سخت دھوپ میں بیٹھے تپ رہے تھے، کہا تھا گرمی کے سورج کو جب میں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کوئی خونخوار کتا بھونکتا چلا جا رہا ہے۔

ہاں کہا تھا۔ عورت ذہن کی کال کوٹھری سے دونوں مٹھیوں میں کچھ لیے برآمد ہوتی۔ مجھے یاد آیا اور یہ بھی کہا تھا جاڑے کے دنوں میں وہی سورج مجھے ہرن کے بچے کی طرح پیارا پیارا لگتا ہے۔ جو میری گود میں آکر بیٹھ گیا ہو اور بوند بوند کر کے مری سانس میں راحت، تازگی اور زندگی کے قطرے اتار رہا ہو۔۔۔ لیکن۔

لیکن وہ عورت ذرا رکی "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں کہنا چاہتا ہوں" مرد نے اطمینان سے جواب دیا کہ شاید آندھی میں اڑ جانے والی چیز وہی ہو، رتوں کے جادو گر نے۔

"نہیں" عورت نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ یہ وجہ نہیں، ذرا دیر تک عورت خاموشی سے کچھ سوچتی رہی پھر یکایک بول پڑی۔۔۔ اچھا ٹھہرو، صاف صاف کہو کیا میں تمہیں اب بھی اچھی لگتی ہوں؟"

"نہیں۔"

"پھر تم مری طرح صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے؟"

"کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں وجہ نہ پوچھ بیٹھو!" مرد نے دھیرے سے کہا۔

جواب سن کر عورت اٹھ کھڑی ہوتی اور اپنے کپڑوں کی سلوٹیں درست کرنے لگی دیر تک ادھر پہاڑیوں اور کھلے میدان کی طرف تکتی رہی تو مرد نے ٹھوکا دیا۔

"اب۔۔۔ اب کیا سوچ رہی ہو؟"

سوچ رہی ہوں کیوں نہ ہم الگ الگ اپنے اپنے طور پر وجہ تلاش کریں" عورت کی آنکھیں ابھی تک کھلے میدان اور پہاڑیوں پر تھیں۔

مرد مسکرایا اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

وجہ تلاش کرنے کے لیے باہر نہیں جانا پڑے گا۔

عورت یکایک چونک اٹھی "تب؟"

"اندر اترنا پڑتا ہے۔"

اندر اترتے وقت مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایک بار تم سے چھپ کر میں وہ سیڑھیاں اندر گئی کہ

پھڑ پھڑا کر کئی چمگادڑیں ایک ساتھ نکل پڑیں اور میرے چہرے کو چھوتے ہوئے ایک طرف کو اُڑ گئیں۔

"پھر؟" مرد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

عورت تھوڑی دیر تک خاموش رہی، کچھ سوچتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

کیوں نہ تم میرے ساتھ اندر چلو، ہم دونوں مل کر وجہ تلاش کریں؟"

"ہاں چلو" مرد مسکرایا عورت کا ہاتھ تھاما اور دونوں چپکے سے اندر اُتر گئے...!

اندر جہاں تاریکیوں نے چاروں اور جال بن رکھا تھا، جہاں کا فرش پتھریلا اور نوکیلا تھا، جہاں بے شمار چمگادڑیں تھیں، دھول تھی، گرم، چہروں کو جھلس دینے والی ہوائیں تھیں۔

اندر جہاں سانپوں کے چلنے کی دہشت ناک سرسراہٹیں تھیں، جہاں درد تھا دُکھ اور پریشانیوں کی لمبی سُرنگ تھی، بے حد لمبی خاموش اور تاریک... لیکن...

لیکن اس کے بعد جہاں سُرنگ ختم ہوتی ہے؟

وہاں؟؟

عورت نے یقین اور بے یقین کے عالم میں گھبرا کر مرد کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور مرد اتنے ہی خوف اور اتنے بے یقینی کے ملے جلے جذبے سے ایک بارگی سر سے پاؤں تک لرز گیا، ایک دہشت تھی جو اس کے وجود پر چھاتی جا رہی تھی۔

مگر مرد نے ضبط کیا، نامعلوم جذبے کے ازلی احساس سے سرشار ہو کر عورت کو اپنے بازوؤں میں کس لیا، اور بے ساختہ چومنے لگا۔

آگے لمبی تاریک سرنگ چلتی چلی گئی۔ جس کا انت شاید اس طلوع پر ہو، جس کا انسان لاکھوں، کروڑوں برس سے انتظار کرتا چلا آ رہا ہے۔

(روحِ ادب، کلکتہ جنوری تا مارچ ۸۵ء)

قاسم خورشید

پوسٹر

وہ جاڑے کی کانپتی ہوئی بے پناہ سرد رات تھی۔ میرا چھوٹا سا شہر مکمل طور پر گھنے کہرے میں ڈوب چکا تھا۔ ہم تین افراد اپنے اپنے جسم کو گرم کپڑوں سے ڈھک کر شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے آس پاس کی دیواروں کو دیکھ رہے تھے جہاں کوئی مناسب جگہ نظر آتی پوسٹر چپکانے کے لیے وہاں تک پہنچ جاتے۔ پوسٹر چپکانے کا کام ہمیں رات میں ہی کرنا پڑتا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر میں یوں تو ڈراموں کا کوئی خاص اسکوپ نہ تھا، لیکن ایسا کرنے سے ہم سبھوں کی پہچان ضرور بنی تھی۔ ڈرامے سے دلچسپی کی اور بھی کئی وجہیں تھیں جیسے فلم یا ٹیلی ویژن کا خواب۔۔۔ عام لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ۔۔۔ تنظیم کی طرف سے بڑے بڑے شہروں اور بیرون ممالک کی سیر۔۔۔ خوبصورت کیریئر۔۔۔ انٹیلکچوئل کلاس میں داخلہ۔۔۔ یہ سب ہم لوگ انقلاب یا کرانتی کے نام پر آسانی سے کر لیتے تھے۔

اس رات کئی مقامات پر پوسٹر چپکانے کے بعد ہم سب رات کے لگ بھگ دو بجے ریلوے پلیٹ فارم کے پاس پہنچے۔ کہرا کسی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن رات اور بھی سرد ہو چکی تھی۔ کتے لگاتار بھونک رہے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے پاس ہی ایک پیڑ کے نیچے کچھ لوگ الاؤ کے چاروں طرف بیٹھے آگ اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر رہے تھے۔ میرا ایک دوست جو سردی سے بہت کانپ رہا تھا، الاؤ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ کئی مزدور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں اور بھی کئی جگہوں پر جانا تھا اس لیے میں نے اپنے ہاتھ میں لیئی کا بڑا سا ڈبہ اٹھایا اور اپنے دوسرے دوست کو پوسٹر دیتے ہوئے بولا کہ اس بیچ ہم دونوں پلیٹ فارم والا کام پورا کریں۔ یہی طے پایا اور پہلے پاس میں پڑی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی پرانی بوگی پر پوسٹر چپکایا اور پھر پلیٹ فارم کی طرف بڑھنے لگا۔

پلیٹ فارم بہت بڑا تو نہیں تھا... پھر بھی فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس ویٹنگ روم کا انتظام تھا۔ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے دروازے پر دربان ہوا کرتا تھا جو ساری رات سوتا رہتا، اس روز بھی وہ اپنے کمبل میں لپٹا ہوا غالباً سو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں ٹیوب لائٹ کی روشنی تیز تھی کہیں مدھم اور کہیں اندھیرا بھی تھا... کچھ لوگ دن بھر کام کرنے کے بعد معمول کے مطابق چھت کے نیچے سوتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے لیے موسم کی قید نہ تھی... پلیٹ فارم کے تاریک حصے میں ہم دونوں ٹارچ کی مدد سے پوسٹر چپکانے لگے اسی وقت ایک خارش زدہ کتا لیئی کے ڈبے کی طرف بڑھا تو میں نے جوتے سے اُس پر وار کیا اور وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ کچھ مخصوص جگہوں پر ہی ہمیں پوسٹر چپکانے کی اجازت تھی۔ اس لیے ان جگہوں پر خاص نگاہ تھی۔ پلیٹ فارم کے تاریک حصوں میں کئی پوسٹرس لگانے کے بعد میرے دوسرے دوست کو بھی شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا جبکہ اس کے جسم پر بھی اوور کوٹ... سوئٹر... گرم پینٹ... اونی شال سب کچھ تھا۔ اس نے مجھے بھی کچھ دیر کے لیے الاؤ کی طرف چلنے کو کہا۔ میں نے اُسے جانے کی اجازت دیدی اور تنہا پوسٹر پر لیئی لگاتا رہا۔ اور اسے جگہ جگہ چپکاتا بھی رہا۔ میرا دوسرا دوست بھی الاؤ کے پاس بیٹھ چکا تھا۔ تنہا ہونے سے مجھے پوسٹر لگانے میں دیر ہو جاتی اور اسی دوران جب میں پاس والی دیوار پر پوسٹر لگا کر لوٹا تو لیئی کا ڈبہ غائب تھا... ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا کہیں ڈبہ نظر نہیں آیا تو میں نے سوچا ممکن ہے دوستوں نے جان بوجھ کر پریشان کرنے کے لیے غائب کر دیا ہو لیکن دور الاؤ کے پاس انھیں بیٹھے ہوئے دیکھا تو یقین ہو گیا کہ لیئی کا ڈبہ یہاں سے کوئی اور اُٹھا کر لے گیا ہوگا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں پلیٹ فارم کے تاریک حصے میں ڈبہ تلاش کرنے لگا۔ جس خارش زدہ کتے کو کچھ دیر پہلے ہم نے اس جگہ دیکھا تھا اچانک پھر اس پر نظر پڑی، وہ ایک سرد چولہے کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جوتے سے ٹھوکر دے کر اسے باہر نکالا لیکن اس جگہ بھی لیئی کا ڈبہ موجود نہیں تھا۔ تب مجھے تشویش ہوئی۔ پلیٹ فارم کے روشن حصے میں بڑھا... اس جگہ بھی ناکامی ہوئی۔ تب اندھیرے میں پڑے ہوئے بقیہ پوسٹرس کو اُٹھانے کے لیے پہنچا ہی تھا کہ ٹارچ کی روشنی ایک گوشے میں پھسل گئی۔ اس جگہ ایک بہت نحیف سا بچہ جس کی عمر لگ بھگ سات سال رہی ہوگی جس پر کوئی کپڑا نہیں... سیاہ رنگت ... وہ بُری طرح کانپ رہا تھا اور لیئی کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا... وہ مجھے دیکھ کر بالکل سہم گیا۔ ٹارچ کی روشنی اس بچے کے اور قریب پہنچ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ ڈبّے کے اندر تھے، میں

بالکل خاموش رہا۔ وہ کسی بھی حال میں ڈبّہ مجھے واپس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تب میں ٹارچ کا رُخ دوسری طرف موڑ کر دیر تک وہیں پر کھڑا رہا۔۔۔ محسوس کیا کہ بچہ تیزی کے ساتھ اس ڈبّے سے لیئی نکال کر اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرنے لگا تھا کچھ دیر بعد ساری لیئی وہ اپنے حلق میں اُتار چکا تو ٹارچ کی روشنی نے ایک بار پھر اُسے چھونے کی کوشش کی اس بار وہ بہت سہما ہوا نہیں تھا بلکہ ڈبے کے اندرونی حصّے میں جمی ہوئی لیئی کو بھی انگلیوں سے نکالنے میں مشغول تھا لیکن وہ سردی سے بدستور کانپ رہا تھا۔۔۔ میں نے سوچا کہ اپنی شال اس کے جسم پر۔۔۔ تب ہی مجھے بھی سردی کا احساس اور شدید ہوگیا پھر میں نے اپنی فکر کو مصلحت کی زبان دی اور دھیرے دھیرے وہاں سے بڑھتا ہوا اس جگہ پر آیا جہاں پوسٹر لگے ہوتے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں اپنے ناٹک کا خوبصورت پوسٹر دیکھا اور من ہی من آرٹسٹ کی تعریف کرنے لگا۔۔۔ تب ہی۔۔۔ دھیرے۔۔۔ دھیرے۔۔۔ فضا میں بوٹوں کی ٹاپ گونجنے لگی۔ ٹاپ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ پھر بھی گھنے اندھیرے سے اُبھرنے والے اس شخص سے ملنا چاہتا تھا۔۔۔ آواز قریب آتی گئی۔۔۔ بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی پھر بھی نظر نہیں آیا۔ لیکن پلیٹ فارم پر خاص تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔۔۔ خارش زدہ کتا آوٹر سگنل کی طرف بھاگا۔ مسافر سنبھل کر بیٹھ گئے۔۔۔ ایک بوڑھی عورت پھلوں کی ٹوکری اُٹھا کر ریلوے لائن کے اس پار جانے لگی۔۔۔ چھت کے نیچے غیر قانونی طور پر سوئے ہوئے لوگ جب بھاگنے لگے تو اسی وقت وہ شخص نمودار ہوا۔۔۔ بھاگنے والوں کا پیچھا کر کے انھیں گندی گالیوں کے ساتھ پیٹتا رہا۔۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی کا سہاگ اُجڑ گیا۔۔۔ بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی سے میں اچھی طرح مل چکا تھا کہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر کم اور نشے میں زیادہ ہوا کرتا تھا۔۔۔ وہ شخص اب تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔۔۔ بالکل قریب پہنچ گیا۔۔۔ ٹارچ کی روشنی میں میرا چہرہ دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیوں بھیا پھر کوئی نیا ناٹک ہے کیا؟"

"ہاں پرسوں اسٹیج ہونے والا ہے۔ گیٹ پاس آپ کے لیے بھجوا دوں گا۔"

"بہت محنت کرتے ہو بھیا۔۔۔ خود ہی ناٹک کھیلو بھی اور خود ہی پوسٹر بھی لگاؤ۔۔۔ بہت لگن سے کام کرتے ہو۔"

"محنت سے ہی سب کچھ ہوتا ہے نا۔۔"

"فلم ولم میں چلے جاؤ تو ہم کو بھی چانس دینا ذرا۔۔۔ ہے۔۔۔ہے۔۔۔ ہے۔۔۔ تمہارا

دوست لوگ کدھر ہے؟"

"وہ سامنے الاؤ کے پاس"

پھر بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تب ہی اس کی نگاہ سردی سے کانپتے ہوئے اس پِلّے پر پڑی جو کچھ دیر پہلے لیئی سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ پلّے نے اس کو دیکھا تو وہ اور بھی کانپنے لگا۔ شاید وہ رونا چاہتا تھا۔۔۔ وہ اس شخص سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے زمین پر رینگتے ہوئے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن بوٹ سے ٹھوکر دینے کے بعد وہ شخص معمول کے مطابق اسے بھاری بھرکم گالیوں کے ساتھ پیٹنے لگا۔ وہ جب بھی اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتا بوٹ کی ٹھوکر اُسے قید کر لیتی۔ پلّے کو جب بہت پیٹ دیا گیا تو میں آہستہ آہستہ بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کی طرف بڑھنے لگا۔ سوچا کہ پاس والا پتھر اُٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں لیکن اس کی کرخت آواز نے مجھے روک دیا۔ وہ پلّے پر اور بھی تیزی سے برسنے لگا تھا۔

"آج کے بعد اگر تیرے کو پھر اِدھر دیکھ لیا تو جان نہیں بچے گی۔۔۔ سالا مسافروں کا مال چرانے کے لیے اِدھر اندھیرے میں بیٹھا رہتا ہے۔۔۔ لُچّا کہیں کا۔۔۔ تب نا یہ حال ہے۔۔۔ چل بھاگ یہاں سے چور کی اولاد۔۔۔"

میرے دوسرے دوست الاؤ کے پاس بیٹھے اونگھ رہے تھے۔۔۔ میں بھی اس جگہ پر بیٹھ گیا۔ باقی مزدور شاید سو چکے تھے۔۔۔ بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کی آواز اب بھی خلاء میں گونج رہی تھی۔ خارش زدہ کتا بہت دور سے ہی اس پر بھونک رہا تھا۔۔۔ پھر ریلوے لائن سے الگ ٹوٹی پھوٹی اس پُرانی بوگی کو میں غور سے دیکھنے لگا جو اس اسٹیشن کی خاص پہچان تھی۔ اسے کبھی انجن کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ اچانک ہوا کا سرد جھونکا میرے وجود پر حاوی ہو گیا تب الاؤ کو مزید روشن کرتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ آج سے لگ بھگ آٹھ سال پہلے بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کو میں نے جانا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی سرد رات تھی۔ ہم اس پُرانی بوگی پر پوسٹر چپکا رہے تھے۔ اندر سے سرگوشیاں اُبھریں۔ دُور سے آتی ہوئی روشنی میں انھیں جھانک کر دیکھا۔ بوٹوں کی ٹاپ والے اس آدمی کے ساتھ اور بھی دو اشخاص وہاں موجود تھے۔ دن میں ریلوے لائن کے آس پاس کوئلہ چننے والی ایک جوان عورت ان کی گرفت میں تھی۔ لوگ اپنی اپنی سطح پر اسے نوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بوٹوں کی ٹاپ والا آدمی عورت سے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تمہیں جتنا کوئلہ

چاہیے میں دوں گا۔۔۔عورت ان سے خود کو کسی طرح الگ کرنا چاہتی تو پیٹ بھی دی جاتی۔۔۔پھر دیر تک اسے منانے کا سلسلہ جاری رہتا اور اکثر وہ خوش بھی ہو جاتی۔ کبھی کبھی ان کی چھیڑ چھاڑ سے دیر تک ہنستی رہتی۔۔۔ دوسرے دن بازار میں کوئلہ بیچنے سے اس کی خاصی آمدنی ہو جاتی یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا عورت رات کے کسی حصے میں اس بوگی میں جاتی۔۔۔پھر کھلکھلانے چیخنے اور سسکنے کی آوازیں ملتیں۔ عورت جب نڈھال اس بوگی سے باہر آتی تو بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی کا بھی نشہ اُتر چکا ہوتا۔

دو سال پہلے ریلوے لائن پر کوئلہ چننے والی وہ عورت حادثے کا شکار ہو گئی تو دیر تک نعش کے پاس تنہا اس کا ننھا بالک رو رہا تھا۔

بوٹوں کی ٹاپ والے آدمی نے اب سے کچھ دیر پہلے جس بچے کو بُری طرح پیٹا۔۔۔۔۔مجھے لگا۔۔۔ یہ وہی بچہ تھا۔

اسی وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ بچہ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا آؤٹر سگنل کے پاس جا رہا تھا جہاں اس کی ماں حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک اسی مقام پر پہنچا اور زور زور سے رونے لگا۔۔۔ پاس ہی میں کھڑا خارش زدہ کُتا بھی بہت اُداس تھا۔۔۔ لیکن دوسرے کتوں نے اس پر بھونکنا شروع کر دیا۔ رات کی خاموشی میں ہر تھوڑی دیر بعد بچے کے رونے کی آواز ملتی۔۔۔ ٹھنڈک سے کانپتے ہوئے جسم میں گرمی لانے کے لیے اس نے خارش زدہ کُتے کو زور سے دبوچ لیا تھا۔ شاید وہ اسی میں کوئی شفقت تلاش کر رہا تھا۔۔۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔۔۔ جب کوئی تیز رفتار ٹرین گزرنے لگتی تو اس کے رونے کی آواز اور تیز ہو جاتی۔ ٹرین گزر جانے کے بعد نہ جانے کیوں وہ دیر تک پٹری پر ہاتھ رکھتا۔۔۔ اسے محسوس کرتا اور دیر تک اپنی انگلیوں کو پھسلنے دیتا۔۔۔ پھر رونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔۔۔ اب وہ کسی شدید درد سے کراہ بھی رہا تھا۔

میرے دل میں ڈھیر سارے خیالات اُبھرتے رہے۔ زندگی کا ایسا روپ شاید میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ ان لمحوں نے میرے ذہن کو بوجھل بنا دیا۔۔۔ الاؤ کی گرمی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔۔۔ نیند کی دیوی میرے وجود کو بھی چھونے لگی تب اونگھنے والوں میں میں بھی شامل ہو گیا۔

الاؤ سرد ہونے پر کسی نے مجھے جگایا۔۔۔ صبح ہونے میں کچھ ہی دیر تھی شاید۔ صبح کے

ینظر آنے پر بھی ایک ہو کا عالم تھا۔ ہم تینوں دوست ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ
درسامنے والی پرانی بوگی پر لگے ہوئے اپنے نئے پوسٹر کو دیکھ کر بہت خوش تھے کہ بوٹوں
اپ والا آدمی کھنکار کر سر والاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے مزدوروں سے مخاطب ہوا۔

"ارے بدھنا... رگھو... موتیا... دیکھ آؤ ٹرسگنل پر حرامی بچے کی نعش پڑی ہے۔۔
یی سے سکڑ کر مرگیا سسرا... پاس والے دریا میں اٹھا کر پھینک دے اُسے... نہیں
لندگی پھیل جائے گی... چل جلدی سے نمٹا یہ کام۔۔"

تینوں مزدور اس نعش کو اٹھا کر دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ خارش زدہ کتا ان کے
پیچھے پیچھے تھا... نعش دریا میں پھینک دی گئی۔ تب میں کچھ بولنا ہی چاہ رہا تھا کہ پوسٹر سامنے آگیا۔
بچے کی نعش آج بھی موجوں کے ساتھ نہ جانے کس سفر پر ہے۔

(آواز' نئی دہلی نومبر ۸۵ء)

محمد اشرف

جنرل نالج سے باہر کا سوال

گول چبوترے پر کھڑے ہو کر چاروں راستے صاف نظر آتے ہیں، جن پر راہ گیر سواریاں اور خوانچے والے چلتے رہتے ہیں۔

چبوترے پر جو بوڑھا آدمی لیٹا ہے، اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہیں۔ کہیں کہیں پیوند بھی لگے ہیں۔ اُس کی داڑھی بے ترتیب ہے اور چہرے پر لاتعداد شکنیں ہیں۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہو چکی ہے۔

وہ راستے پر چلنے والے ہر فرد کو بہت حسرت سے دیکھتا ہے۔ جب کوئی خوش خوش اس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ دُور تک اور دیر تک اُسے دیکھتا رہتا ہے۔

کسی طرف سے ایک دس گیارہ برس کی بچی آئی۔ وہ اسکول کی پوشاک پہنے ہوئے ہے۔ بستہ کندھے پر لٹکا ہے۔ ناشتہ کا ڈبہ ہاتھ میں دبا ہے۔ لڑکی کے بال سنہری ہیں۔ چہرہ گلابی ہے اور آنکھوں میں ایک سادہ سی چمک ہے۔ بے فکری خوشحالی اور بچپن جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو آنکھوں میں ایسی ہی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

اُسے آتے دیکھ کر بوڑھے کی آنکھوں میں کچھ چمکا۔ جب وہ پاس سے گزری تو بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے پیر چھوئے۔ بچی جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ تک بوڑھے کو دیکھتی رہی پھر اُس کی آنکھوں میں خوف چمکا۔ گھر کی نصیحتیں ذہن میں کلبلائیں، لیکن بوڑھے کے چہرے پر اس نے جانے کیا دیکھا کہ آنکھوں کا خوف مدھم پڑ گیا اور بھولا بھالا چہرہ دردمندی کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اس نے بہت اپنائیت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بابا۔ بھوک لگی ہے؟"

بوڑھا دھیمے سے مسکرایا۔

"ہاں۔ لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت جاگی۔ اُس نے بوڑھے کا ہاتھ اپنے پیروں پر سے آہستگی کے ساتھ ہٹایا اور چبوترے پر اُس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"میرے پاس پچاس کا سکہ ہے۔ تم لوگے؟ تمہیں ضرورت ہے؟"

"ہاں ضرورت ہے، لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں روکا۔"

لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پھر تم نے مجھے کاہے کو روکا بابا؟"

بوڑھے نے بہت نحیف آواز میں اُس سے کہا۔

"منّی! بڑا احسان ہوگا اگر تم میرا ایک کام کر دو۔"

بچی نے اپنا بستہ اُتار کر چبوترے پر رکھا اور بوڑھے کے قریب کھسک کر بہت اپنے پن کے ساتھ کہا۔

"بتاؤ کیا کام ہے تمہارا۔ میرے کرنے کا ہوگا تو میں کر دوں گی۔ نہیں تو پاپا سے کہہ کر کرا دوں گی۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس دفعہ سردیوں میں اُنہوں نے پڑوس کے گھر میں دو کمبل دیئے تھے۔ جمیلہ کی امّاں اور اس کے بھائی کو بہت سردی لگتی تھی۔"

بوڑھے نے یہ سب باتیں بہت لاتعلقی سے سنیں اور کہا۔

"تم میرا ایک کام کر دو۔ مجھے ایک بات بتا دو۔"

"کیا بات ہے۔ پوچھو۔ معلوم ہے جنرل نالج میں سب سے زیادہ نمبر میرے آتے ہیں کلاس میں۔"

"کس چیز میں منّی؟"

"یہ... یہ ایک چیز ہوتی ہے۔ مطلب ایک سبجیکٹ ہوتا ہے۔ اس میں ساری باتیں آجاتی ہیں۔ جیسے کون سا پہاڑ سب سے اُونچا ہے؟ کون سی ندی سب سے بڑی ہے اور بہت ساری باتیں۔ تم مجھ سے کوئی بھی سوال پوچھ کر دیکھ لو۔ مگر جلدی سے پوچھ لو۔ دیر ہو جائے گی تو ممی ڈانٹیں گی اور تمہارے پاس بیٹھا دیکھ لیا تو پاپا تو پٹائی ہی کر دیں گے۔ اب جلدی سے پوچھ لو۔"

"سنو" بوڑھے نے نیم دیوانہ ہو کر بہت راز داری کے لہجے میں قریب آ کر، اتنی قریب کہ بچی نے اس کے چہرے کی ساری شکنیں گن لیں۔ کہا۔

"مجھے یہ بتا دو کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا؟"

بچی کا ہاتھ بستہ پر جہاں رکھا تھا وہیں رکھا رہ گیا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اچانک وہ کھکھلا کر ہنسی۔

"واہ، یہ ہمیں کیا معلوم۔ یہ تو تمہارے ابّا کو معلوم ہو گا کہ تمہاری کتنی عمر ہے۔ اور تم کب مروگے یہ اللہ میاں کو معلوم ہے"

کئی راہ گیر اُن کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔

بوڑھے نے اُن کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"کوئی مجھے بتا دے کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کب مروں گا۔ یہ بچی نہیں بتا پا رہی۔ تم بتا دو بیٹے" اس نے ایک نوعمر لڑکے سے کہا جس کے ہاتھوں میں کرکٹ کا بلّا تھا۔

وہ لڑکا آگے بڑھا، اس کے چہرے پر ذہانت جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔

"بابا۔ جب آپ پیدا ہوئے۔ . . . نہیں نہیں۔ جب آپ چھوٹے تھے، تب کی کوئی بات یاد ہے؟ کوئی بہت ہی خاص بات اگر آپ بتا دیں تو ہم آپ کو آپ کی عمر بتا دیں گے"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ اُس وقت سب لوگ لڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہار گئے تھے" بوڑھے نے سوچ کر کہا۔

"تو آپ پہلی جنگ عظیم کے وقت پیدا ہوئے ہوں گے۔ مگر آپ کی عمر تو سو سال سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ آپ شاید کسی اور جنگ کی بات کر رہے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے حساب سے تو آپ ساٹھ پینسٹھ سال کے ہوں گے صرف"

لڑکے نے اپنا بلّا چبوترے پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

"نہیں بیٹے" بوڑھے نے کہا "پہلی جنگ عظیم تو کل کی بات ہے"

بھیڑ میں سے ایک جوان شخص آگے نکلا اور حساب لگا کر بتایا۔

"آپ کی عمر تقریباً ایک سو پچیس سال ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو لگ بھگ اتنا ہی وقت بیت چکا ہے"

بوڑھے کے مٹیالے سے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ اُس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ پھر اُس نے

بہت دقت کے ساتھ کہا۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ تو ابھی کا واقعہ ہے۔"

بھیڑ میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ لیکن بوڑھے کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی نے سب کو مجبور کیا کہ کوئی اس پر شک نہ کرے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

اتنے میں بچی نے تاریخ کی کتاب کا ایک سبق یاد کیا اور اُچھل کر بولی۔

"تم پورے ۲۲۳ سال کے ہو۔ پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی۔"

بوڑھے نے اپنا سر انکار میں ہلایا۔

بھیڑ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شام بڑھ رہی تھی اور سائے پھیلنے لگے تھے۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سب نے اپنی اپنی معلومات کو کھنگالا۔ ایک ۳۵۔ ۴۰ برس کے آدمی نے بڑھ کر کہا۔

"بابا، آپ کی عمر ۴۲۸ برس ہے۔ اکبر نے ہیمو کو پانی پت کی دوسری جنگ میں ۱۵۵۶ء میں ہرایا تھا۔"

بوڑھے نے بہت مایوسی کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلایا۔

لوگ جنگوں کو یاد کرتے رہے اور حساب لگاتے رہے اور بوڑھے کو اس کی عمر بتاتے رہے۔ اور وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا رہا۔

اتنے میں بھیڑ کو چیرتا ہوا بچی کو ڈھونڈتا ہوا اس کا باپ آگیا۔ اُس نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھانا چاہا۔ بچی خوف زدہ نظر آرہی تھی، لیکن ہمت کر کے اُس نے اپنے باپ سے کہا۔

"پاپا! ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن کے سوال کا جواب دیں گے ورنہ اپنے پاپا سے کہیں گے۔ اب آپ آگئے ہیں۔ آپ ہی بتا دیجیے کہ ان کی عمر کیا ہوگی اور یہ کب مریں گے؟"

بچی کے شفیق باپ نے بچی کا ہاتھ چھوڑا۔ اب تک جو بیتا تھا، وہ لوگوں سے سُنا اور بوڑھے بابا کو غور سے دیکھ کر کچھ سوچا اور پھر بوڑھے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

تب بوڑھے نے پیوند لگے لبادے سے اپنے گھٹنے چھپائے۔ اتنے میں بھیڑ کے اندر سے ایک شخص نہایت اعتماد کے ساتھ باہر نکلا اور بولا۔

"ہو نہ ہو یہ آدمی سکندر اعظم کے وقت میں پیدا ہوا تھا۔"

اس دفعہ بوڑھے سے پہلے بچی کے باپ نے نفی میں سر ہلایا اور دوزانو ہو کر بوڑھے کے

پاس بیٹھ گیا اُوپر سے نیچے تک بوڑھے کو دیر تک دیکھا اور پھر سر آگے کر کے بہت اعتماد کے ساتھ آہستگی کے لہجے میں بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بابا میں تمہاری عمر بتا دوں اور یہ بتا دوں کہ تم کب مرو گے؟"

بھیڑ میں سب کے چہرے چمکنے لگے۔ بچّی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ سب بہت اشتیاق کے ساتھ بچّی کے باپ کو دیکھنے لگے۔

بچّی کے باپ نے بہت محبّت سے بوڑھے کے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کپڑوں پر نہیں، بوڑھے کے ننگے گھٹنوں پر ہیں۔ تب اس نے بھیڑ کے افراد کو فرداً فرداً دیکھا، چوراہے کو دیکھا، چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے راستوں کو دیکھا، ہر طرف پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھا اور شفّاک آسمان کو دیکھا۔

"بابا" بچّی کے باپ نے بہت واضح الفاظ میں کہنا شروع کیا:

"بابا! تم ہمیشہ سے ہو اور اس دنیا میں کبھی نہیں مر پاؤ گے"

ننھی بچّی، نو عمر لڑکا، جوان آدمی اور بھیڑ کا ہر فرد حیران ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اس بار بوڑھے کا سر اثبات میں ہلا تھا۔

(آج کل نئی دہلی، فروری ۱۹۸۵ء)

مرزا حامد بیگ

لاکرز میں بند آوازیں

رات کا پہلا پہر تھا جب وہ دونوں ہانپتے کانپتے اس غیر آباد کنویں تک پہنچے تھے۔ ان دونوں نے اہم سرکاری دستاویزات کے بھاری پلندے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھے تھے۔ ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوتے بھی وہ ایک دوسرے کے لیے محض اس لیے اجنبی نہ تھے کہ دونوں نے اہم دستاویزات سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کی خاطر اس غیر آباد علاقے میں ایک ہی اُجاڑ کنویں کا انتخاب کیا تھا۔

اس افراتفری کے عالم میں تفصیلات میں جانے کا وقت ہی کہاں تھا، جان کے لالے پڑے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں بیک وقت وہاں پہنچے تھے اور ایک دوسرے سے تعارف کے لیے یہ بہت تھا۔

دونوں نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے کنویں کی منڈیر پر جھکے اور اپنے اپنے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔

اب وہ اس کھلے میدان میں، کنویں کی نیم پختہ منڈیر پر پھسکڑا مار کر بیٹھ رہے تھے۔ اُن دونوں کے نتھنے پیس شوٹ کچی مٹی کی بُو باس جذب کر رہے تھے اور دونوں میں سے ہر ایک کی گردن پر کسی ہوئی نکٹائی کی گرہ ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

وہ دیر تک یوں ہی ساکت رہے اور پھر اُن دونوں میں سے ایک نے اپنے سینے میں گہرا سانس بھرا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"غضب خدا کا، دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔"

"لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔" دوسرے نے قدرے متوحش نگاہوں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے جواب میں کہا۔

"ہاں کبھی نہیں۔"

چہرے مہرے کی خشونت اور شدید گھبراہٹ کا احساس دونوں میں مشترک تھا۔

"کچھ زمانہ ہی ایسا آگیا کہ اعتبار اٹھ گیا۔ پکے اشٹام پر لکھت پڑھت اپنے معنی کم رہ بیٹھی۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔ ایسے میں زبانی کہے سنے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ بہت روکا بہت بچایا لیکن نہیں صاحب۔۔۔ ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آتا تھا۔ ایسے میں کوئی کیا کرے۔"

"بہت بچ بچا کر یہ ریکارڈ یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا۔۔۔ کیا خیال ہے اب تک کاغذ کی روشنائی پانی میں ایک نہیں ہو گئی ہوگی؟"

"کب کی۔۔۔ لیکن شک سا پڑتا ہے۔ یہ کنواں کہیں خشک ہی نہ ہو۔"

یہ سُن کر دوسرا سناٹے میں آگیا اور بعد تامل کے بولا:

"کیا آپ نے اس سے پہلے دن کی روشنی میں اطمینان نہیں کر لیا تھا؟"

"اتنا وقت کس کے پاس تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ سب یکا یک ہی ہوا ہے۔"

"ہاں بس دیکھتے ہی دیکھتے۔"

اب دونوں کو چُپ سی لگ گئی۔ دیر تک گُم سُم بیٹھے رہے، پھر ایک نے کچھ یوں استفسار کیا:

"آپ کے اس بھاری بوجھ کی آواز نہیں آئی کنویں میں گرنے پر، سنی تھی آپ نے؟"

"نہیں، میں نے دھیان نہیں دیا۔ آپ کہئے، جب میں کنویں پر جھکا تھا تو آپ نے کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز سنی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔ دراصل ہم بہت جلدی میں تھے۔"

۲

ادھر وہ دونوں سخت تشویش کے عالم میں اُجاڑ کنویں کی منڈیر پر جھکے ہوئے تھے اُدھر گاؤں کی چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دوکانوں کے تھڑوں پر گنے چنوں کے لوگ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں تھامی ہوئی عرض داشتوں کے پلندے لہرا تے ہیں۔

بحث مباحثہ طول پکڑ گیا ہے۔ گئے وقتوں اور نئی سرکش نسل کے درمیان افہام و تفہیم ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ عقل سخت حیران ہے کہ وہ درمیان کے لوگ کیا ہوئے جو گئے وقتوں اور نئی نسل کے درمیان پُل بنا کرتے تھے۔

ہر طرف ایک ہڑبونگ مچا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شور ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔ گاؤں کے چوپالوں اور گلیاروں، شہر کے گلی محلوں اور دکانوں کے تھڑوں پر رعشہ زدہ ہاتھ ہیں جن کا کوئی شمار نہیں۔

مُردہ خانوں سے دس دس، بیس بیس سال پُرانے پوسٹ مارٹم کے مردے اپنے دو لخت سروں اور موٹے بخیئے سے سلے ہوئے پیٹ کو تھامے ہوئے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کا پوسٹ مارٹم رپورٹوں کے خستہ اوراق کے انبار ابھی کچھ دیر پہلے اُجاڑ غیر آباد کنویں میں جھونک دیے گئے۔

کوئی کہتا ہے۔
"اُمّتِ وسطیٰ (کیا ہوا)؟ کہاں گئے وہ لوگ جو اس نسلی خلیج کو پاٹ دیا کرتے تھے؟"

۳

رات کا پچھلا پہر تھا اور اُجاڑ کنویں کی منڈیر پر جھکے ہوئے دو بوجھل وجود کنویں کی سمت مسلسل جھکتے ہی چلے جاتے تھے۔

(اسلوب، کراچی۔ جولائی ۱۹۸۵ء)

مشتاق احمد یوسفی

حویلی

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دُنیا ہی اور تھی۔ بے روزگاری اور بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی حویلی کے پانچ چھ فوٹو کھنچوا لائے تھے۔ "ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھیے اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے۔" ہر آئے گئے کو یہ فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آتے ہیں۔" جن دفتروں میں مکان کی الاٹمنٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے ثبوت استحقاق دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں کچھ ہو یا نہ ہو حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا کبھی دڑبے اور کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹہ میں مل سکتا ہے، کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو۔" مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے۔ وہ کہاں مانتے۔ مہینوں پلاٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے، پیاسے پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ بیٹی داماد کے یہاں رہنے کا عذاب بھی سہا۔ آدمی جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے:

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

صبح سر جھکائے، ناشتہ کر کے نکلتے۔ رات کے کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں، پیروں میں ٹھیٹ پڑ گئے۔ بیماری بات کا صدمہ کہ کلاہ بھی نہیں سکتے تھے، کہ سو جانے والوں کی نیند خراب ہوگی۔ ململ کے کرتوں

ی لکھنوی کرتا جاتی میل میں چھپ گئی چنٹیں نکلنے کے بعد کرتے کی آستینیں انگلیوں سے ایک ایک انگل آگے نکل رہتی تھیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا۔ موتیا کا عطر لگاتے تین مہینے بیت گئے۔

ہر دُکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا کوئی راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دُکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہہ میں بے نور ہو گئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا دُکھ آدمی بھوگتا ہے ویسا ہی بھید اُس پر کھلتا ہے۔ دُنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سوکھی گلی خاک پھانکنے اور در در دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب پر کچھ اِلقا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون نیک نیت لوگوں نے کمزور دل والوں کی رہنمائی کے لیے بناتے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ مختصر یہ کہ جو بڑھ کر تالا توڑ لے مکان اُسی کا ہے۔ کانپور سے چلے تو اپنی مُہر چمچا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، کبوتروں کی چھتری، صراحی کے کیریٹر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دوکان کا تالا بھی ڈھو کر لائے تھے۔ علی گڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا اِلقا کے بعد بزنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائیلز، سمندر ہوا کے رُخ کھلنے والی کھڑکیاں اس کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی چوٹ سے فلیٹ میں اپنی آبادکاری بلا منتِ سرکار کر لی اور اپنے نام کی ایک بہت بڑی تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا ہوا تھا اور قبلہ عام جلال میں اُسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا "آپ شاعر کب سے ہو گئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا نہ قرقی ہوتے دیکھی۔"

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا، مطلب یہ کہ نام کی تختی کھٹکھٹائی

جیسے ہی انھوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا اس نے خود کا تعارف اس طرح کروایا گویا اپنے لپھڑے کی چپڑاس ان کے چہرے پر اُٹھا کر دے ماری "افسر محکمہ کسٹوڈین، ایوکیوی پراپرٹی" اس نے ڈپٹ کر کہا "بڑے میاں! فلیٹ کا الاٹمنٹ دکھاؤ" قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر جواب دیا "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا "بڑے میاں سُنا نہیں؟ الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ" قبلہ نے بڑی رسان سے اپنا سلیم شاہی جوتا اتارا اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کہ کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے "یہ ہے یاروں کا الاٹمنٹ آرڈر! کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمائیے گا" اس نے اب تک یعنی تادم تذلیل رشوت ہی کھائی تھی، جوتے نہیں کھاتے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

بڑے جتن سے بی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دوکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور تک اونے پونے بیچ دیئے۔ کچھ مال اُدھار خریدا۔ ابھی دوکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آنکلا۔ کھاتے، روکڑ بہی اور رسید بُک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے "مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا، کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا، دل لگی دیکھئے کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خاں آیا لقہ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے، میں نے سالے کو یہ دکھا دی، یہ ہے ہماری روکڑ بہی! یہ چھوڑ کر آئے ہیں! "چندرا کے پوچھنے لگا "یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا "ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں"

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محلسرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آکر درخواست کی کہ کیل ذرا ایک فٹ اوپر ٹھوکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے جھونکوں سے اس زنگیائی کیل پر ساری محلسرا پینڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیہ یا نیا مہتر بھی آتا تو اُسے بھی دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں"

اُس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بارہا دیکھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کیمرے کو موتیا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کی ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور

کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا دور بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جاتے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی Fantasy Land... میں پناہ لیتا ہے۔ ع

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی پناہ گاہ تھی۔ ممکن ہے تصویر میں یہ بے ادب نگاہوں کو ڈھنڈار دکھائی دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے سامنے تاج محل سیدھا سپاٹ گھروندہ معلوم ہوتا مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے، قبلہ اُسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہوگا جس میں لگے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی دندناتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہجہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجہ تھا جس پر سر دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی یہ راجپوتی جھروکے کے باقیات بتاتے جاتے تھے جس کے عقب میں اُن کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ "جتنے پھول غلیچے پر تھے، دتنے ہی باہر بغیچے میں تھے"۔ یہاں اطالوی مخمل کے کار چوبی پر زر برانداز پر گنگا جمنی منقش اگالدان رکھے ہوتے تھے جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تھی تو بلوریں گلے میں اُترتی چڑھتی صاف نظر آتی تھی جیسے تھرمامیٹر میں پارہ۔ حویلی کے چند اندرونی کلوزاپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم تصور کے رہین منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آتے تھے۔ ان پر Moorish Arch... کی تہمت تھی۔ ان کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی فوٹو میں نظر آتی تھی جسے شاہجہانی طرز کا نمونہ بتاتے تھے، شاہجہانی ہو یا نہ ہو اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کا ایک پاؤں تیموری تھا۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں۔ لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے گرے پھرتے تھے۔ حویلی کے شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اُتار چکا تھا، Roman Pillar کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہ چھت پہلے

سے کیوں نہ گری۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کی وجہ سے اس کے گرنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس عمر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں، قبلہ ان کڑیوں کی نشاندہی کرتے تھے جہاں دادا کے زمانے میں الالوئی فانوس لٹکا کرتے تھے۔ جن کی چھنی چھنی روشنی میں وہ گھنگھرالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی رننگ ـــــ کمنٹری ـــــ کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ تین سو مربع گز کی ایک لڑکھڑاتی حویلی میں اتنے فنونِ تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا ازدحام ہوگا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹھیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں ننگے پیر ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا اب تک یاد ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لیے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر بھی ہو تب بھی یہ ممکن نظر نہیں آتا، تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دولخت بھی نہ ہو۔

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار بلکھن بھی (بلکھن: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا وہ اس کی تصویر قرۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے) جس کا تخم ان کے جدِ اعلیٰ اسمند سیاہ زانو پر سوار کارچوبی جنے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق ان کے پردادا کے ابا جان فرمایا کرتے تھے "بے سر و سامانی کے عالم میں یہ ننگِ خلائق، ننگِ اسلاف، ننگِ وطن، برہنہ سر ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ننگی تلوار ہاتھ میں لیے خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا واردِ ہندوستان ہوا۔" جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیے گھوڑے کی دم کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جائیداد، محلسرا، خدام، مال و متاع، سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرۂ نسب اور بلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا تخم اور شجرہ کے بوجھ سے رانوں سے نکلا پڑ رہا تھا۔

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرہ کے سائے تلے آرام

کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرہ روزگار تھا اور اُن کے شجرہ کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا تھا۔

قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر کھچوایا تھا جہاں ان کا نال گڑا تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر کسی تخم ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا نال کہاں گڑا ہے اور پُرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟ تو وہ "سنی پلانٹ" کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنے نال، پُرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرہ میں اُتر آئیں جیسے گھٹنوں میں پانی اُتر آتا ہے۔

وہ زمانے اور تھے جب بزرگ اصلی امپورٹیڈ یعنی ماوراء النہری نہ ہوں۔ کوئی شخص خود کو عزت دار نہیں سمجھتا تھا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے بار بار اپنا دست افسوس نا فوتہ اسپ پر مارتے اور ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفراللہ، استغفراللہ کہتے تھے۔ تازہ ولایت جس سے ملے۔ اپنے حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔ ع

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہو گئے

پھر یہی لوگ رفتہ رفتہ ع پہلے خاں، پھر خان خاں، پھر خانخاناں ہو گئے

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح ان کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں گال پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ چہرے پر اچھا لگتا تھا۔ کہتے تھے اور نگ زیبی پھوڑا نکلا تھا۔ ساٹھ کے لپیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبس میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی نے اپنے زہر عشق سے مارا مگر خود اسی بیرے والے مارضے میں مرا۔ اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ اکبر سنگرہنی میں انتقال فرمایا، مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض قبلہ کی ناک تک اپنی نہ تھی، یونانی بتاتے تھے۔

(عصری ادب، دہلی، جنوری تا اپریل ۱۹۸۴ء)

منیر احمد شیخ

ایک تھوکا گیا آدمی

جب وہ ایک مدّت کے بعد وطن واپس آیا اور گاڑی سے اُتر کر ویگن میں سوار ہوا تو اس نے ٹکٹ چیکر سے اسلام آباد کا ٹکٹ کاٹنے کو کہا ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ دینے سے پہلے اُونچی آواز میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ڈیڑھ روپیہ۔

ٹکٹ چیکر کی یہ حرکت اُسے ذرا عجیب سی لگی۔ کئی برس پہلے جب اس نے وطن چھوڑا تھا، اس وقت چیکر سواری کی صورت دیکھ کر ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیا کرتے تھے مگر ٹکٹ دینے سے پہلے پیسوں کا اعلان اُسے عجیب سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ٹکٹ چیکر نے اُس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ بھی نہ ڈالی۔ گو بظاہر ولایتی سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ حیثیت کا مالک دکھائی دے رہا تھا۔

پھر جب اس نے دو روپے ٹکٹ چیکر کے ہاتھ میں تھما دیئے تو ٹکٹ چیکر نے بڑی بے اعتنائی سے ٹکٹ کاٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور ریلیز کرتے کی دائیں جانب کر والی جیب کے اندر سے اٹھنی نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھی اور زور سے ایک تھوک ویگن کے فرش پر پھینکی۔ اٹھنی اور تھوک ایک ہی وقت میں ہاتھ اور فرش پر گرے۔

فرش پر گری ہوئی تھوک اُسے اٹھنی لگ رہی تھی جو کسی سواری کی جیب سے وہاں گر گئی ہو اور کسی کی نظر نہ پڑی ہو۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کنڈکٹر نے اٹھنی فرش پر پھینک دی ہے اور تھوک اُس کے ہاتھ پر گرا دی ہے۔ اُسے تھوک سے سخت نفرت تھی اور جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا وہ تھوک اس کے سامنے اس کی نظروں سے چپکی رہی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تھوک اُس کے سامنے پڑی، اُسے وطن آنے پر خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ اس نے جھنجھلا کر باہر کھڑکی میں دیکھنے کی کوشش

کی مگر وہ تھوک اس کے ذہن میں اس طرح چپک گئی تھی کہ اُسے باہر پھیلی ہوئی زمین، ویگن کا فرش دکھائی دے رہی تھی جس پر وہ تھوک اٹھنی کی صورت میں جگہ جگہ پڑی ہوئی تھی۔

یہ پہلی تھوک تھی جو وطن میں قدم رکھتے ہی اُس کے سامنے گری تھی۔ اِس لیے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اکثر ٹکٹ چیکر بدتمیز اور جاہل ہوتے ہیں یہ تھوک اس نے عادتاً پھینک دی ہے اور اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں لیکن جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا اور وہ بس سے نہ اُترا وہ تھوک اُسے بہت پریشان کرتی رہی۔ اور جب اُس نے ویگن سے باہر قدم رکھا تو اُسے ایسا لگا جیسے بس میں اُسے کسی نے گالی دی تھی اور اب وہ دوبارہ ایک پاکیزہ فضا میں آگیا ہے۔

دو چار دن گزر گئے، اُس نے جس جگہ آکر قیام کیا تھا۔ وہاں کا جغرافیہ معلوم کرنے کے لیے اُس نے شام کو سیر کا اِرادہ کیا۔ وہ کپڑے پہن کر اپنے آپ کو اس بستی سے متعارف کرانے کے لیے نکلا جس میں اب اُسے رہنا تھا۔ بستی کی عمارتوں اور راستوں کو جاننا ایسے ہی تھا جیسے وہ اپنے اِردگِرد کی فضا کو اپنے وجود سے آشنا کرانا چاہتا ہے یہ عمارتیں اور راستے اب نہ جانے کتنی دیر کے لیے اس کے جیون ساتھی بننے والے تھے۔

وہ اپنی گلی کا موڑ مڑا۔ اس کے دائیں جانب سرمئی پہاڑ تھے اور خشک سی ہوا چل رہی تھی۔ سرمئی پہاڑوں کی ڈھلوان پر سے سبزا اور تروتازہ خوشبو اس کے نتھنوں کو چھونے لگی اور اُسے ایک خوبصورت لینڈ سکیپ میں اپنے آپ کو پانے پر ایک انجانی سی خوشی ہوئی یہ بستی کس قدر خوبصورت ہے اور پھر یہ کہ اپنے وطن کا حصہ ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے لمبی داڑھی والا ایک مُلّا اور اس کا ایک شاگرد جس کی داڑھی ابھی نئی نئی پھوٹی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ باتوں سے زیادہ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ مُلا اپنے شاگرد کو کوئی سبق دہرا رہا تھا جو اس نے اُسے مدرسہ میں دیا تھا۔ جب وہ دونوں اس کے ذرا قریب آئے تو لمبی داڑھی والے مُلّا نے زور سے کھانسا اور گلے میں سے کرخت آواز کے ساتھ ایک بہت بڑی بلغمی تھوک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سڑک پر پھینکی، وہ ایک دم کانپ سا گیا۔ اُسے یوں لگا کہ مولوی صاحب نے جیسے اُسے دیکھتے ہی ایک پتھر مار دیا ہے اور یہ پتھر سڑک پر نہیں گرا، بلکہ اس کے جسم پر لگا ہے۔ تھوک سے اُسے سخت نفرت تھی مگر ابھی جبکہ وطن کے تازہ خوشبو کے جھونکے کے نشے میں سرشار

ہونے کی کیفیت میں تھا، مولوی صاحب کی اس تھوک نے اسے ہلاکے رکھ دیا۔ وہ تو اپنی بستی سے اپنا تعارف کروانے نکلا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ عمارتوں اور راستوں کو پہچان سکتا اس تھوک نے اُس کے وجود ہی کی نفی کر دی۔ اُسے ایک منٹ کے لیے ایسا لگا جیسے اس راستے کی عمارتوں میں سے تھوکیں گر کر اس کے اُوپر گرنے لگیں ہیں اور وہ ایک ناپسندیدہ آدمی ہے۔ مگر جلد ہی اس نے خیال کو دبا دیا کہ یہ محض ذہن کی اختراع ہے اور اسے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ مولوی صاحب کو ایسے ہی بلغم سی آئی ہو گی اور اُنہوں نے سینے کو ہلکا کرنے کے لیے تھوک دیا، اُسے خواہ مخواہ زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ مگر یہ دوسری تھوک تھی جو وطن واپس آنے کے بعد اس کے حصے میں آئی تھی، اس سے پہلے جب وہ یہاں تھا تو لوگ اس وقت بھی بسوں، گاڑیوں اور سڑکوں پر تھوکتے ہوں گے۔ اس نے کبھی اس کا نوٹس نہ لیا تھا۔ اس کے باوجود کہ تھوکنا اسے بہت بُرا لگتا تھا۔ مگر اب نہ جانے کیوں خود سے اُس نے تھوکوں کی گنتی شروع کر دی تھی۔ اس دوسری تھوک پر اُسے پہلے والی تھوک بھی یاد آ گئی جو ویگن کے فرش پر اٹھنی کی صورت میں گری تھی۔

اب اُس نے اپنے کام پر جانا شروع کر دیا تھا وہ اپنے ساتھ سامان میں ایک کار بھی لایا تھا جو اُسی روز کسٹم والوں سے آزاد ہو کر اُسے ملی تھی۔ اُس نے اُس کی سروس کروائی نہلایا، دھلایا اور خوب چمکا کر اُسے باہر نکالا اور دفتر کو روانہ ہوا۔ یہ بھی بڑی خوش نصیبی اور خدا کی نعمت ہے کہ آپ کے پاس اپنی سواری ہو اور آپ کو بداخلاق ٹیکسی ڈرائیوروں، رکشا والوں اور بس کنڈکٹروں سے نجات دلائے رکھے۔ وہ دل ہی دل میں کلمہ شکر ادا کرنے لگا۔ اتنے میں ایک ٹرک ہارن دیتا ہوا بڑی تیزی میں اس کے برابر سے نکلا اور جب اس نے ٹرک کو راستہ دینے کے لیے اپنی کار کو ایک طرف کیا تو ڈرائیور کی کھڑکی میں سے ایک تھوک اُڑتی ہوئی اُس کی کار کے سامنے والے شیشے پر ٹھک سے آن کر گری اور اس کے چھینٹے دائرے کی شکل میں تھوک کے گرد کرنوں کی طرح پھیل گئے۔ وہ سیٹ پر بیٹھا ایک دم اپنے سر کو پیچھے لے گیا۔ جیسے یہ تھوک اس کے منہ پر گری ہو۔ اگر درمیان میں کار کا شیشہ نہ ہوتا اور کار کے بجائے سڑک پر پیدل چل رہا ہوتا تو یہ اُڑتی ہوئی تھوک اس کے چہرے پر آکر گرتی۔ اس نے جلدی سے کار کے وائپر چلا دیے مگر اب وہ تھوک صاف ہونے کے بجائے شیشے پر پوری پھیل گئی اور وہ شیشہ اندھا ہو گیا۔ اور سامنے کا راستہ بھی اُس کی نظروں کے

سامنے گدلا سا آگیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ گاڑی وہیں کھڑی کر کے پیدل چلنے لگے کیونکہ وہ شیشہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سفید تھوک کی ایک چادر ہے۔ جو اس کے اور باہر کی فضا کے درمیان کھنچ گئی ہے اور اگر اس نے ہاتھ سے اس چادر کو درمیان سے ہٹانا چاہا تو اس کے ہاتھ بھی تھوک میں لتھڑ جائیں گے۔ اس کیفیت میں اس کا جی متلانے لگا وہ سڑک اب بہت دور جا چکا تھا اور اُسے فوراً یاد آ گیا کہ یہ تیسری تھوک ہے جو ایک ہفتے کے اندر اندر اس پر گری ہے۔ اس گنتی پر حیرت ہوئی کہ وہ کیوں تھوک کو گن رہا ہے حالانکہ پھینکنے والے کسی پہ تھوک نہیں رہے ہوتے۔ وہ عادتاً ایسا کرتے ہیں یا کسی اور وجہ سے مگر ان کی نیت یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں پر تھوک رہے ہیں۔ تھوک اُن کی زندگی کا ایسے ہی حصہ ہے، جیسے جنسی فعل۔

ملک اور معاشرے میں تھوکنے پر کوئی پابندی نہیں۔ ہر ایک کو تھوکنے کی پوری آزادی ہے۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر بھی اور باہر بھی۔

اگلے روز وہ مارکیٹ کی طرف شاپنگ کو جا رہا تھا تو ایک چپ چاپ سی سڑک پر گہرے سانولے رنگ کی ایک جوان سی لڑکی چلی آ رہی تھی جس کے کپڑے تو میلے میلے تھے مگر جسم اور چہرہ دونوں پرکشش تھے اس کی چال میں بلا کی جنسی کشش تھی جو راہ گیروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی جب وہ لڑکی اس کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ جمعدارنی ہے اور جوانی کے نشے میں مست و بے خبر ہے۔

جونہی اس کی نظریں اس لڑکی سے چار ہوئیں تو اس نے اس بے پروائی کے عالم میں جس میں کہ وہ چل رہی تھی، تھوک دیا۔ جیسے وہ اپنی طرف ہونے والی توجہ کی تصدیق کر رہی ہو۔ اپنے حسین ہونے کا یہ انداز اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک جوان و خوبرو دوشیزہ اپنی طرف متوجہ ہونے والے کو اپنے وجود کا احساس تھوک پھینک کر دلائے، یہ بڑی عجیب سی بات تھی مگر یہ واقعہ اپنی جگہ تھا کہ ایک جوان عورت کے ہاں جوانی کا احساس اس صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس پر اُس کی سوچ کا چکر پھر سے چلنے لگا کہ کیا یہ تھوک اس عورت کے وجود کی شہادت تھی یا اُس نے اپنی جانب دیکھنے والے کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور جوانی کے نشے میں اس کی نفی کر دی تھی؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ تھوک اگر نفی اور حقارت کا اظہار ہے تو اس میں کونسی ایسی بات تھی کہ اُسے تھوک دیا جاتا۔ اُس نے تو اپنے تئیں ایک مردانے

کے ناتے نظروں ہی نظروں میں اس کے حسن کی داد دینا چاہی تھی۔ مگر جواب میں اُسے ایک تھوک زمین پر گری ہوئی ملی۔ جو کچھ بھی تھا مگر یہ چوتھی تھوک تھی جو اس نے گنی اور پہلی تھوک بھی اسے یاد آگئی۔ اور پہلی مرتبہ اُسے اپنے وجود کے بارے میں شک ہونے لگا کہ کہیں اس کے اندر کوئی ایسی تبدیلی تو نہیں آگئی جو لوگوں کو بے اختیار اُسے دیکھتے ہی تھوک دینے پر مجبور کر دیتی ہے وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ کیا لوگ اب زیادہ تھوکنے لگے ہیں یا محض اُسے ایسا لگ رہا ہے؟ بہر حال کچھ نہ کچھ تبدیلی کہیں ضرور آگئی تھی کہ جس شخص سے اُسے کسی طرح کا واسطہ پڑا تو وہ شخص اُسے دیکھتے ہی تھوک دیتا۔ کہنے کو تو اس نے چار تھوکیں ہی دیکھی تھیں مگر اب اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ تھوک اب اس کا مقدر ہے اور وہ جس شخص کی طرف دیکھے گا تو وہ ضرور تھوکے گا یہ وہم تھا یا کیا بلا تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ سڑک پر چلتے ہوتے وہ اپنے آگے آگے چلنے والے کے بارے میں یہ سوچتا کہ جونہی وہ اس کے برابر ہوگا تو وہ ضرور تھوک دے گا۔ ہمیشہ وہ کسی اجنبی کے بارے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا کہ میرے قریب آرہا ہے تو اجنبی کی تھوک گر جاتی اور اسے یہ لگتا کہ تھوک اسی کے لیے تھی۔ اب اتنی تھوکیں اس کے سامنے گر چکی تھیں کہ اس کی گنتی بھی گڈمڈ ہوگئی اور وہ سینکڑوں تھیں کہ ہزاروں، ایسا لگتا تھا کہ اس کے چاروں طرف تھوکیں ہی تھوکیں ہیں اور وہ ان سے بچ نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ اُسے اسلام آباد سے لاہور جانا پڑا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی ایک بس پہ وہ سوار ہوا اور ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر تین سواریاں بیٹھ سکتی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تاکہ تازہ ہوا کے ساتھ باہر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ جونہی بس اسٹارٹ ہوئی تو اُس کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے جس نے گلے میں منکے ڈالے ہوتے تھے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے کھڑکی کی طرف زور سے تھوکا اور بلند آواز سے سفر کے حفاظت سے گزر جانے کی دُعا مانگی۔ اس کے تھوک کے چھینٹے اس کے چہرے پر گرے اور اس کا جی بیزار ہوگیا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ اس فقیر صورت سائیں کو داڑھی سے پکڑ کے ایک زور کا چانٹا منہ پر لگاتے۔ مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہوگیا کہ ممکن ہے سائیں نے اللہ کو پکارنے سے پہلے اپنے منہ کو آلائشوں سے پاک صاف کرنا چاہا ہو۔ اللہ کا پاک نام لینے سے پہلے گلا اور منہ غلاظتوں سے پاک ہونے چاہیں اور سائیں کی مراد بھی یہی

ہوگی مگر اس تھوک کے کچھ چھینٹے اس کے چہرے پر بھی تو آ کر گرے تھے۔ کیا یہ اس نفی کے چھینٹے تو نہیں تھے جواب یہاں اس کا مقدر ہو گئی تھی۔ اُسے لگا کہ اس نفی میں کچھ حقارت بھی شامل ہے۔ تھوکنے کے فعل میں یہ دونوں عناصر ہوتے ہیں۔

بس ابھی شہر سے نکلی ہی تھی کہ کھلے منظر اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے سائیں کی تھوک کو بھول جانا چاہا اور اپنی نظروں کے سامنے پہاڑی نالوں اور سرسبز وادیوں کے حسن میں کھو گیا۔ ابھی وہ اس کیفیت کا لطف لے ہی رہا تھا کہ اس سیٹ پر بیٹھا ہوا تیسرا آدمی جو کہ ایک وردی میں ملبوس تھا اور سائیں کے برابر بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے ذرا سا اُٹھا اور منہ میں سے ایک نہ وردار تھوک کھڑکی کی طرف لنڈھا دی۔ اس کے چھینٹے کچھ سائیں کے اور کچھ اُس کے چہرے پر گرے۔ سائیں نے تو اپنے چہرے پر دایاں ہاتھ اس طرح پھیرا جیسے دُعا کے بعد پھیرا جاتا ہے اور سیدھا تکنے لگ گیا۔ مگر اس دوسری تھوک نے اس سفر کا لطف کرکرا کر دیا۔ اس نے رومال نکال کر اپنے چہرے کو صاف کیا۔ اور وردی والے کی طرف ایک سخت حقارت کی نظر ڈالی۔ مگر وہ بڑی بے نیازی کے عالم میں اپنی مونچھوں کو مروڑ رہا تھا جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ بالکل بے خبر۔ اس کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر اسے بتلائے کہ ہمسفری کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور ایک سیٹ پر بیٹھنے والے سبھی ایک سے ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے مگر اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اُسے کچھ کہہ سکے۔ وردی والے کے چہرے پہ جو اعتماد تھا اُس سے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے اگر اس کا ذکر کیا گیا تو وہ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ شکر کرو کہ میں نے تمہارے منہ پر نہیں تھوک دیا۔ باہر ہی تھوکا ہے اور تھوکنا نہ گناہ ہے نہ ظلم۔ اس میں غصہ کرنے اور تلملانے کی کونسی بات ہے؟

لاہور تک سارا راستہ وہ داڑھی والا اور وردی والا دونوں وقفہ وقفہ کے بعد برابر تھوکتے رہے اور وہ سارا راستہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا رہا مگر وہ بات جو پہلے محض ایک خدشہ تھی اب یقین میں بدل گئی۔ کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، تھوک سے نہیں بچ سکے گا۔ جب سے وہ واپس آیا تھا سفر میں تھا یا حضر میں اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں تھوکیں ہی تھوکیں تھیں۔ جب وہ گھر میں بستر پر اکیلا لیٹا ہوتا تھا تو اُسے تھو تھو کی آوازیں آنے لگیں۔ جو پہلے آہستہ ہوئیں پھر تیز ہونے لگیں اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا اور تولیے سے

اپنا چہرہ صاف کرنا شروع کر دیتا۔ چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ غسل خانہ میں جا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اُسے لگتا کہ وہ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ مگر نہیں وہ تھوکیں جو باہر سڑکوں پر بسوں اور گاڑیوں میں، دفتروں اور گھروں میں سے اُس کے اُوپر گر رہی تھی ان سے اُس کا چہرہ ہی نہیں روح بھی مسخ ہونے لگی تھی۔

"تم وہ آدمی ہو جسے رد کر دیا گیا ہے۔"

"تمہارا وجود کسی کو قبول نہیں۔"

"تم ایک ناپسندیدہ شخص ہو۔"

"تم ایک ذلیل انسان ہو۔"

"گھٹیا ہو۔"

"چغد ہو۔"

یہ سب تھوکیں تھیں جن کو کبھی وہ رومال سے صاف کرتا، کبھی تولیے سے اور کبھی بازوؤں سے، اسے یقین ہو گیا کہ وہ فرقہ ملامتیہ کا آدمی ہے اور چاروں جانب سے تھوکوں کی بارش ایک لعنت کی شکل میں اس پر آ گری ہے۔ مگر لوگ اُسے دیکھ کر اور اپنے درمیان پا کر کیوں تھوکنے لگ گئے ہ وہ تو پہلے بھی تھوکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ اور ضرورت کے تھوکتے تھے کبھی کسی وجہ اور ضرورت سے بھی۔ گلا صاف کرنے کے لیے بلغم خارج کرنے کے لیے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے، کسی کی تذلیل کرنے کے لیے، نفرت کے اظہار کے لیے، مگر ایسا کیوں ہونے لگا کہ اُدھر کسی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور اُس نے سوچا کہ یہ آدمی کہیں تھوک نہ دے کہ اتنی دیر میں اس نے تھوک دیا۔

اس نے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "تم نہ کسی سے زبان سے کچھ کہتے ہو نہ اشارے سے۔ مگر پھر بھی تھوک دیتے جاتے ہو۔ ادھر بس ذرا سوچ ہی رہے ہوتے ہو تو کھٹ سے ایک تھوک تمہارے سامنے آ گرتی ہے۔ تو کیا یہ تھوک تمہاری سوچ پر گرتی ہے؟"

"مگر سوچ پہ تو میرا اختیار نہیں، بولنے اور اشارہ کرنے پہ تو اختیار ہو سکتا ہے۔"

وہ اپنی سوچ کے ہاتھوں عاجز ہونے لگا۔

اُسے ان لوگوں پر رشک آنے لگا جو سوچ سے عاری کر دیتے گئے ہیں کہ یہ ان کے خالق

"آن پر بڑا کرم ہے وہ تھوکے تو نہیں جاتے رد تو نہیں کئے جاتے۔

"میں اپنی سوچ کے سوتے کیسے بند کروں اس کا کوئی راستہ کوئی طریقہ مجھے نظر نہیں آرہا۔ میں سخت حالت عذاب میں ہوں۔ میری سوچ، میری قبولیت کے راستے میں دیوار بن گئی ہے۔ نہیں دیوار نہیں، دیوار تو گرائی جا سکتی ہے۔ یہ تو میرے لیے لعنت کا ایک طوق بن گئی ہے۔ جو گردن میں پھنس گیا ہے۔ میں رد کر دیا گیا ہوں۔ میں اپنوں میں ناپسندیدہ ہو گیا ہوں۔ میں اس لعنت سے بھاگ کے کہاں جاؤں؟"

"یہ سب لوگ کیوں تھوک رہے ہیں؟ یہ تھوکنے کے بجائے منہ سے کچھ کیوں نہیں کہتے؟ ایسا لگتا ہے کہ الفاظ ان کے منہ کے اندر ہی چپ ہو گئے ہیں اور جب لفظ منہ میں چپ ہو جائیں تو پھر منہ کے اندر صرف لعاب ہی رہ جاتا ہے۔ اب انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے تھوک کے کہہ دیتے ہیں۔ بس جو تھوک رہا ہے، اور کچھ کہہ رہا ہے۔ اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ مگر جب لفظ تھوک میں بدلنے لگ جائیں تو یہ قرب قیامت کی نشانی ہے۔ تھوک کے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ تھوکنے کے فعل کو خوبصورت نہیں بنا سکتا۔ تھوک غلیظ اور گندی شے ہے اور کراہیت پیدا کرتی ہے۔

اسے کوئی راستہ کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا تھا۔ لعنت کے خوفناک سحر نے اُسے جکڑ لیا تھا۔ اس نے گھبراہٹ اور شدید نروس نیس کے عالم میں اس لعنت پر تھوک دینا چاہا، پر جب اس نے تھوکنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ اس کا گلا خوف سے خشک ہو چکا ہے اور منہ میں لعاب نہیں رہا۔ اس نے تھو تھو کی آواز نکالی مگر کوئی تھوک اس کے منہ سے نہ نکلی، نہ جانے کیوں۔ یہ خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا اُسے تھوک سے شدید نفرت تھی، جو کچھ بھی تھا، وہ کوشش کے باوجود نہ تھوک سکا اور خالی تھو تھو کی آواز نکال کر بالآخر چپ ہو گیا اور بستر پر گر گیا۔ نیند میں اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس پر مسلسل تھوکوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور جب وہ بیدار ہوا تو اُسے لگا کہ اس کا سارا بدن تھوکوں سے لتا پڑا ہے وہ جلدی سے غسل خانے کی طرف بھاگا۔ پہلے وہ صرف چہرہ ہی صاف کرتا تھا، اب سارا بدن صاف کرنے لگا۔

(ادب لطیف - لاہور)
(چنگاری دہلی اکتوبر ۱۹۸۴ء)

واجدہ تبسم

مسرد

لگتا تھا نئی نویلی دُلہن سو رہی ہے۔ ہونٹوں پر وہی جان لیوا مسکراہٹ، بالوں میں وہی چمک۔ ماتھے پر وہی گھونگر، جو حسن کی حفاظت کے لیے مامور کئے گئے سنپولوں کے مانند پیچ ڈال کر سدا جھومتے رہتے۔ اور تو اور، موت نے چہرے کی شادابی اور گلابی رنگت تک پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

موت ہوئی بھی تو کیسی، اچھے بھلے دونوں مسکراتے، باتیں کرتے، گاڑی میں اُڑے چلے جا رہے تھے۔ باتیں بھی کتنی خوش گوار اور میٹھی میٹھی، سہانے خوابوں کی تعبیریں دینے والی۔ اکلوتے جوان بیٹے کی شادی کی باتیں۔ پیچھے سے ٹرک نے اس بُری طرح گاڑی کو ہٹ کیا کہ پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ مراد صاحب کو ہی پہلے ہوش آیا۔ لوگوں کے بھیڑ بھڑکے میں سب سے پہلے، بلا کسی شرم لحاظ کے انھوں نے تقریباً چلّا کر پوچھا "میری جان کیسی ہے؟"

جان تو نکل چکی تھی۔ اللہ جانے کیسا دھکا لگا تھا کہ وہ ونڈاسکرین سے ٹکرائیں اور دوسرے ہی لمحے ختم ہو گئیں۔

موت بھی وہ مسکراہٹ نہیں چھین سکی تھی جو مرتے وقت بیٹے کی شادی کی خوشی آنند نے ان کے من موہنے چہرے پر بکھیر دی تھی۔ اور ان کی وہ بے مثال جوانی۔ چالیس سے اُوپر ہو چکی تھیں، لیکن لڑکی جیسی نظر آتیں۔ کسی کسی سراپا پر سے ماہ و سال اس طرح گزر جاتے ہیں کہ اسے چھوتے تک نہیں، اُجاڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خود بہاریں اس سے بہار حاصل کرتی ہیں۔

مراد صاحب ہنس کر کہتے "پلی جو، بھئی کمال آفت چیز ہو تم بھی۔ پتہ ہے کل پارٹی میں بیگ صاحب نے کیا پوچھا؟"

"کیا پوچھا؟" وہ ہنس کر پھول بن جاتیں۔

"کہنے لگے: آپ کی بٹیا کی تعلیم ختم ہوگئی؟ یعنی سبھی کمال ہوگیا! ہم تمہارے ڈیڈی ہوگئے!"

"غضب اللہ کا۔ نکاح ہی توڑ دیں گے کیا آپ؟" وہ ہنس دیتیں۔ نہ گھنگھروؤں میں وہ چھنک تھی، نہ گلاسوں میں وہ کھنک۔ پتہ نہیں کہاں سے چاندی سونے کے گھنگھروؤں اور ٹوٹتے پیالوں کی کھنک کو مِلا جُلا کر اپنے گلے میں لبا لیا تھا کہ ہر ساز بے آبرو تھا۔

کبھی جو اُن کی طبیعت ذرا خراب ہو جاتی مراد صاحب پاگل سے ہو جاتے۔

"اللہ، اب یوں نہ گھبرائیں۔ کوئی مَری نہیں جا رہی ہوں۔"

وہ اُن کے نرم گرم بھرے بھرے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتے۔ "خدا کے لیے چپ رہو، ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ میں تو خدا سے بھی ٹکر لے لوں گا تمہارے لیے۔"

"ارے نعوذ باللہ! توبہ توبہ کیجیے۔ بھلا کوئی خدا سے بھی ٹکر لے سکتا ہے؟"

"میری جان، میرا مطلب سمجھو۔ میں خدا کے آگے اتنا گڑگڑاؤں گا کہ اُسے بھی میری دُعا سننی ہی پڑے گی۔"

لیکن گڑگڑانا کام آیا نہ دُعائیں قبول ہوئیں۔ ساتھ ساتھ دونوں بے ہوش ہوتے۔ خود ہوش میں آتے تو بس پری چہرہ کی لاش ہی دیکھی۔

برسوں پہلے مراد صاحب کے لیے اماں جب لڑکی دیکھ کر لوٹی تھیں تو انھوں نے کہا تھا۔

"دُلہن کا نام ہی پری چہرہ نہیں، واقعی پری چہرہ ہے۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بھی اسی دُنیا کی بسنے والی ہے۔ لیکن جب سمدھن نے نام بتایا تو پھر میں نے سوچا کہ پری ہے نا کوہ قاف سے آئی ہوگی۔ اسی لیے اس دُنیا کی نہیں لگتی۔"

مراد صاحب زور سے ہنس دیتے۔ "اماں، قسم سے آپ تو شاعری کر رہی ہیں۔"

"شاعری وائری میں نہیں کیا کرتی۔ بس اللہ سے میری ایک ہی دُعا تھی کہ جیسا میرے بیٹے کا اُونچا عہدہ ہے، جتنی شان کی اس کی نوکری ہے، بنگلہ ہے، دُلہن بھی اسی لائق ملے، یہ نہیں کہ میاں بی بی کے ساتھ گاڑی سے اُتریں تو ایسا لگے جیسے۔۔۔"

"جیسے لنگور کے ساتھ حور۔" بیٹے نے ماں کی بات اُچک لی۔

"ارے چل موئے۔" وہ پیار سے اُنھیں گلے لگا کر بولیں۔ "میرا بیٹا بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ بس یہ جوڑا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔" اماں کو بیٹے کے کمشنر ہونے کا بڑا ارمان تھا

سے بھی بڑا ارمان تھا کہ بالکل شہزادہ جیسا ہے میرا بیٹا۔
پری چہرہ عشق کے مارے مراد صاحب کے لیے پی چو بن گئیں۔
"ارے آپ یہ کیا کہہ کر بلاتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"
"پی چو، لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف جلیں گے۔ ہے کسی کے پاس ایسا چاند سا چہرہ؟"
اس چاند سے چہرے کو بیٹے کی پیدائش نے کئی چاندوں کی جگمگاہٹ عطا کر دی، ورنہ ہوتا تو یہی ہے کہ بچے لیٹرے ہوتے ہیں، ماں کا حسن لوٹ لے جاتے ہیں۔ اُن کا بیٹا تو حسن کی سوغات لے کر آیا۔ اپنا حسین سراپا لئے جب وہ اس کے پیچھے بھاگتی پھرتیں تو مراد صاحب پیچھے سے جا کر اُن کی لمبی چوٹی کھینچ لیتے۔
"کیا بیٹے کے پیچھے ہمیں بالکل ہی بھلا دو گی، جان؟"
"اللہ، کیسی باتیں کرتے ہیں آپ! آپ تو سچ مچ میرے دل کی مراد ہیں۔ آپ کی برابری دُنیا میں کوئی کر بھی سکتا ہے بھلا؟"
"یہ فرہاد بھی نہیں؟"
"ایسے دس فرہاد ہوں نا" وہ ذرا جھینپ کر رہ گئیں۔
"اچھا، تو اتنے لمبے چوڑے پروگرام ہیں!" وہ ترنگ میں آکر ہنسے۔ "تو پھر چلنے کرے ہیں۔ کچھ تیاری ہو جائے۔"
"چھی! آپ تو بالکل ہی ویسے ہیں۔"
"ارے ہم تو ہمیشہ سے ہی ویسے ہیں اور ہمیشہ ہی ویسے رہیں گے۔ یعنی آپ کے دیوانے آپ کے عاشق۔ آپ کے مجنوں۔ ارے آپ نے ہم سے کبھی کہا ہی نہیں کہ ہمیں آسمان سے ذرا یہ چاند توڑ کر لا دیجئے، ہم ٹیکا لگائیں گے۔ خدا کی قسم ہم پلک جھپکتے میں حاضر کر دیتے۔ یا کبھی آپ ایک ننھی سی فرمائش کرتیں، کہ اللہ تھوڑے سے ستارے اُتار کر لا دیجئے نا، دوپٹے میں ٹانکنے ہیں، تو یہ بندہ فوراً روانہ ہو جاتا۔"
"آپ ۔۔۔" پی چو رُک رُک کر بولیں۔ "کیا واقعی آپ مجھے سدا اتنا ہی چاہتے رہیں گے؟"
"ارے جان، آزما کر دیکھو، آزما کر۔ بس ایک بات کی فکر اور قلق رہ جائے گا جانم کہ ہمارا نام قصے کہانیوں میں نہیں آپائے گا، کیونکہ مجنوں کی طرح ہم نہ کبھی صحرا میں پائے گئے نہ مہیوال کی طرح جنگلوں اور پانیوں میں۔ ہے ہے بس تمہارے دل کی کتاب میں ہی ہمارا نام ہمیشہ مرقوم

رہے گا۔" وہ شرارت سے اس کی ٹھوڑی چھو کر بولے "یہی بہت کافی ہے۔ تمہارے دل میں پہلا نام اور تمہاری آنکھوں میں ہماری صورت۔ پھر دنیا میں اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

پی چھا اپنی کھن کھناتی ہنسی ہنس کر کہتیں "اللہ آپ کے سارے ڈائیلاگس اگر ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں نا تو اچھے خاصے رائٹر بن جائیں آپ۔"

"ارے ہم تو آپ کی یہ چاندسی صورت دیکھتے ہی رائٹر، شاعر، سب ہی کچھ بن گئے تھے۔ ہماری کتابیں یا دیوان نہیں چھپا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جانم۔"

پری چہرہ کو سخت اُلجھن کا سامنا اُس وقت ہوتا جب غیروں کی محفل میں بھی مراد صاحب اپنی عشق بازی کا مظاہرہ کرنے لگتے۔

"کیوں صاحب، اللہ میاں نے ساری دنیا میں ایک بھی صورت ایسی حسین بنائی ہوگی؟ ارے صاحب ہم زندہ کیسے ہیں۔ یہی حیرت ہے۔ حسن کی یہ بجلی گرتے ہی ہم خاک کیسے نہ ہو گئے، بس اسی پر تعجب ہے۔ لیکن شاید اس میں بھی اللہ میاں کی مصلحت ہوگی کہ ایسے حسین اور شاداب باغ کے مالی ہم بنیں۔ جی بھر کے گل چینی کریں اور پھر بھی ترستے رہیں۔ ایسا مدھ بھرا بھرا کا پورا مے خانہ۔ دل بھر کے نظروں کی شراب پیئں۔ اور پھر بھی پیاسے رہیں۔ مگر خدا کی قسم اس تشنگی میں بھی وہ لذت ہے کہ بار بار جینے اور بار بار مرنے کو جی چاہتا ہے۔"

دوست احباب مزے لیتے۔ آخر مراد صاحب کمشنر تھے۔ کچھ عہدے کا رعب، پھر بلا کے حسین، مردانہ وجاہت کے پُتلے۔ شخصیت کا دبدبہ۔ لوگ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ اُن کے حلقۂ احباب میں سب ہی پری چہرہ کو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں بٹھائے رکھتے۔ ایسی قدردانی اور عزت بہت ہی کم بیویوں کو نصیب ہوتی ہوگی۔

بنگلے میں داخل ہوتے ہی مراد صاحب "پی جو۔ پی جو" شروع کر دیتے۔ وہ ہنستی مسکراتی کسی بھی کونے سے سورج بن کر طلوع ہو جاتیں۔

"اللہ آپ کی یہ دیوانگی۔ آہی تو رہی تھی۔ اماں آخر کیا سوچیں گی؟"

وہ سر کھجانے لگتے "ارے بھئی اماں زیادہ سے زیادہ یہی سوچیں گی کہ جوان بیٹا ہے، جوان بہو ہے۔ کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ ہو رہا ہوگا۔"

"ہٹو ہٹو۔"

"آپ کی تو ہر بات بدمعاشی سے شروع ہو کر بدمعاشی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ آخر آپ کو

ہو کیا گیا ہے، مراد؟"

"مراد؟" وہ سینے پر ہاتھ مارتے "ہے ہے، کیا لفظ کہہ دیا۔ مراد! بس ہماری ایک ہی تو مراد ہے پیارم کہ آپ سدا ہمارے پہلو میں رہیں۔"

پی چو تو بہ تِلّا کرنے لگتیں "اتنی ساری سہیلیاں ہیں میری۔ سب ہی اپنے اپنے میاؤں کی بڑی بڑی باتیں سناتی ہیں، لیکن وہ ساری باتیں مل کر بھی آپ کی ایک دن کی باتوں کا عشر عشیر تک نہیں ہو سکتیں۔"

"دیکھو دیکھو، پی چو۔ تم نے پھر گڑبڑ والی باتیں شروع کر دیں۔ اب یہ ننھی سی گلابی گلابی، نگ جڑی خوبصورت سی ناک چڑھا کر 'عشر عشیر' کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہیں صاحب، آپ نہیں مانیں گی۔ اب سیدھے سیدھے چلی چلئے بیڈ روم میں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

وہ لاکھ دُہائیاں دیتیں، لیکن ہوتا وہی جو مراد صاحب چاہتے۔ عید بقر عید پر، کسی شادی بیاہ کے موقع پر وہ سج دھج کر کام میں مشغول ہیں۔ بس کسی نہ کسی کام کے بہانے مراد صاحب گھسے چلے آ رہے ہیں اندر۔ بے کل سے بے چین بے چین سے۔ خواہ مخواہ کوئی ضروری کام نکال لاتے۔

"ارے پی چو۔۔۔"

"یہ جب دیکھو تب پی چو، پی چو کیا لگا رکھی ہے آپ نے؟ آپ تو بھلے پپیہا ہوتے اور پی کہاں پی کہاں چلاتے پھرتے۔"

"اس وقت بھی تو پی کہاں پی کہاں کر رہا ہوں، جانم۔ یہ بتاؤ میری اتنی ضروری فائل کہاں رکھ دی؟"

"میں نے؟" وہ ذرا غصّے سے کہتیں "میں نے آپ کی فائل رکھی؟ ارے اپنی اٹیچی یا بریف کیس دیکھئے نا!" پھر بھی بے چاری ڈھونڈنے جاتیں۔ اور مراد صاحب پیچھے سے آ کر انھیں باہوں میں بھر لیتے۔

"اتنی اچھی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے یہ؟ اچھا تم نے لگائی ہے شاید۔ بھئی دماغ خراب کر دیتی ہو انسان کا۔ آخر اتنے سارے مہمان گھر میں بھرے پڑے ہیں۔ اب میں یوں کرے میں قید ہو جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ کیسا زن مُرید ہے!" وہ پری چہرہ کو باتوں میں لگا کر سیدھے لے چوڑے بیڈ پر لے آتے۔

پری چہرہ اُلجھتیں "کیسا تیز مُعد ہے مراد۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"بس یہی ذرا سی شرارت۔ اور پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ ارے بارے حوّا کو اللہ میاں نے آخر آدم کی پسلی سے کیوں نکالا تھا؟ سارا مزا کرکرا کر دیتی ہو بیچ بیچ کے۔"

دراصل سارا مزہ ہی انھیں اس میں آتا تھا کہ وہ بیچ بیچ کے رہتی تھیں۔ وہ عورت ہی کیا جو مرد کا اشارہ پاکر آجاتے اور لبنر کی طرح بچھ جاتے۔ مرد کو ترسانے والی عورت ہی رانی بن کر راج کرتی ہے، ورنہ مرد کی تو فطرت ہی اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ فوراً ہاتھ آنے والی عورت کو باندی بنا لیتا ہے۔ مرد کو جھکانے والی، اس سے معافیاں منگوانے والی، اپنے سامنے ناک رگڑوانے والی عورت ہی عورت کہلاتی ہے اور سر اُونچا کر کے جیتی ہے۔

جوانی بھر یہی چو سر اُونچا کر کے جیا کیں۔ میاں سدا بھونرا بنے اُن کے گرد چکر لگاتے رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بی چو کی جوانی کبھی اس راستے سے گزری ہی نہیں جس پر چل کر بڑھاپے کی دہلیز آتی ہے۔ بات بات پر ادا ادا پر نہارنے اور سراہنے والا میاں ہو تو عورت ویسے بھی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ تو ذرا سا درنے جوانی میں قدم رکھا اور نوکر چاکر آنے جانے والے سب ہی انھیں 'بیگم صاحب' جیسے معزز لفظ سے نوازنے لگے تو پری چہرہ کو احساس ہوا کہ میں اب لڑکی سے عورت بن گئی ہوں، ورنہ مراد صاحب کے وہی چو چلے تھے اور وہی مستیاں۔

"اللہ کے لیے مراد۔۔۔ آخر آپ ہیں کیا؟ برابر میں ہی فرہاد کا کمرہ ہے۔"

"اچھا اچھا، فرہاد کا کمرہ برابر میں ہے۔ تو آپ ایسا کریں کہ اپنی یہ چغل خور چوڑیاں اُتار دیں۔ بجتی ہیں کم بخت تو بجے ہی چلی جاتی ہیں۔"

"یہ بات نہیں مراد۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں، صبح ہی صبح گیلے بالوں سے اس عمر میں بہت شرم آتی ہے مجھے۔"

دوسرے دن میڈان جاپان ہیئر ڈرائر سنگھار میز پر رکھا ہوا انھیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

"یہ بتایئے، آپ مجھے اتنا چاہتے کیوں ہیں؟ میں سمجھتی تھی، چلو جوانی کے دن ہیں، ندی پر طغیانی آئی ہو گی۔ آپ تو ابھی ویسے ہی سر پھرے ہیں۔ آخر آپ کو میرے پاس آتے ہی ہو کیا جاتا ہے؟" وہ مسکرائیں۔ "اب تو سنبھل جایئے۔ چالیس سے اُوپر کی ہو رہی ہوں میں۔"

"یہ آپ کو چیزیں رکھ رکھ کے بھول جانے کی بہت بُری عادت ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے بیس سال کدھر رکھ دیئے؟ ہمیں تو بس بیس ہی نظر آ رہے ہیں۔ اور جب ہمیں بیس نظر آ رہے ہیں

تو وہی صحیح ہوں گے۔ سمجھیں آپ؟"

مراد صاحب کے دل کی کلی تو اس وقت کِھلی جب ان کے بھتیجے کے لیے دُلہن دیکھنے، پری چہرہ، امّاں بی، بھابی جان اور کچھ دوسری خواتین لڑکی کے گھر گئیں۔ وہاں ان سب نے تو لڑکی پسند کر لی، لیکن لڑکی کے ماموں نے، جو کنوارے تھے، انھوں نے بے حد خوشامد کی کہ "لڑکے والوں کی طرف سے وہ جو بے حد خوبصورت، لمبے بالوں والی لڑکی بھی آئی ہے اُسے ہمارا پیغام پیش کر دیجیے پلیز۔۔۔"

اس بات کا وہ چرچا ہوا کہ پری چہرہ اپنے آپ میں شرما شرما جاتیں۔ چہرہ گلاب ہو جاتا، اور مراد صاحب اپنی جگہ اکڑ اکڑ کر کہتے "دیکھا جانم؟ ہم نہیں کہتے تھے کہ تم بالکل ٹین ایجر ہو۔ دیکھنا یار، کہیں سچ مچ پیغام قبول نہ کر لینا۔ کیوں پیارم، ہمیں چھوڑ کر چلی تو نہیں جاؤ گی نا؟"

"توبہ! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ کم سے کم فرہاد کا تو خیال کر لیا کیجیے۔ کالج جاتا ہے جوان ہو گیا ہے۔ کتنی دفعہ تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ آپ کی ان حرکتوں کو کیا وہ سمجھتا نہیں ہو گا؟"

"ارے سمجھا کرے، جان۔ کیا وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہی سب کچھ نہیں کرے گا۔ ہم تھوڑی اُسے منع کرنے جائیں گے۔" وہ شرابی کی سنک کی طرح گھوم پھر کر ایک ہی بات پر آجاتے "تو جانم آپ وہ ماموں کا پیغام قبول کر کے ہمیں چھوڑ کر چلی تو نہیں جائیں گی نا۔ آں؟"

اور وہ واقعی چلی گئیں۔ ایسی جگہ جہاں جا کر پھر آج تک کوئی واپس نہیں لوٹا۔

مراد صاحب پاگل ہو کر رہ گئے۔

بہت بڑا حلقۂ احباب تھا۔ تعزیت کرنے والوں اور پُرسہ دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ انھیں سر پٹختا دیکھتے اور دل مسوس لیتے۔ حواس پہ جانے کس طرح پی چھائی ہوئی تھیں کہ نیند کی گولیاں بھی اثر نہ کرتیں۔ ڈاکٹر بے حد پریشان اور حیران تھے۔ چھ چھ گولیاں کھلانے کے باوجود وہ جاگتے، روتے، تڑپتے اور سر پٹختے رہتے۔ انجکشن لگانے کے لیے ڈاکٹر قریب آتے تو روک کر عجیب درد بھرے لہجے میں کہتے:

"ڈاکٹر، نیند کے انجکشن دے کر چاہتے ہو میں اُسے بھول جاؤں؟ زندگی بھر جسے یاد رکھا اور صرف اُسے ہی یاد رکھا، تو کیا ایک نیند کا انجکشن لے لینے سے میں اس کی یاد بھول جاؤں گا؟ نہیں ڈاکٹر نہیں۔ نیند کا انجکشن نہیں، اب صرف موت ہی اُسے میرے دل سے ہٹا

سکے گی۔ اور موت بھی کیوں؟ ہمیں کیا پتہ مرنے کے بعد کیا کیا احساسات ہوتے ہوں گے۔ ممکن ہے مرنے کے بعد میں اُسے زیادہ یاد کروں کیونکہ میں نے اُس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو چاہا ہے۔ ممکن ہے وہاں روح سے روح۔۔۔"

ڈاکٹر، جو دوست بھی تھے، مجبور ہو کر ہٹ جاتے۔

تعزیت کرنے والوں میں دہلی سے پری چہرہ کی دوست نجمہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ اُن ہی کی بیٹی نثر سے فرہاد کی بات چیت چل رہی تھی۔ نجمہ ویسے بھی کئی بار آتی جاتی رہتی تھیں۔ پری چہرہ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ کی کھیلی پڑھی بڑھی تھیں۔ دونوں کے ایک ایک ہی اولاد تھی۔ نجمہ کا خیال تھا کہ ماؤں سے جس طرح بیٹیوں کو ورثے میں مزاج، عادات، اطوار، خوش مزاجی، بد مزاجی ملتی ہے اُسی طرح باپوں سے بیٹوں کو ان کی ہر ادا، عادت اور مزاج ملنا لازمی ہے۔ وہ شروع سے دیکھتی آرہی تھیں کہ مراد صاحب کس قدر ٹوٹ کر پری چہرہ کو چاہتے ہیں۔ اُنھیں یقین تھا کہ فرہاد بھی اپنی ہونے والی دُلہن کا یوں ہی پروانہ رہے گا۔ اور جب خود پری چہرہ نے رشتے کی بات چھیڑی تو انھیں بیٹھے بٹھائے جنت مل گئی۔ دونوں کے دل خوشیوں اور ارمانوں سے کیسے لبریز تھے۔ نجمہ پر تو پری چہرہ کی موت کی خبر سنتے ہی بجلی گر پڑی۔ بس یہ ہوا کہ وہ خاک اور راکھ نہ بن پائیں، لیکن مردے سے بدتر حالت میں تھیں۔

نثر پہلی بار ساتھ آئی تھی۔

یوں تو موت کا گھر تھا، لیکن نثر کی آمد، اس کے وجود اور اس کی آواز نے جیسے ماحول کو ایک دم زندگی دے دی۔ بلا کا حسن پایا تھا۔

"پلیز نثر، تم پاپا کو فورس کر کے کچھ کھلا دو۔ پتہ نہیں ان بے چاروں کا کیا ہوگا؟"

"میں کیسے کھلاؤں فرہاد۔۔۔؟ وہ تو سر تک نہیں اُٹھاتے۔" وہ غم اور ڈر سے ملی جلی کیفیت کے ساتھ بولی۔

"تو آنٹی سے ہی کھلوا دو۔"

"لیکن کیسے فرہاد۔ کمشنر صاحب مانیں تب نا۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"کمشنر صاحب؟" فرہاد حیرت سے بولا۔ "تم پاپا کو کمشنر صاحب کہتی ہو؟"

وہ ذرا شرمندہ سی ہو کر بولی۔ "یہ بات نہیں فرہاد۔ اصل میں ممی انھیں ہمیشہ کمشنر صاحب کہتے ہیں نا، تو ہمارے ہاں سب یہی کہنے لگے۔ میں تو یہاں پہلی بار آئی ہوں نا۔ تمہیں بُرا لگا ہو تو

سوری "

"اینی دسے، میرے پاپا کا مطلب ہے تمہارے پاپا۔جاؤ، اب انھیں کھانا کھلا دو، یا کم سے کم چائے بسکٹ۔ بی اے گڈ گرل "

اُن کا دھواں دھواں چہرہ، سوجی سوجی آنکھیں، اُلجھے اُلجھے بال اور سراپا پر برستی ویرانیاں دیکھ کر ثمر کا دل دُکھ سے بھر گیا۔چائے کی ٹرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھامے وہ دھیرے سے بولی "کمشنر صاحب"

پھر ایک دم اُس نے ڈر کر، پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔سوچا: فرہاد نے سنا ہوگا تو پھر بُرا مانے گا۔کیا کروں زبان پر تو یہی چڑھا ہوا ہے"

اتنے دن میں آج پہلی بار مراد صاحب نے سر اُٹھا کر دیکھا۔کچھ نامانوس سی آواز تھی۔وہ اجنبی نظروں سے اُسے دیکھتے رہے۔ثمر ڈر سی گئی۔

"آپ پلیز کچھ کھا لیں، کمشنر صاحب" اچانک وہ اٹک گئی" مم... میں ثمر ہوں"

"ثمر؟" مراد صاحب نے زیرِ لب دہرایا" ثمر... ثمرِ بہشت... جنت کا میوہ" انہوں نے اپنا سر زور سے جھٹکا۔کیا یہ بات اُن کے اپنے دل نے سوچی تھی؟ اسی لمحے انہیں پری چہرہ کی میت والا دن یاد آیا، جب وہ سر پٹخ پٹخ کر رو رہے تھے۔پورچ میں بکھری ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کسی سے پوچھا تھا" یہ کون اتنا تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے؟"

"اے ہے، یہی تو بیگم صاحبہ کے میاں ہیں"

"بے چارے بالکل ہی جوان ہیں"

"تو بیگم صاحبہ خود بھی تو لڑکی جیسی لگتی تھیں"

"مگر ان کو تو کوئی بھی اپنی بیٹی دینے کو راضی ہو جائے۔ایسے جوان خوبصورت ہیں"

"بس کرو اللہ کے لیے۔موت کا گھر دیکھو اور شادی بیاہ کی باتیں دیکھو"

مراد صاحب کی نظر دوسری بار اُٹھی تو آئینے پر جا پڑی۔تیسری بار ثمر پر ٹھہری۔چوتھی بار اٹھی تو آئینے پر پڑی۔خود پر ٹھہری رہی۔اور پانچویں بار اُن کی نظر ثمر پر پڑی تو پھر اُٹھی نہیں۔

"اماں!" مراد صاحب نے دھیرے سے پکارا۔

مراد صاحب کی ماں اور پری چہرہ میں ساس بہو والے تعلقات قطعی نہیں تھے، بالکل سگی ماں بیٹی والے تعلقات تھے۔آنے جانے والے تو یہی سمجھتے کہ مراد صاحب کی ساس بیٹی داماد کے

پاس رہتی ہیں۔ پھر جب پتہ چلتا کہ نہیں، ساس بہو ہیں تو یقین کرنے کو جی نہ چاہتا۔

امّاں بہو کے، جو بیٹی سے بڑھ کر تھی، غم میں نڈھال سی پڑی تھیں۔

"امّاں!"

دوسری بار مراد صاحب کے پکارنے پر امّاں کے کمزور وجود میں ذراسی ہلچل ہوئی اور وہ کراہتے ہوتے دھیرے دھیرے اٹھ بیٹھیں۔

بیٹے کو پاس پاکر خوشی کی ایک لہر سی بھی آئی اور رونا بھی ٹوٹ کر آیا۔ کیسا ہنستا بولتا پرندوں کا سا جوڑا تھا۔ ایک اُڑ گیا۔ ایک اداس، تنہا رہ گیا۔ اکیلا۔ اکیلا۔

"دُنیا اِسی کا نام ہے بیٹا۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔ بڑی خوش نصیب تھی میری بیٹی جو میاں کے کندھے سوار ہو کر جنت کو سدھاری۔ مگر میرے بچے" وہ بغیر آنسوؤں والا رونا رونے لگیں۔ بڑھاپے میں خون پانی سب ہی سوکھ جاتے ہیں۔ آنسو کہاں سے اُتریں؟

"امّاں" وہ ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود ماں کو دلاسہ دینے کے انداز میں بولے۔

"وہ بات نہیں امّاں"

"تیری طبیعت ٹھیک نہیں بیٹے۔ سونا بھی تو نہیں تو۔ ایک انجکشن لگوالے۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا بیٹے۔ جینا تو پڑتا ہی ہے۔ اب یہ عمر جینے کی تھی بیٹا؟"

"امّاں" مراد صاحب نے ماں کے کندھے کو ذرا مضبوطی سے پکڑا اور ایک ساتھ کہتے گئے۔

"زیاد کی تو ابھی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ پھر ابھی اس کی شادی کی عمر بھی نہیں ہے، اتنی جلد میں اس کے کندھوں پر ذمّہ داری کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ نجمہ ایک دو دن میں دہلی چلی جائیں گی۔ اُن کی روانگی سے پہلے آپ میرے لیے ثمر کو مانگ لیں"

آج پری چہرہ کی موت کو بیسواں دن تھا۔

(شمع نئی دھلی ستمبر ۱۹۸۴ء)

هرچرن چاولہ

سوال

آج ماتاجی کا خط ملنے کے بعد میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا، کدھر جاؤں، کیوں کہ اس دوراہے سے کوئی تیسرا راستہ پھوٹتا ہی نہیں۔ مگر آج میں اپنے دونوں بزرگوں، باپ بابو کیول رام چاولہ اور باپ جیسے چاچا بھگت ہیرانند سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے غلط راہ پر کیوں ڈالا۔ ہم تو سُنتے آئے ہیں کہ ہمارے بزرگ بہت سیانے اور عقل مند ہوتے تھے اور وہ سینکڑوں سال آگے کی بھی سوچ لیا کرتے تھے۔ پھر میرے سمجھ دار اور پڑھے لکھے پتا اور دھرم گرنتھوں کو رگ رگ میں بسائے ہوئے بزرگ چاچا کو پچاس پچپن سال آگے کی تصویر کیوں دکھائی نہ دی؟ کیا اُن کی ذہنی اُڑان اتنی مختصر تھی کہ وہ اتنے تھوڑے عرصہ بعد آنے والے اُس وقت کی پہچان بھی نہ کر سکے جب بھائی، بھائی سے خوف کھانے لگے گا؟ وہ دونوں آج اس دُنیا میں نہیں ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب دے سکیں، مگر دُنیا بزرگوں اور داناؤں سے خالی تو نہیں ہوگئی ہے۔ میں آج کے سیانوں سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ آج میں پون سے اور پون مجھ سے خوف کھانے لگا ہے۔

سیانے کہتے ہیں، بچپن کی سب یادیں لاشعور کے ایک کونے میں محفوظ پڑی رہتی ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میرے والد تبادلے کے بعد داؤ خیل جنکشن آتے تھے تو انہوں نے داؤ خیل گاؤں میں بھگت ہیرانند کے گھر کا ایک حصہ کرائے پر لیا تھا اور اسی روز سے انہوں نے بھگت جی کو اپنا چھوٹا بھائی کہنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ اُن کے سگے بھائیوں کو اُن سے یہ غلط قسم کی شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بھگت ہیرانند کو ان پانچوں بڑے بھائیوں سے زیادہ پیار کرنے لگے تھے۔ بھگت ہیرانند چھوٹی سی دوکان تو برائے نام سانس کی ڈوری قائم رکھنے کے لیے چلاتے تھے، ورنہ ان کا ایک ایک سانس گوربانی گانے اور گرنتھ صاحب پڑھتے رہنے

میں گزرتا تھا۔ بھگت کی اپنی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھ کو ہی اپنے بیٹے کی طرح ہر وقت گود میں لیے لیے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ گرنتھ صاحب کے پیچھے بیٹھے پاٹھ کر رہے ہوتے تو بھی میں اُن کی گود میں ہوتا اور اُن کا ایک ہاتھ مورچھل مقدس کتاب پر جھلتا رہتا، اور دوسرا پیار سے میرے جسم کا طواف کرتا رہتا۔ گوربانی پڑھتے ہوتے ان کی سفید ہلکی ہلکی ترشی ہوئی ڈاڑھی ہلتی ہوئی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں، بچہ پیار کا بھوکا ہوتا ہے اور پیار مجھے جتنا ان سے ملتا تھا شاید ہی بابو جی اور ماتا جی سے ملتا ہوگا۔ ماں باپ نے میرا نام ہرچرن داس رکھا تھا۔ اور بھگت چاچا خود سکھ نہ ہوتے ہوتے بھی نہ جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے مجھے ہرچرن سنگھ کے نام سے بلایا کرتے تھے مگر ساتھ ہی کبھی کبھی جب میرے بال بڑھ کر میری آنکھوں میں گرنا شروع ہو جاتے تھے تو خود ہی قینچی لے کر اُنھیں تراش دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

بابو جی جتنے پڑھے لکھے، سمجھ دار اور باشعور تھے۔ بھگت چاچا بھی اتنے ہی گیانی دھیانی اور انسان دوست تھے۔ اس وقت ان کی زیادہ تر باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں تھیں، مگر ایسا ضرور لگتا تھا جیسے وہ میرے ننھے کانوں میں شہد آگیں رس ٹپکا رہے ہوں۔ اُن کا منہ ہی منہ میں گوربانی پڑھنا تو میرا دل موہ لیتا تھا۔ مٹھاس کا مزہ صرف زبان سے نہیں، کانوں سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلے پہل علم مجھے اُس کی گوربانی سن کر ہوا تھا۔ اور میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہ جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے سامنے گوربانی کے اشلوک اور کبیر کے دوہے پڑھتے تھے تو لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔

بابو جی ہنومان اور کرشن کے بھگت تھے۔ انہوں نے گھر میں الماری کے ایک خانے میں ہنومان، کرشن اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجا رکھی تھیں اور بڑی باقاعدگی سے ہر روز اُن کے سامنے کھڑے ہو کر اُن کی استتی کرتے تھے۔ بھگت چاچا سے میل جول بڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے چھوٹے سے مندر میں دوسری سب مورتیوں کے ساتھ بابا نانک کی تصویر اور خواجہ دل محمد کی منظوم گیتا کے ساتھ خواجہ صاحب کی جپ جی اور سکھ منی صاحب بھی رکھ لی تھی اور وہ دونوں کتابوں کا ایک ساتھ پاٹھ بھی کرنے لگے تھے۔

چاچا کے ایک بہت بڑے کمرے کی دھرم سال میں، جہاں ایک خوبصورت تخت پوش پر ریشمی بستے میں لپٹا بڑا سا گرنتھ صاحب رکھا رہتا تھا اور جہاں صبح سویرے بھگت جی

صاف اُستری چٹائیوں پر بیٹھ کر چاچا کا پاٹھ سنا کرتے تھے۔ اسی دھرم سال میں ہر شام کو "ہرے رام ہرے رام، رام رام ہرے ہرے۔ ہرے کرشن ہرے کرشن، کرشن کرشن ہرے ہرے" اور "اوم جے جگدیش ہرے" کی آرتیاں بھی گائی جانے لگی تھیں۔ جہاں پہلے دھرم سال میں اکثر چاچا کے ہاتھوں کڑا پرشاد گاؤں کے سرے پر موٹی موٹی چوٹیوں والے ہندو مگر ذہنی طور پر ہر لحاظ سے سکھ حاضرین میں بٹتا رہتا تھا، وہاں اب ریوڑیوں کی صورت میں ہر منگل کو ہنومان کا پرشاد بھی بٹنے لگا تھا۔ منگل کی شام کو ریوڑیوں کے پرشاد کے لالچ میں چاچا کی دھرم سال میں بچوں کی اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملتی اور چھوٹے بڑے اتنی اُونچی آواز سے۔۔۔

مہابیر بلوان، کرتا سب کا کلیان
مانگو بھگتی کا دان، دیجئے آن آن

گاتے کہ سارا گاؤں گونج اُٹھتا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، جتنا پیار اور خلوص مجھے چاچا سے ملا، اپنے ماں باپ سے بھی نہ مل سکا، میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ماں باپ کی محبت سے محروم رہا ہوں۔ نہیں، ایسا کہہ کر میں گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے اپنے تمام فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیئے۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ ہاں، اپنے لیے اُن کی اور چاچا کی محبت کا موازنہ کرتا ہوں تو چاچا کا پلڑا کچھ زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔

وقت کے بے رحم اور ظالم ہاتھوں نے ہم سے چاچا کو چھین لیا اور اُتھل پتھل کے کچھ ہی عرصہ بعد بابو جی بھی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ اب گھر میں ماتا جی، میں اور بابو جی کی موت کے ڈیڑھ ماہ بعد جنم لینے والا میرا چھوٹا بھائی پون رہ گئے۔ پون تو ہنومان کے پتا کا نام ہے اور لکشمی وشنو کی استری ہیں، پھر پتہ نہیں ہماری لکشمی نام کی ماتا جی نے اس کا نام پون رکھنا کیوں پسند کیا، حالانکہ وہ خود بڑے کٹر سکھ وچاروں کی ہیں۔ پون سے بہت بڑا ہونے کی وجہ سے میں، بابو جی اور چاچا کی گود میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا ہوں، مگر پون شروع سے ہی ماتا جی کے قریب رہا ہے اور ماتا جی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایک ایسے خاندان کی فرد ہیں جس کے آدھے لوگ سکھ اور آدھے ہندو وچاروں کے ہیں، یعنی ہماری نانی سکھ اور نانا ہندو تھے۔ اسی لیے جب شادی کے بعد ماتا جی چاولہ خاندان میں آئی تھیں تو جہیز میں سکھ سے

انہیں ایک خوبصورت سے ریشمی رومال میں بندھا ہوا گرو گرنتھ صاحب بھی ملا تھا جب کہ اسی گھر سے اُن کی بڑی بہن کو جہیز میں بھگوت گیتا دی گئی تھی۔

صبح سویرے دہی بلوتے ہوئے اور گھر کا دوسرا کام کاج کرتے ہوئے ماتا جی منہ ہی منہ میں پاٹھ تو پہلے بھی کیا کرتی تھیں، مگر بابو جی کے مرنے کے بعد اُنہوں نے ان کی مورتیوں کے ساتھ بابا نانک اور گرو تیغ بہادر کی تصویریں بھی رکھ لی تھیں۔ فرصت زیادہ رہنے کی وجہ سے وہ صبح سویرے پون کو گود میں لیے گوردوارے بھی باقاعدگی سے جانے لگی تھیں اور شام کو رہراس تو بڑی پابندی سے پڑھنے لگی تھیں۔ بابو جی کا سایہ سر پر نہ ہونے اور میری نوکری میں مصروفیت کے باعث پون ماں اور باپ دونوں کا پیار اُن ہی کی گود سے حاصل کرنے کی خاطر ہر دم ان سے لپٹا رہنے لگا تھا۔ برّصغیر کی تقسیم کے بعد شروع شروع میں ہم امرتسر میں پناہ گزیں ہوتے تھے۔ وہاں ماتا جی ہر روز پون کو گود میں لیے پاٹھ تو کیا ہی کرتی تھیں، ہفتہ میں دو بار رکشا میں اس کے ساتھ ہرمندر صاحب بھی جایا کرتی تھیں۔ ویسے پیار تو پون کو میں اور میری بیوی پورنیما بھی کم نہیں دیتے تھے، مگر ہمارے پیار کا بھلا ماں کے پیار سے کیا مقابلہ؟

کئی سال بعد سروس کے سلسلے میں میرا تبادلہ ہوا تو ہم سب دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی میں بھی ماتا جی بڑی پابندی سے ارداس کرنے گوردوارہ جایا کرتی تھیں۔ بیانہ سے بڑے ماما جی جب کبھی ہم سے ملنے یا اپنے کپڑے کے بیوپار کے سلسلے میں دہلی آتے اور ہمارے ہاں ٹھہرتے تو سب سے پہلے ہم سب کو لے کر گوردوارہ سیس گنج ماتھا ٹیکنے جاتے۔ ماتا جی ہر روز قریب کے گوردوارے جاتے وقت ہاتھ میں آٹے سے بھری ایک کٹوری لے جاتی تھیں جس پر تھوڑا سا گھی اور گڑ کی ایک ڈلی بھی رکھی رہتی تھی، جسے وہ ماتھا ٹیکتے ہوئے بابا جی کے چرن کملوں میں ارپن کر آیا کرتی تھیں۔ مگر ایک دن ان کے رویّہ سے مجھے عجیب سا جھٹکا محسوس ہوا۔ اس روز زندگی میں پہلی بار وہ بھری ہوئی کٹوری گوردوارے سے واپس لے آئی تھیں اور میرے پوچھنے پر میری کم پڑھی لکھی ماں نے کہا تھا "میں تو وہاں من کی شانتی کے لیے جاتی ہوں، مگر آج جب میں نے وہاں ہری کیرتن کے بجائے سیاست پر لیکچر ہوتے سنا تو میرے من نے کہا یہاں تو کسی اور قسم کا پودا لگایا جا رہا ہے، جس کی جڑوں میں پانی ڈالنا میری آتما نے گوارہ نہیں کیا اور میں اپنا پانی واپس لے آئی۔ میں نہیں کہتی کہ سیاست بری چیز ہے، مگر ہر چیز کا اپنا ایک الگ پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔"

انہوں نے اپنے آنٹے اور گھی کو انکسار کی وجہ سے سادہ پانی کہا تھا مگر پھر بھی ان کا یہ رویہ مجھے عجیب سا ہی محسوس ہوتا رہا۔ تاہم انہوں نے کسی بات کی پروا کئے بغیر اپنا زیادہ وقت اب اپنے گھر کے چھوٹے سے مندر جو گوردوارے کی نذر کرنا شروع کر دیا۔ اسی درمیان ہمارے پڑوس میں ایک سکھ فیملی بھی آ کر آباد ہو گئی۔ یہ بہت ہی نیک طینت اور خدا ترس لوگ تھے۔ انہوں نے گھر میں ایک پورا کمرہ سجا سنوار کر گورو گرنتھ صاحب کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اب ماتا جی روز صبح سویرے نہا دھو کر وہاں جانے اور واک لینے لگیں۔ وہ ہر گورپرب پر اپنے گھر سے کڑاہ پرشاد بھی بنا کر ساتھ لے جاتیں اور بڑی شردھا سے سنگتوں میں اپنے ہاتھوں سے بانٹتیں۔ اسی دوران ہمارے ماما جی کا ایک لڑکا باقاعدہ پانچوں ککّے دھار کے سکھ بھی ہو گیا تھا، مگر اس کے اور اس کے باقی تین بھائیوں کے پیار کی مثال بیانہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح دی جاتی تھی۔ وہ جب اپنی دُکان کے کام کے سلسلے میں ہمارے گھر آتا تو اپنی خوبصورت ڈاڑھی مونچھ اور پگڑی باندھنے کے دلکش انداز کے ساتھ ہمیں اور خاص طور پر پون کو کوئی آسمانی مخلوق لگتا۔ ادھر ماں کے سنسکاروں کی وجہ سے بھی آہستہ آہستہ اس کے دل میں سکھی دھرم سے ایک خاص احترام پیدا ہو رہا تھا۔ بہت پہلے جب اُسے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا تو ماتا جی اُسے خاص طور پر نہلا دُھلا اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کر گوردوارے لے گئی تھیں۔ اس کے بعد تو وہ خود اسکول میں ہر امتحان کے وقت پہلے گوردوارے ضرور حاضری دینے لگا تھا اور گورو مہاراج کی ایسی مہر ہوتی گئی کہ وہ ہر امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا گیا۔

حالات مجھے ناروے لے آئے اور بہت صبر آزما جدوجہد کے بعد میں یہاں انڈیا کی نسبت کہیں زیادہ مادی خوش حالی کے ساتھ بس گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پون بی ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ کرے اور انڈیا میں ہی کسی اچھے روزگار سے لگ جاتے، تاکہ ہم دونوں میں سے ایک تو کم از کم ماں کا سہارا بنا رہے۔ لیکن فارن کا سراب وہ جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ خود میں نے اِدھر بڑے بڑے ڈگری یافتہ لوگوں کو فرش صاف کرتے اور برتن دھوتے دیکھا ہے۔ مگر لاکھ بتاتے رہو، شور مچاتے رہو، سمجھاتے رہو، کون سنتا ہے؟ کم از کم وہاں بیٹھے بیٹھے تو کوئی بھی ہماری رائے پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتا جب تک خود آ کر اس دلدل میں پھنس کر نہ دیکھ لے۔ پھر دلدلوں نے کبھی کسی کو چھوڑا ہے؟

اُدھر پون کا میلان پڑھائی کی طرف کم اور مذہب کی طرف زیادہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ

رات کو بارہ بجے سبھی سوتا تو سردی ہو یا گرمی صبح کو تین ساڑھے تین بجے اُٹھ کر اور نہا دھو کر شاہ جی کے گوردوارے جا کر باقاعدہ گوربانی کا کیرتن سننے لگا تھا۔ وہ اس پر بھی بس نہ کرتا، بلکہ کالج جانے سے پہلے کی تمام تیاریوں تک کیسٹ لگا کر گوربانی کا جاپ سنے جاتا۔ وقت بچانے کے لیے اس نے شیو کرنا بند کر دیا تھا۔ دراصل یہ اس کے سکھ دھرم کی طرف جھکاؤ کا پہلا زبردست اظہار تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے شیونگ سیٹ کو ایک فضول سی چیز کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا۔

ماتا جی چاہتی تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کام سے لگے تو وہ ایک سُندر سی بہو گھر میں لے آئیں مگر پون کی انتہائیں تو سنیاسیوں جیسی ہوتی جا رہی تھیں۔ بھلا کون ماں پسند کرے گی کہ اس کا بیٹا اتنی چھوٹی عمر میں جوگ کی طرف مائل ہونے لگ جائے۔ مجبوراً انھوں نے اس کی دوسری زبردست خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُسے میرے پاس بھیجنا مناسب سمجھا اور میں نے بھی ان حالات میں اپنی نصیحتوں کے تمام ٹوکرے ایک طرف دھر دیئے اور اُسے اپنے پاس ناروے بلا لیا۔

ناروے آ کر اس نے فوکلے ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ نارویجین زبان سیکھی، اور پھر ڈپلوما اِن سوشل ہیلتھ حاصل کر کے نرسنگ کورس شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ اس کا دھرم سے عشق پھر جاگنے لگا اور وہی بہت سویرے اُٹھ اُٹھ کر گوربانی کے کیسٹ سننے لگا ہم دونوں کے پردیس میں بس جانے کی وجہ سے ماتا جی شدید تنہائی محسوس کرنے لگی تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ پون انڈیا واپس پہنچ جائے۔ خود میری بھی یہی تمنا تھی اور پون بھی اس شرط پر واپس جانے پر رضامند تھا کہ ماتا جی دہلی کا مکان بیچ کر پنجاب منتقل ہو جائیں۔

مگر اب ماتا جی نے لکھا ہے کہ میں اُسے واپس نہ بھیجوں اور اسے بھی ناروے ہی میں بسانے کی کوشش کروں۔ اور میں آج کل کے تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچوں میں ڈوبا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کچھ ایسے حالات بھی اپنے دامن میں لائیں گے کہ پون اپنے باپ جیسے بزرگ اور شفیق بڑے بھائی سے ڈرتا پھرے گا اور میں اپنے پیارے پیارے چھوٹے بھائی کو شک کی نظروں سے دیکھوں گا۔ اُسے رات دو تین بجے اٹھ کر کچن کی ٹونٹی سے ٹھنڈا اور تازہ پانی نکال کر پینے کی عادت ہے۔ وہ جب بھی رات کو پانی پینے کے لیے اٹھتا ہے، میں اس کے پاؤں کی چاپ سے جاگ جاتا ہوں اور اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی بتی جلا لیتا ہوں،

اور جب تک وہ کچن میں رہتا ہے، میں رضائی میں کسمساتا رہتا ہوں، جیسے میں اُسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں سویا ہوا نہیں، جاگ رہا ہوں۔ اور جب کبھی کسی کام سے میں اس کے قریب جاتا ہوں تو خود اس کی آنکھوں میں بھی کسی خوف کی پرچھائیاں مجھے صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

(شمع، نئی دھلی، دسمبر ۱۹۸۴ء)

احتشام اختر

اگرچہ مکاں وہی ہے مگر وہ مکاں نہیں
رونق تھی جس سے گھر کی وہ جانِ جہاں نہیں

مرجھاؤں گا میں خود ہی تمنا کے دشت میں
ٹھہرا ہوا میں آب ہوں آبِ رواں نہیں

مسمار ہو گئے ہیں حبابوں کے گھر یہاں
تاریکیوں کے شہر میں کوئی مکاں نہیں

کیسے چمک رہے ہیں تمنا کے بام و در
یہ آتشِ وصال ہے اس میں دھواں نہیں

بجھنے لگی ہیں رونقیں شہرِ نگار کی
بازارِ حسن میں کوئی دل کی دکاں نہیں

جلنے لگے گی یاد تو گھٹنے لگے گا دم
وہ کون سی ہے آگ کہ جس میں دھواں نہیں

مہتاب کی ضیا سے منور ہوا ہے دل
یہ وہ مکاں ہے جس کا کوئی سائباں نہیں

دامن میں اپنے سیم و گہر پاتے آب دار
دل کے عوض یہ اشکِ محبت گراں نہیں

(بیسویں صدی نئی دہلی جولائی ۱۹۸۴ء)

[redacted]
محبتوں کا شجر بے ثمر نہیں ہوتا
پھر اس کے بعد کئی لوگ مل کے بچھڑے ہیں
کسی جدائی کا دل پر اثر نہیں ہوتا
ہر ایک شخص کی اپنی ہی ایک منزل ہے
کوئی کسی کا یہاں ہمسفر نہیں ہوتا
یہ اور بات ہے وہ اپنا حالِ دل نہ کہے
کوئی بھی شخص یہاں بے خبر نہیں ہوتا
تمام عمر گزر جاتی ہے کسی پل میں
مگر تو ایک ہی لمحہ بسر نہیں ہوتا
عجیب لوگ ہیں یہ اہلِ عشق بھی اختر
کہ دل تو ہوتا ہے پر ان کا سر نہیں ہوتا

اختر امان

(کتاب نما نئی دہلی اگست ۱۹۸۵ء)

اپنے جوشِ جنوں کی حقیقت یہ تھی، چند قطرے تھے خوں کے اُچھلتے رہے
کربِ تکلیف یا وہ آنسو جو ہم پی گئے، بن کے نشتر رگوں میں مچلتے رہے
عرش سے رحمتوں کا نزول! اور یہاں خلق سوزِ جہنم سے جلتی رہی
چاند کرنیں زمیں پر بچھاتا رہا، بطنِ گیتی میں انگارے پلتے رہے
ہم فقیروں نے دُنیا سے جو کچھ لیا، کم تو کیا کچھ زیادہ ہی لوٹا دیا
زہر پیتے رہے مُسکراتے رہے، زخم کھاتے رہے لعل اُگلتے رہے
وہ جو اک ناوکِ زہر افشاں کبھی کھو گیا تھا کسی ناوک انداز کا
مدتوں میرے اشکوں کے سیلاب میں اُس کے پیکاں کے ریزے نکلتے رہے
اس کشاکش میں عمر اپنی اچھی کٹی، زیست کی بھی ہوس اک مزہ دے گئی
کشتِ امید پر اوس پڑتی رہی، نخلِ غم پھولتے اور پھلتے رہے
جیسے برحق بہاروں کی گل پاشیاں، یوں ہی جلتے ہوئے گلستاں بھی بجا
پھول کھلنے کے عادی تھے کھلتے رہے، فرض جلنا تھا جن کا وہ جلتے رہے
کائناتی فضاؤں کی آبادیاں بہر تقریبِ حق رات دن پَر فشاں
اور ہم اس طلسمِ شب و روز کے مبتذل شعبدے سے بہلتے رہے
یہ زمیں لمحہ بھر سے سوا جانِ من! اپنے سینے پہ ٹکنے نہ دے گی تمہیں
ہم بھی کیا جم سکے تم بھی کیا جم سکے، صرف گرتے رہے اور سنبھلتے رہے
استقامت ملی جس کو سب سے سوا، وہ ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا
گردشِ بخت اپنی مسلسل رہی، دورِ ایام پیہم بدلتے رہے
ہم بھی اخترؔ تہی دستِ قسمت سہی، کچھ تو پاتے رہے بہرۂ عیش بھی
جوئے کیف و طرب خشک ہوتی رہی، فکرِ رعنا کے سوتے ابلتے رہے

اختر انصاری دہلوی

(ماہنامہ اسلوب کراچی جولائی ۱۹۸۵ء)

اسرار زیدی

مصروف ہم بھی انجمن آرائیوں میں تھے
گھر جل رہا تھا، لوگ تماشائیوں میں تھے

کتنی جراحتیں پسِ احساس درد تھیں
کتنے ہی زخم روح کی گہرائیوں میں تھے

کچھ خواب تھے جو ایک سے منظر کا عکس تھے
کچھ شعبدے بھی اس کی مسیحائیوں میں تھے

پتی زمیں پہ اُڑتے بگولوں کا رقص تھا
سات آسمان قہر کی پروائیوں میں تھے

اس طرح خیر و شر میں کبھی رن پڑا نہ تھا
کتنے ہی حادثے مری پسپائیوں میں تھے

خلقت پہ سادگی کا میں الزام کیوں دھروں
جتنے تزلزل تھے، مری دانائیوں میں تھے

آشوبِ ذات سے نکل آیا تھا اک جہاں
ہم قید اپنی قافیہ پیمائیوں میں تھے

(شاعر، بمبئی ۱۹۸۴ء)

اعجاز اعظمی

صاف گوئی میں میاں حد سے گزر جاؤ گے کیا
سنگ ساماں آئینہ خانوں سے ٹکراؤ گے کیا

مصلحت اندیشیوں نے مسخ کر ڈالا جسے
دیکھ کر اپنا وہ چہرہ ڈر نہیں جاؤ گے کیا

تم غبار وں میں جلاتے ہو تشخص کا چراغ
سوچ مستحسن سہی پر ایسا کر پاؤ گے کیا

کب تلک پھرتے رہو گے اس پرائے دیس میں
زندگی کی شام آئی گھر نہیں جاؤ گے کیا

پردۂ حرف و صدا کی آڑ میں اعجاز تم
جو نہ کہنا چاہیے اب وہ بھی کہہ جاؤ گے کیا

(بیسویں صدی، نئی دہلی نومبر ۱۹۸۴)

آغا سائل کاشمیری

عجیب خوبیاں کچھ میرے ہم نشیں میں ہیں
سخن میں پھول ہیں اور سانپ آستیں میں ہیں
جو کفر کہتا ہے باتیں، وہ دیں نہیں کہتا
جز اس کے کیا ہیں مسائل، جو کفر و دیں میں ہیں
یہ فیض خاص ہے یارو مرے زمانے کا
ہزار رنگ کی سوچیں، دلِ حزیں میں ہیں
کوئی بھی وقت ہو ہرگز نہ مطمئن رہنا
کہ جن کا نام ہے صیاد، وہ مکیں میں ہیں
وہ لوگ وقت نے جن کو بنا دیا کیا کیا
وہ لوگ، اب بھی مرے جیب و آستیں میں ہیں
زمیں کو اپنے نہ پاؤں تلے کی چیز سمجھ
نہ جانے کتنے خزانے تہِ زمیں میں ہیں
رضائے دوست سے انکار ہی نہیں ہے فقط
نمودِ ذات کے پہلو بھی کچھ "نہیں" میں ہیں
وہ عیب جُو تو ہے لیکن ہنر شناس نہیں
یہی وہ عیب ہیں جو میرے نکتہ چیں میں ہیں
ہر ایک واہمہ بھی اک سراب ہوتا ہے
گماں کی صورتیں، آئینۂ یقیں میں ہیں
جہانِ دل میں، ترے غم کی بادشاہی ہے
رموزِ کارِ جہاں، تاج اور نگیں میں ہیں
وہ شعر بھی ہو کیا جس میں تو نہیں رہتا
مکاں کی جتنی بھی ہیں خوبیاں مکیں میں ہیں
ہر ایک سمت مسلسل اگر ہے جبر تو کیا
کہ انقلاب میری فکرِ آتشیں میں ہیں
مٹا کے اپنی وہ پہچان، خوار ہوتا ہے
وگرنہ عظمتیں، انسان کی جبیں میں ہیں
کہاں زمانے کو حاصل وہ رفعتیں سائل
وہ رفعتیں کہ جو درویش رہ نشیں میں ہیں

(شاعر، بمبئی نومبر ۱۹۸۴)

امیر قزلباش

ہمارے روبرو گر آئینہ ہو
بڑی شرمندگی کا سامنا ہو

نظر آؤں نیا ہر بار اس کو
وہ جب دیکھے مجھے حیرت زدہ ہو

میاں ہم کو بھی اُس کی جستجو ہے
مگر کب تک تلاشِ گمشدہ ہو

بُری حالت ہے خط پڑھنے سے پہلے
جو آیا اس نے جانے کیا لکھا ہو

(شاعر، بمبئی ۱۹۸۴)

چمکتی آنکھ میں صحرا دکھائی صاف دیتا ہے
مرے لہجے میں سناٹا سنائی صاف دیتا ہے

میں اک اسرارِ ماتم، لاکھ خود میں گم ہوا جاؤں
مگر سینہ کسی شے کی دُہائی صاف دیتا ہے

وہ کیا کیا بات کرتا ہے نہ پل بھر بھی بچھڑنے کی
مگر لہجہ، کہ احساسِ جُدائی صاف دیتا ہے

صفیں یوں تو مقابل دشمنوں کی ہیں مگر اُن میں
عجب اِک مہرباں چہرہ دکھائی صاف دیتا ہے

میں آ پہنچا ہوں اے باقؔی عجب اندھی جگہ مانا
ہے اب بھی ایک رستہ جو سجھائی صاف دیتا ہے

باقؔی

(آج کل نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۵ء)

بشیر بدر

اداسی کا یہ پتھر آنسوؤں سے نم نہیں ہوتا
ہزاروں جگنوؤں سے بھی اندھیرا کم نہیں ہوتا

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا

بچھڑتے وقت کوئی بدگمانی دل میں آجاتی
اُسے بھی غم نہیں ہوتا مجھے بھی غم نہیں ہوتا

یہ آنسو ہیں انہیں پھولوں میں شبنم کی طرح رکھنا
غزل احساس ہے احساس کا ماتم نہیں ہوتا

(آج کل نئی دہلی ستمبر ۸۴ء)

جذبی

منزل اگر نئی ہے تو بیتابیاں بھی ہیں
راہوں کے پیچ و خم بھی ہیں گہرائیاں بھی ہیں

اک گوشۂ حیات میں محفل کی شورشیں
اک گوشۂ حیات میں تنہائیاں بھی ہیں

سمجھے تو کوئی گریۂ بے اختیار کو
اس آبجوئے درد میں گہرائیاں بھی ہیں

کیا کہیے کیا نہ کہیے کہ اُس بزمِ ناز میں
دلداریوں کے ساتھ دل آزاریاں بھی ہیں

ملتے نہیں ہیں پھر بھی خریدارِ جنسِ درد
مانا کہ جنسِ درد کی ارزانیاں بھی ہیں

کچھ فرطِ غم نے راہ دکھائی ہے سوئے مے
کچھ محتسب کی ضد میں یہ میخواریاں بھی ہیں

(آج کل نئی دہلی نومبر ۸۹ء)

حسن نعیم

نقوشِ پا جو سنوارے گا اک نظر دے گا
مگر جو راہ نکالے گا رہ گزر دے گا

اسی اصول پہ قائم ہوں میں بھی دنیا میں
جو راہِ خلق میں اٹھے گا، اپنا سر دے گا

میں اس کے جسم کی خوبی سے گرچہ واقف ہوں
مجھے تھی فکر وہ کب دل میں اپنے گھر دے گا

اسی گمان میں آنکھیں لگی نہیں برسوں
کوئی ستارہ مجھے تحفۂ سحر دے گا

وہ شاہ نقد بھی دیکھے گا اوجِ فن میرا
یہ انتظام بھی کوئی حریف کر دے گا

یہ جامِ حرف جسے اپنا خون دینا تھا
اسی امید میں خالی رہا وہ بھر دے گا

خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
مجھی کو آ کے مرے عیب کی خبر دے گا

(آہنگ گیا۔ مارچ ۱۹۸۴)

حفیظ بنارسی

پیاس کا اِک دشت زیرِ آسماں رہ جائے گا
خود سمندر ایک دن تشنہ وہاں رہ جائے گا

دل پہ داغِ التفاتِ دوستاں رہ جائے گا
زخم تو بھر جائے گا لیکن نشاں رہ جائے گا

ہم کو اپنی نارسائی یاد آئے گی بہت
راستے میں جب کسی کا کارواں رہ جائے گا

تم مِٹا کر بھی مجھے رہ جاؤ گے بے ننگ و نام
ذکر میرا داستاں در داستاں رہ جائے گا

بے یقینی کو اگر ملتا رہا یوں ہی فروغ
آدمی زندانیٔ وہم و گماں رہ جائے گا

بجھتے بجھتے ایک دن سارے دیئے بجھ جائیں گے
اک گھٹن رہ جائے گی اک دھواں رہ جائے گا

بجلیوں سے جس میں ٹکرانے کا ہوگا حوصلہ
اب چمن میں صرف اسی کا آشیاں رہ جائے گا

دوست میرے دور سے دیکھیں گے یہ منظر حفیظ
جسم میرا قاتلوں کے درمیاں رہ جائے گا

(آواز نئی دہلی نومبر ۱۹۸۴)

جمیل الدین عالی

جھلمل جھلمل جگمگ جگمگ خواب سہانے جاتے ہیں
جانے پہچانے آئے تھے اور ان جانے جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہم سے بہت مایوس ہوئے
جیسے پہلے ہم وہ نہیں تھے جو اب مانے جاتے ہیں
ہاں اس پاپ نگر میں سب آتے ہیں لیکن فرق یہ ہے
لوگ تو چھپ کر چل دیتے ہیں ہم پہچانے جاتے ہیں
اے مستقبل اے مستقبل آخر تو کب آئے گا
کتنے زمانے آتے ہیں اور کتنے زمانے جاتے ہیں
ساری مقدس تحریروں میں پریم لگن کی کرنیں ہیں
ہائے وہ ہم جو ان کرنوں سے آگ لگانے جاتے ہیں
خواہش کچھ حاصل کرنا ہے پیار بھی کچھ دے دینا
یہ لکھا اور جانے کیوں ان کو بھی سنانے جاتے ہیں
تھک گئیں ذہن کی روشنیاں اب وہ راہیں دکھلا جن میں
کتنے چاند اور کتنے سورج تیرے بہانے جاتے ہیں
ان سے نہ پوچھو ہم بتلائیں عالی جی کا حال تمھیں
سیر چمن کر آئے ہیں اور خاک اڑانے جاتے ہیں

(گلدستہ دہلی ۱۹۸۵)

حسن رضوی

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
ہمیں پھر بھی گماں ہے وہ ہمیں سے پیار کرتا ہے
میں اُس کے کس ستم کی سرخیاں اخبار
وہ ظالم ہے مگر ہر ظلم سے انکار کر
منڈیروں سے کوئی مانوس سی آواز آتی ہے
کوئی تو یاد ہم کو بھی پسِ دیوار کرتا ہے
ہمیں یہ دکھ کہ وہ اکثر کسی موسم نہیں
مگر ملنے کا وعدہ ہم سے وہ ہر بار کر
حسن راتوں کو جب سب لوگ میٹھی نیند سوتے ہیں
تو اک خواب آشنا چہرہ ہمیں بیدار کرتا ہے

(گلدستہ دہلی ۱۹۸۵)

حیات وارثی

حسن زندگی میں ہے عزم کی روانی سے
راستے نہیں بنتے پُرسکون پانی سے

گھر اُجاڑنے والے کاش سوچتے یہ بھی
گھر بساتے جاتے ہیں کتنی جانفشانی سے

میں گھرا ہوں دانتوں میں اک زباں کی صورت
اپنی صاف گوئی سے اپنی حق بیانی سے

پردۂ یقیں میں رکھ آئینہ محبت کا
عکس ماند پڑتے ہیں گردِ بدگمانی سے

ہم مزاج اُردو ہیں، ہم یقین کرلیں گے
جھوٹ بولیے لیکن بولیے روانی سے

اب انہیں یہ شکوہ ہے ہم زباں نہیں کوئی
پہلے مطمئن تھے جو میری بے زبانی سے

(روبی، نئی دہلی جولائی ۱۹۸۴)

راج کھیتی

خوف، تنہائی، بے صدا جنگل
دل کو دہلا گیا گھنا جنگل

وحشتیں ناچتی ہیں شہروں میں
کٹ گیا کیا ہرا بھرا جنگل

روح میں کوئی پھڑپھڑاتا ہے
راہ روکے ہے جسم کا جنگل

اب اُجالے نظر نہیں آتے
کن اندھیروں میں گھر گیا جنگل

جب سے چھوڑا ہے ساتھ سایوں نے
کتنا سنسان ہو گیا جنگل

راجؔ شہروں میں جی نہیں لگتا
دے رہا ہے مجھے صدا جنگل

(آج کل نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۴ء)

اپنے کشکول میں سورج ہے کہ خالی ٹھہرے
دیکھ! اے تیرہ شبی ہم ترے والی ٹھہرے
ہر نیا نقش کہ مانگے ہے دھنک رنگ دھواں
بن لئے پیکر جو سناشے ستھے، دہالی ٹھہرے
ہر شجر شاخ پہ پھل پھول تھے کڑوے بدرنگ
ہر ثمر شاخ سے ہم روگ سوالی ٹھہرے
آنکھ میں نشّہ مسلسل نئے آفاق کا ہے
کیا قیامت کہ ہمیں دامنِ خالی ٹھہرے
میں نے دیکھی ہے دبے پاؤں سحر آتی ہوئی
مرگ آثار عناصر بھی زوالی ٹھہرے
آنکھ جگ مگ سی ارزنے ہوئے لبگال شفق
کیسے کہہ دوں کہ یہ اصنام خیالی ٹھہرے
رازؔ کس شے کی مہک چار طرف پھیل گئی
ہاں، مہک شاخِ ہنر کی ہے، مثالی ٹھہرے

راج نرائن رازؔ

(آج کل نئی دہلی دسمبر ۱۹۸۵ء)

زخم کھاتے کہاں کہاں دیکھو
راہ میں خون کے نشاں دیکھو
جن کے دل میں غرورِ منزل تھا
لٹ چکے ہیں وہ کارواں دیکھو
جو متاعِ چمن تھے وہ راہی
بن گئے گردِ کارواں دیکھو
ٹوٹ کر ہم بکھر گئے لیکن
حوصلے ہیں ابھی جواں دیکھو
اپنے چہروں کی پائمالی کا
غیر کی آنکھ سے سماں دیکھو
کیا سے کیا ہو گئے بدن کے خطوط
جسم کی مرگِ ناگہاں دیکھو
ہل رہا ہے ہوا کے جھونکے سے
یہ شجر ہے کہ بادباں دیکھو
سائے ہی سائے آ رہے ہیں نظر
در و دیوار ہیں کہاں دیکھو
ہم سے مت پوچھو حالِ محرومی
دل سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھو
چھا رہی ہے رضاؔ گلستاں پر
غیر محتاط آندھیاں دیکھو

رضا ہمدانی

(ماہنامہ اسلوب کراچی اکتوبر ۱۹۸۵ء)

رئیس امروہوی

صبحِ نو ا ہم تو ترے ساتھ نمایاں ہوں گے
اور ہوں گے جو ہلاکِ شبِ ہجراں ہوں گے
صدقہ زیست کے شکوے نہ کر اے جانِ رئیس
بخدا یہ نہ ترے درد کا درماں ہوں گے
میری وحشت میں ابھی اور ترقی ہوگی
تیرے گیسو تو ابھی اور پریشاں ہوں گے
آزماتے گا بہر حال ہمیں جبرِ حیات
ہم ابھی اور اسیرِ غمِ دوراں ہوں گے
عاشقی اور مراحل سے ابھی گزرے گی
امتحاں اور محبت کے مری جاں ہوں گے
قلبِ پاکیزہ نہاد و دلِ صافی دے کر
آئینہ ہم کو بنایا ہے تو حیراں ہوں گے
شاخِ افسردۂ اُمید کو پامال نہ کر
کہ نئے پھول اسی شاخ پہ خنداں ہوں گے
صدقہ تیرگیِ شب سے گلہ سنج نہ ہو
کہ نئے چاند اسی شب سے فروزاں ہوں گے
خواب ہو جائے گا یہ عالمِ اندوہِ فراق
حسرتِ وصل نہیں وصل کے ساماں ہوں گے
آج ہے جبر و تشدد کی حکومت ہم پر
کل ہمیں بیخ کنِ قیصر و خاقاں ہوں گے
وہ کہ اوہام و خرافات کے ہیں صیدِ زبوں
آخر اس دامِ غلامی سے گریزاں ہوں گے
صرف تاریخ کی رفتار بدل جائے گی
نئی تاریخ کے وارث یہی انساں ہوں گے

(پاکیزہ انٹرنیشنل۔ ٹورنٹو)

نقشِ تصویر نہ وہ سنگ کا پیکر کوئی
اس کو جب دیکھو بدل جاتا ہے منظر کوئی
کششِ حرفِ تبسم ہے لبوں میں روپوش
گوشۂ چشم سے ہنستا ہے ستمگر کوئی
چڑھتے دریا سا وہ پیکر وہ گھٹا سے گیسو
راستہ دیکھ رہا ہے مرا منظر کوئی
جرعۂ آخر ہے کہ گراں خوابیِ شب
چاند سا ڈوب رہا ہے مرے اندر کوئی
صدفِ بحر سے نکلی ہے ابھی لیلیِ شب
اپنی مٹھی میں چھپائے ہوئے گوہر کوئی
کھو گیا پھر کہیں افلاک کی پنہائی میں
دیر تک چمکا کیا ٹوٹا ہوا پر کوئی
صفِ اعداء ہے مرے سامنے اور پشت پہ ہیں
نہ فرشتے نہ ابابیلوں کا لشکر کوئی
ٹوٹ کر گرتی ہے اُوپر مرے چٹان کہ ہے
بیعتِ سنگ مرے دستِ ہنر پر کوئی
رات بھر طاقتِ پرواز اُگاتی ہے اُنھیں
کاٹ دیتا ہے سحر کو مرے شہپر کوئی
میرے قاتل نے بڑھا دی مرے سر کی توقیر
اس صلہ کے لیے موزوں تھا پیمبر کوئی
آج اس قریۂ ویراں میں یہ آہٹ کیسی
دل کے اندر ہے کوئی اور نہ باہر کوئی
کسی جھاڑی سے کرن پھوٹی ہے سورج کی کہ جیسا
چمک اٹھا ہے کسی ہاتھ میں خنجر کوئی

ذیب غوری

(آج کل، نئی دہلی فروری ۱۹۸۵ء)

سلیم احمد

دل کے اندر درد، آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزوِ زندگی بن جائیے

اک پتنگے نے یہ مجھ سے رقص آخر میں کہا!
روشنی کے ساتھ رہیے، روشنی بن جائیے

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جائیے

جس طرح دریا بجھا سکتا نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جائیے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے
اب ذرا نیچے اُتریے آدمی بن جائیے

جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالمِ امکاں میں اک ایسی کمی بن جائیے

عالمِ کثرت نہاں ہے اِس اِکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجے اور کئی بن جائیے

(شب خون الٰہ آباد ۱۹۸۴)

کتنا خوش فہم تھا وہ ڈوب کے مرنے والا
نقش پانی پہ نہیں کوئی ٹھہرنے والا

اب وحی کوئی زمیں پر نہیں آنے والی
اب صحیفہ بھی نہیں کوئی اُترنے والا

سخت بھی ہوگا یہ اندازہ کِسے تھا پہلے
لفظ کی چوٹ سے اِس درجہ بکھرنے والا

کن اندھیروں میں مجھے چھوڑ گیا ہے تنہا
میری آنکھوں میں دھنک بن کے سنورنے والا

پھر کوئی نظم رگ و پے میں سمانے والی
پھر کوئی شعر دل و جاں میں اُترنے والا

نیند کے لطف سے محروم ہیں آنکھیں میری
نقشِ رنگیں نہیں یادوں سے گزرنے والا

عہدِ حاضر کا یہی سب سے بڑا سچ ہے خمار
جیت جاتا ہے اصولوں سے مکرنے والا

سلیمان خمار

(کتاب نما، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۵ء)

سوھن راہی

نگہِ ویراں میں بہاروں ہی کا منظر رکھنا
تشنہ ہونٹوں کے بھی صحراؤں سمندر رکھنا

کھو نہ دینا کہیں تہذیبِ محبت کا ہنر
ہے خزاؤں میں کٹھن دِل سا گُلِ تر رکھنا

جو مرے لمحوں کی تخلیق کا جادو تو ہے
رنگِ شفقت کو مرے حرف میں حاضر رکھنا

تو بہاروں میں مری گم ہے جو خوشبو جیسا
میرے اشعار میں زندہ مرا پیکر رکھنا

دھوپ چھاؤں سے ہے تحریر ہر اک لمحے کی
شوقِ منزل میں ہی قدموں کو مقرر رکھنا

(شاعر بمبئی ۱۹۸۴)

شاہین

اور اک چہرہ پسِ چہرہ نمایاں کیوں نہ ہو
آدمی اس بھیڑ میں اپنا نگہباں کیوں نہ ہو

میں تو اپنی ہی ملامت سے نہیں فارغ کبھی
عیب دُنیا کا مری آنکھوں سے پنہاں کیوں نہ ہو

تو نے تو اعزاز دے ڈالا مگر یہ جبر کیا
میرے ہاتھوں میں مرا اپنا گریباں کیوں نہ ہو

بیشتر جذبے گرفتِ لفظ میں آتے نہیں
میری آنکھیں تیرا چہرہ جزوِ پیماں کیوں نہ ہو

جب ہوا دہلیز پر رکھ جاتے پھولوں کے خطوط
شہرِ ناپرساں میں دل کا بوجھ آساں کیوں نہ ہو

کیسے کیسے معتبر دل خوں ہوئے اس کے سبب
سُرخیِ اخبار سے خلقت پریشاں کیوں نہ ہو

ساحلوں پر بھی وہی دُنیا ہے جو بستی میں تھی
ساحلوں پر دُکھ ہی دُکھ بکھرے ہیں طوفاں کیوں نہ ہو

زندگی اک شے بسر کرنے کی ہے سو کیجئے
زندگی بے تجزیہ ہے صرفِ جاناں کیوں نہ ہو

میری گستاخی مری حد کا تعین کر گئی
اتنے احساں ہیں ترے اک اور احساں کیوں نہ ہو

بے نشانی میں بھی کتنے بولتے ہنستے نقوش
چھوڑ آیا ہوں کہ دُنیا خود پشیماں کیوں نہ ہو

میری رسوائی تو وابستہ تری شہرت سے ہے
تیری شہرت بھی سرِ دیوار چسپاں کیوں نہ ہو

چاندنی میں روپ یادوں کا سنور جاتا ہے اور
شب ڈھلے شاہینؔ گھر کتنا ہی ویراں کیوں نہ ہو

(چنگاری، دہلی شمارہ ۲۴-۱۹۸۴)

شمیم طارق

دل کی دھڑکن کو تمنا کی سہیلی کہیے
رسم دنیا ہے کہ دنیا کو پہیلی کہیے

ہم قدم، دوست، مرے ساتھ کی کھیلی کہیے
گردشِ وقت کو بچپن کی سہیلی کہیے

اس پہ بے روح لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کرۂ ارض کو بیوہ کی ہتھیلی کہیے

دل کی سنسان سی بستی میں انا کی آہٹ
ایک جوگن کو سرِ شام اکیلی کہیے

عشوۂ دوست، غمِ زیست، سنگِ جاں کی چبھن
ایسی کتنی ہی مصیبت مری جھیلی کہیے

روح پر گردِ کثافت ہو تو پھر روح کہاں؟
روح خوشبو ہے اسے بوئے چمیلی کہیے

بسترِ مرگ ہو یا کوچۂ قاتل طارق
آنکھ لگ جائے جہاں اس کو حویلی کہیے

(مریخ پٹنہ، اگست ۸۴ء)

ضیا جالندھری

آنکھوں میں نہاں ہے جو مناجات وہ تم ہو
جس سمت سفر میں ہے مری ذات وہ تم ہو

جو سامنے ہوتا ہے کوئی اور ہے شاید
جو دل میں ہے اک خوابِ ملاقات وہ تم ہو

دن آئے گئے جیسے سرائے میں مسافر
ٹھہری رہی آنکھوں میں جو اک رات وہ تم ہو

دُکھ حد سے جو گزرا تو کھلا دل پہ کہ یوں بھی
در پردہ ہے جو مجھ سے مدارات وہ تم ہو

دل جوئی کے انداز بھی نرمی بھی وہی ہے
سینے پہ ہُوا رکھتی ہے جو ہات وہ تم ہو

ہاں مجھ پہ ستم بھی ہیں بہت وقت کے لیکن
کچھ وقت کی ہیں مجھ پہ عنایات وہ تم ہو

(گلدستہ دہلی ۱۹۸۵ء)

ظفر اقبال

خدائی خوار پھریں قدرتِ خدا دیکھیں
خطا کریں نہ کریں ہم مگر سزا دیکھیں

عمل کو چھوڑیئے اتنی بھی اب نہیں توفیق
کہ اہلِ شہر کوئی خواب بھی نیا دیکھیں

نئے سفر میں ٹکٹ ایک ہے تماشے دو
کہ زندگی کریں اور موت کا مزا دیکھیں

ہمیشہ دوسروں کے حرف گیر رہتے ہیں
بجائے اس کے کہ اپنا بھلا برا دیکھیں

ہماری در بدری ناپسند ہے اُن کو
مگر وہ اپنے بھی حالات کو ذرا دیکھیں

وہ در سے اُٹھنے بھی دیتا نہیں ظفر ورنہ
اٹھیں یہاں سے تو گھر کوئی دوسرا دیکھیں

(عصری ادب نئی دہلی، جنوری تا اپریل ۱۹۸۴)

عبدالعزیز خالد

نخچیر ہوں میں کشمکشِ فکر و نظر کا
حق مجھ سے ادا ہو نہ دروبستِ ہنر کا
مغرب مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے شرق
دھوبی کا وہ کتا ہوں کہ جو گھاٹ نہ گھر کا
دبتا ہوں کسی سے نہ دباتا ہوں کسی کو
قائل ہوں مساواتِ بنی نوعِ بشر کا
ہوں بے سروساماں پئے از خاک نشیناں
پھیرا نہیں کرتا کسی ذی جاہ کے در کا
ہر چیز کی ہوتی ہے کوئی آخری حد بھی
کیا کوئی بگاڑے گا کسی خاک بسر کا!
دلگیر تو بے شک ہوں پہ نومید نہیں ہوں
روشن ہے دلِ شب میں دیا نورِ سحر کا
پوشیدہ نہیں مجھ سے کوئی جزر و مدِ شوق
محرم ہوں صدا دلبرِ انگیختہ بر کا
زندان و سلاسل سے صداقت نہیں دبتی
ہے شانِ کئی سلسلہ بس رقصِ شرر کا
تصویر کوئی بنتی دکھائی نہیں دیتی
کیا صرفِ عبث ہم نے کیا خونِ جگر کا
کیا شغلِ شجر کاری افکار سے بہتر
سودا سرِ شوریدہ میں گر ہو نہ ثمر کا
کیوں سرخوشِ رفتار نہ ہو قافلۂ موج
رہزن کا ہے اندیشہ نہ غم زادِ سفر کا
ڈالی ہے ستاروں پہ کمند اہلِ زمیں نے
زُہرہ کا وہ افسوں نہ فسانہ وہ قمر کا
ہر بات ہے خالد کی زمانے سے نرالی
باشندہ ہے شاید کسی دنیائے دِگر کا

(کتاب نمائی دہلی مارچ ۱۹۸۴)

عزیز بانو داراب وفا

اپنی بیتی میری رنگین جدائی دے گا
مجھ کو تصویر بھی دے گا تو پرانی دے گا

چھوڑ جائے گا مرے جسم میں بکھرا کے مجھے
کل وہ پیغام ہواؤں کی زبانی دے گا

عادتیں ملتی ہیں سورج سے بہت کچھ اس کی
وقتِ رخصت بھی وہ اک شام سہانی دے گا

عمر بھر میں کوئی چادر کی چھڑی ڈھونڈوں گی
میری میراث کو پریوں کی کہانی دے گا

ہم سفر محل کا پتھر نظر آئے گا کوئی
فاصلہ پھر مجھے اس شخص کا ثانی دے گا

میرے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ کر کے
وہ بھی ماضی کی طرح اپنی نشانی دے گا

برف ہو جائے گا جب میرے لہو کا دریا
تب کہیں جا کے وہ موجوں کو روانی دے گا

میں نے یہ سوچ کے بوئے نہیں خوابوں کے درخت
کون جنگل میں لگے پیڑ کو پانی دے گا

(آوازِ نئی دہلی، یکم نومبر ۸۵ء)

عشرت ظفر

شاید یہی گھڑی ہے مرے امتحان کی
شاداب ساعتوں میں ہے سختی پٹھان کی

ڈرتی ہے جس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ہوا
ہاتھوں میں میرے خاک ہے یہ کس جہان کی

تخلیق ہیں اسی کی سحاب و شجر تمام
ہے دشت میں تلاش جسے سائبان کی

سورج سیاہ جھیل میں اترا اور ایک شخص
دیوار چاٹنے لگا اپنے مکان کی

مجھ کو یقین ہے مری نا آفریدہ نسل
دشمن بنے گی میرے قدم کے نشان کی

یا تو فلک کی تنگ فضا کو کشادہ کر
یا شہپروں سے چھین لے مستی اڑان کی

ہے آج اس کے جسم کی شمشیر بے نیام
عشرتؔ نہ خیر مانگئے اب اپنی جان کی

(شب خون الہ آباد، دسمبر ۱۹۸۴ء)

سنگ و خشت کو تاباںؔ بام و در نہیں کہتے
ربطِ غم نہ ہو جس سے اس کو گھر نہیں کہتے

دل سے چھین لیں جس نے لذتیں جراحت کی
اس کو جو بھی کہتے ہوں در گزر نہیں کہتے

بات صرف اتنی ہے زندگی کی راہوں میں
ساتھ چلنے والوں کو ہم سفر نہیں کہتے

کوئی کیسے سمجھائے سادہ دل اسیروں کو
بال و پر کی حسرت کو بال و پر نہیں کہتے

نخلِ دل کی شادابی اک سراب کا عالم
دشت کو بہاروں کی رہ گزر نہیں کہتے

سب چراغ بستی کے اونگھنے لگے تاباںؔ
وہ کوئی کہانی ہو رات بھر نہیں کہتے

غلام ربانی تاباںؔ

(آج کل نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۵ء)

قیصر الجعفری

بستی میں ہے وہ سناٹا، جنگل مات لگے
شام ڈھلے بھی گھر پہنچوں تو آدھی رات لگے

مٹھی بند کئے بیٹھا ہوں کوئی دیکھ نہ لے
چاند پکڑنے گھر سے نکلا جگنو ہات لگے

تم سے بچھڑے دل کو اجڑے برسوں بیت گئے
آنکھوں کا یہ حال ہے اب تک کل کی بات لگے

تم نے اتنے تیر چلائے سب خاموش رہے
ہم تڑپے تو دنیا بھر کے الزامات لگے

خط میں دل کی باتیں لکھنا اچھی بات نہیں
گھر میں اتنے لوگ ہیں جانے کس کے ہات لگے

ساون ایک مہینے قیصرؔ آنسو جیون بھر
اِن آنکھوں کے آگے بادل بے اوقات لگے

(آوازِ نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۴ء)

لطف الرحمٰن

بے وطن لمحوں کی زد میں بے اماں رہ جائے گی
نسل اپنی ہجرتوں کی نوحہ خواں رہ جائے گی

کیسی ہی قربت ہو دوری درمیاں رہ جائے گی
نارسائی کی ادھوری داستاں رہ جائے گی

رتجگوں کا رزق خوابوں کا نگر ہو جائے گا
لمس کی سیلی کرن خوں میں رواں ہو جائے گی

اک مسلسل کرب لا یعنی کی سرحد سے ادھر
زندگی بھر کی عبادت رائگاں رہ جائے گی

گزری یادوں کی اکیلی رہگزر پر اک تھکن
رات کے پچھلے پہر پھر بے اماں رہ جائے گی

ٹوٹ کر تارے خلاؤں میں بسر ہو جائیں گے
روشنی کی گونج زیر آسماں رہ جائے گی

لفظ کی سازش سے معنی پر زوال آ جائے گا
ڈوبتی سانسوں میں اک ٹوٹی فغاں رہ جائے گی

(شاعر، بمبئی نومبر ۱۹۸۴)

محبوب راہیؔ

خود شناسی ہے اک احساسِ انا مجھ میں بھی ہے
میں خدا ہرگز نہیں لیکن خدا مجھ میں بھی ہے

جو رہا ہے برسرِ پیکار مجھ سے عمر بھر
میرا میں میرے سوا اک دوسرا مجھ میں بھی ہے

موت کے آگے نہ کچھ چل پاتے تو کیا کیجئے
بہر صورت زندگی کا حوصلہ مجھ میں بھی ہے

میں بھی پیروکار ہوں اک مسلکِ ایوبؑ کا
یعنی صبر و ضبط کا اک حوصلہ مجھ میں بھی ہے

ہے مسائل کے یزیدوں سے مجھے بھی سابقہ
کربلا اک روز و شب پیہم بپا مجھ میں بھی ہے

جو کہ صدیوں سے مرے اسلاف سے منسوب ہے
اک روایت سلسلہ در سلسلہ مجھ میں بھی ہے

زہر سے حالات کے ہرگز میں مر سکتا نہیں
میں ہوں شنکر اک سمندر زہر کا مجھ میں بھی ہے

مجھ کو رہبر کی نہیں راہیؔ ذرا بھی احتیاج
میرا اپنا ایک کامل رہنما مجھ میں بھی ہے

(شاعر، بمبئی ۱۹۸۴)

مخمور سعیدی

کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیاں

کون اب اس شہر میں کس کی خبر گیری کرے؟
ہر کوئی گم اک ہجومِ بے خبر کے درمیاں

آتا رہتا ہے مری پہچان بن کر سامنے
ایک لمحہ، ان گنت شام و سحر کے درمیاں

کیا کہے؟ ہر دیکھنے والے کو آخر چپ لگی
گم تھا منظر، اختلافاتِ نظر کے درمیاں

کس کی آہٹ پر اندھیرے میں قدم بڑھتے گئے؟
رہنما تھا کون اس اندھے سفر کے درمیاں؟

کچھ اندھیرا سا، اجالوں سے گلے ملتا ہوا
ہم نے اک منظر بنایا خیر و شر کے درمیاں

بستیاں مخمورؔ یوں اجڑیں کہ صحرا ہو گئیں
فاصلے بڑھنے لگے جب گھر سے گھر کے درمیاں

(کتاب نما نئی دہلی نومبر ۱۹۸۴)

مصوّر سبزواری

سخت تنہا ہے وہ تنہا بھی نہ رہنے دے گا
پاس دیوار کے سایہ بھی نہ رہنے دے گا

بستیاں ہو تو چکیں کب کی سپردِ صحرا
کیا انہیں صورتِ صحرا بھی نہ رہنے دے گا

پھول آنکھوں میں تری کھلتے رہے برگ بغیر
تو تو کہتا تھا کہ پتہ بھی نہ رہنے دے گا

اپنے غرقاب گھروندوں میں چلو پھر واپس
پانی پانی یہ جزیرہ بھی نہ رہنے دے گا

دور تک لمبی چٹانوں کا پُراسرار سکوت
کوئی آہٹ کوئی دھوکا بھی نہ رہنے دے گا

کوئی ہمزاد مسلط ہے مصوّرؔ مجھ پر
دور رکھے گا اکیلا بھی نہ رہنے دے گا

(شاعر، بمبئی نومبر ۱۹۸۴ء)

مظہر امام

بے آب آئینے تھے شجر بے لباس تھے
دُنیا بہت اُداس تھی جب ہم اُداس تھے

سارے خیال و خواب دریدہ لباس تھے
جتنے بھی آفتاب تھے، وہم و قیاس تھے

یہ راہِ سنگ و خشت مرا انتخاب تھی
جتنے بھی مرحلے تھے، وہ حسبِ قیاس تھے

دُنیا بھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

یوں اس کے طرزِ خاص سے روشن تھا ماہِ شوق
لیکن وہ دور سے جو مرے آس پاس تھے!

ہم نے امید باندھی تو کس کا قصور تھا
آخر وہ مرے کون تھے بس روشناس تھے

اس رہ گزر پہ ہم کو تو رونق فزوں لگی
لیکن ہمارے دوست بہت بدحواس تھے

(الفاظ علی گڑھ جنوری/دسمبر ۱۹۸۴ء)

[redacted]

منشا الرحمٰن خاں منشا

حصارِ ذات سے باہر بھی دیکھتے رہیے
کچھ اپنے آپ سے ہٹ کر بھی دیکھتے رہیے

اُٹھاتے جائیے لطفِ بہار جی بھر کے
مآلِ حسنِ گُلِ تر بھی دیکھتے رہیے

دلوں میں جن کے سبب ہیں قیامتیں برپا
وہ رنج و غم کے سمندر بھی دیکھتے رہیے

جو اپنے شہر اماں میں جو عام ہیں ہر سو
وہ خوں وہ آگ کے منظر بھی دیکھتے رہیے

لبوں پہ جن کے ہیں ہر وقت پیار کی باتیں
انہیں کے ہاتھوں میں خنجر بھی دیکھتے رہیے

(بیسویں صدی، نئی دہلی نومبر ۱۹۸۴ء)

[redacted]

منظر سلیم

حدِ مستقبل و ماضی پر پڑا تھا مقتول
حال کا آئینہ تھا، ٹوٹ گیا تھا مقتول

کس کے گھر سے کے خبر جائے صبا حیراں تھی
جسم بے چہرہ تھا نام اور پتا تھا مقتول

جانے حیرت سے کہ دہشت سے کھلی تھی آنکھیں
جانے کیا دیکھ کے دُنیا سے اُٹھا تھا مقتول

چند الفاظ جو چپکے تھے لبوں پر کیا تھے
کہہ کے کیا بھیڑ سے خاموش ہوا تھا مقتول

خاک پر خون سے لکھ دی تھی کچھ اپنی روداد
کچھ کتابوں کے لیے چھوڑ گیا تھا مقتول

سب جو دُنیا میں حسیں ہے وہ ملا لینے میں
کتنی تہذیبوں کی مٹی سے بنا تھا مقتول

آدمی تھا کہ فرشتہ کہ خدا تھا قاتل
چپ تھا پر سب سے یہی پوچھ رہا تھا مقتول

(آواز، نئی دہلی، یکم اپریل ۸۶ء)

[redacted]

نازش پرتاپگڈھی

حقیقتوں کے جہاں میں نہ بزمِ خواب میں ہوں
میں اپنے آپ سے مل کر بڑے عذاب میں ہوں

کتاب خانۂ دُنیا میں کون ڈھونڈے گا
میں حرفِ حق ہوں مگر جانے کس کتاب میں ہوں

دیا نہ ساتھ مرا مصلحت پسندی نے
کہ میں معیتِ خود داری خراب میں ہوں

نہ مجھ سے پوچھئے عالم مسرت و غم کا
وہ خود بتا نہ سکے گی میں کس حساب میں ہوں

پڑھا تو صرف اندھیروں کا تذکرہ پایا
خیال یہ تھا کہ میں روشنی کے باب میں ہوں

بجا ہے مجھ سے نئی نسل اگر ہے ناواقف
میں وہ سبق جو پرانے کسی نصاب میں ہوں

وہی لبوں پہ تبسم، وہی سخن گوئی
یہ کون مانے گا نازشؔ کہ میں عذاب میں ہوں

(شاعر، بمبئی مئی جون ۱۹۸۴ء)

ہے ڈھلتی ہوئی شام اور آنگن میں کھڑا ہوں
سایہ مرا کہتا ہے کہ میں تجھ سے بڑا ہوں

میں قتل ہوا اور نہ سولی پہ چڑھا ہوں
پھر بھی صفِ منصور و مسیحا میں کھڑا ہوں

احباب سے نہ خوش ہوں نہ دشمن سے لڑا ہوں
خنجر ہوں مگر اپنے ہی سینے میں گڑا ہوں

تم منتظر اس کے ہو کہ اب ٹوٹے مری سانس
میں موت کے جبڑوں میں بھی جینے پہ اڑا ہوں

غیروں کے اجالوں کی حقیقت مجھے معلوم
خود اپنی ہی دیوار کے سائے میں پڑا ہوں

احسان نہیں لیتا کسی شام و سحر کا
میں گردشِ دوراں سے الگ ہٹ کے کھڑا ہوں

پلکوں پہ حسیں خواب سمیٹے ہوئے اپنے
بے رحمی حالات سے تا عمر لڑا ہوں

آئے نہ خریدار ادھر کوئی کہ میں تو
بازار میں تفریح کی نیت سے کھڑا ہوں

کاندھوں پہ چڑھے لوگوں کی اس بھیڑ میں نازشؔ
خوش ہوں کہ میں آپ اپنے ہی پیروں پہ کھڑا ہوں

(چنگاری دہلی شمارہ ۳۶۔۱۹۸۴ء)

وہ مرے غم کا مداوا نہیں ہونے دیتا
ذرۂ درد کو صحرا نہیں ہونے دیتا

ساتھ رکھتا ہوں ہمیشہ تری یادوں کی دھنک
میں کبھی خود کو اکیلا نہیں ہونے دیتا

زخم بھرتا ہے، نیا زخم لگانے کے لیے
کیا مسیحا ہے کہ، اچھا نہیں ہونے دیتا

جس کے انجام سے ٹوٹے مرا پندارِ انا
میں وہ آغاز دوبارہ نہیں ہونے دیتا

روک دیتا ہوں اُمڈتے ہوئے طوفاں ناصرؔ
قطرۂ اشک کو دریا نہیں ہونے دیتا

ناصرؔ زیدی
(آج کل نئی دہلی جون ۱۹۸۵ء)

ندؔا فاضلی

ہر گھڑی خود سے اُلجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں مجھی میں ہے سمندر میرا

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

ایک سے ہو گئے چہرے ہوں کہ موسم سارے
میری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا

مدتیں بیت گئیں خواب سہانا دیکھے
جاگتا رہتا ہے ہر نیند میں بستر میرا

آئینہ دیکھ کے نکلا تھا میں گھر سے باہر
آج تک ہاتھ میں محفوظ ہے پتھر میرا

(آج کل نئی دہلی نومبر ۸۴ء)

کل سمیٹے گا، مزارع صبح کا، سویا ہوا
دانہ دانہ رات کے کھلیان کا بکھرا ہوا

آ کہ، اب اس کو کھلے بن پر ہنسیں بے ساختہ
تیرے آنسو طے شدہ تھے، میرا غم سوچا ہوا

اُس سے کیا کہتا کہ میری روح چھلنی ہو گئی
دوست تھا، اظہار ہمدردی سے آسودہ ہوا

سانحہ یہ جسم کے جلنے سے تھا سنگین تر
اس کے ہونٹوں پر ملا، اک قہقہہ چپکا ہوا

اک طرف سوکھے ہوتے پودے کی نچلی پتیاں
اک طرف روشن مکانوں میں نگر جلتا ہوا

اب کی برکھا میں یہ ٹوٹی پتیاں رکنی نہیں،
آندھیاں اٹھنے کو ہیں، یا دل بہت گھبرا ہوا

نشتر خانقاہی

(آج کل نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۵ء)

نیّر جہاں نیّر

اچھا ہے کبھی سایۂ دیوار نہ ہونا
اور زخم تمنا کا گنا ہگار نہ ہونا

تم بھی نظر آتے ہو کسی اور کے ہمراہ
اب مجھ سے وفاؤں کے طلبگار نہ ہونا

ہر صبح یہ کہتی ہے کہ دن اور بڑا ہو
ہر رات کا اصرار کہ بیدار نہ ہونا

یہ آج کا انسان ہے دل سوچ سمجھ لے
یوسف بھی بکے یاں تو خریدار نہ ہونا

اک بار جلو جل کے بجھو، بجھ کے نہ جلنا
سورج کی طرح راندۂ بازار نہ ہونا

مل مل کے بچھڑنے کی اذیت سے تو چھوٹے
بہتر تھا یہی آپ کا دیدار نہ ہونا

(بیسویں صدی، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۴)

وامق جونپوری

ساحل سے زندہ لوٹ نہ آئیں تو کیا کریں
کب تک کنارے ٹوٹتی موجیں گنا کریں

اُکتا گیا ہے دل اس خاکداں میں رہنے سے
جی چاہتا ہے پھر کوئی بھاری خطا کریں

گھر میں تو اب کوئی نہیں پہچانتا ہمیں
سائل کی طرح در پہ نہ جائیں تو کیا کریں

مثلِ مگس میں لپٹا رہوں گا گلاب سے
کتنی بھی تند و تیز ہوائیں چلا کریں

مے کا تمام لطف گیا دلبروں کے ساتھ
اب لاکھ اودی اودی گھٹائیں اُٹھا کریں

ہم نے اُٹھایا سر تو گنہگار ہو گئے
سرزد ہوتے جو اُن سے مظالم ہوا کریں

پھر ناقلوں سے کہہ دو کہ میں لکھ رہا ہوں شعر
پھر آکے میرا ہاتھ قلم سے جدا کریں

دار و رسن کی بات پھر آئی زبان پر
لیکن کہاں وہ لوگ جو خوفِ خدا کریں

ممکن ہے اس کو توڑ کے نکلے کوئی درخت
پتھر کے سامنے چلو مل کر دعا کریں

یہ ہیں کتابیں میرے نشاناتِ پا نہیں
اب دوست میرا حال انہی میں پڑھا کریں

وامق کا ہے تضاد منافق بہ ایں سبب
ملنا ہے اگر اُن کو تو کھل کر ملا کریں

(آج کل نئی دہلی مئی ۱۹۸۴)

وزیر آغا

خراب وخستہ و بدحال و بے بصر جانا
ہوا کو ہم نے مگر پھر بھی ہم سفر جانا

ہوا وہ نغمہ سرا جب تو رابطے ٹوٹے
رہا نہ یاد کسی کو بھی اپنے گھر جانا

تھی کیا خبر کہ وہ اک پل میں پرفشاں ہوگا
وہ جس کو ہم نے سدا مشتِ بال و پر جانا

وفا شعار کو دی تم نے دشمنوں میں جگہ
جو دشمنوں میں تھا اس کو عزیز تر جانا

اور اب یہ حال کہ بیٹھے ہیں رہگذر میں کہیں
خدا ہی جانے کہ ہم کو تھا کس نگر جانا

اُسے یہ رہم کہ وہ اک شجر ہے سایہ دار
ہمیں ملال کہ ہم نے اسے شجر جانا

قدم قدم پہ رکی عمرِ رائیگاں اپنی
گو خود کو ہم نے سدا سنگِ رہگذر جانا

(شاعر، بمبئی ۱۹۸۴)

حصارِ ستم

احمد فراز

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ "حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج، ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے
وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی
سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے
تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کج کلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں
تمام اہلِ حرف کہ پندار کے ثناگر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اس قدر تھا کہ دربار سے بلاوا تھا
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں
قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
ہمارے ساتھ ہے کون آس پاس تو دیکھو
سو شرط یہ ہے کہ جو جان کی اماں چاہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو!
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو"
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ
مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے
مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم!
مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا!

(عصری ادب، نئی دہلی جنوری تا اپریل ۱۹۸۴)

ایک احساس

اخترالایمان

غنودگی سی رہی طاری عمر بھر ہم پر
یہ آرزو ہی رہی تھوڑی دیر سو لیتے
خلش ملی ہے مجھے اور کچھ نہیں اب تک
ترے خیال سے اے کاش درد دھو لیتے
مرے عزیزو، مرے دوستو گواہ رہو
وہ کیا رات کبھی آمدِ سحر نہ ہوئی
شکستہ پا ہی سہی، ہم سفر رہا پھر بھی
اُمید ٹوٹی کئی بار منتشر نہ ہوئی
ہیولا کیسے بدلتا ہے وقت، حیراں ہوں
فریب اور نہ کھائے نگاہ ڈرتا ہوں
یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے پل پل میں
ہزار بار سنبھلتا ہوں اور مرتا ہوں
وہ لوگ جن کو مسافر نواز کہتے تھے
کہاں گئے کہ یہاں اجنبی ہیں ساتھی بھی
وہ سایہ دار شجر جو سنا تھا راہ میں ہیں
سب آندھیوں نے گرا ڈالے اب کہاں جائیں
یہ بوجھ اور نہیں اُٹھتا ہے کچھ سبیل کرو
چلو ہنسیں گے کہیں بیٹھ کر زمانے پر

(چنگاری، دہلی شمارہ ۲۲۵-۱۹۸۴)

ریکھائیں

ادیب سہیل

ریکھاؤں میں گھرے ہوتے ہیں
ریکھائیں میرے اندر بھی ہیں اور باہر بھی
ریکھاؤں میں تحفظ بھی ہے تصادم بھی ہے
ریکھائیں ہیں سیتا بھی اور راون بھی
رشی منی اور صوفی عالم
جو بھی آئے
ریکھاؤں کے پیدا کردہ بھید بھاؤ اور دوری
اور مجبوری کو کم کرتے رہے ہیں
ریکھاؤں کا بننا بگڑنا
دونوں ایک سمان
دونوں آگ اور خون کا کھیل
سمے سمے سے ریکھائیں اغراض کی خاطر کرتے رہے ہم
پیدا اور معدوم
اس پیدا۔ معدوم کے کھیل میں گھڑی گھڑی
یہ ہری بھری اور پیاری دھرتی بنتی ہے شمشان۔

(شاعر، بمبئی جولائی ۱۹۸۴)

ہوا چپ رہی

افتخار عارف

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے
گھونسلے بے سرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی
تگ و تاز پر بین کرتی رہی
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں
گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل، دعاؤں کو
اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور شب حبس کے قہرماں موسموں کے
عذاب ان زمینوں پر بھیجے گئے
اور منادی کرا دی گئی
جب کبھی رنگ کی، خوشبوؤں کی، اڑانوں کی، آواز کی
اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے

(عصری ادب نئی دہلی جنوری تا اپریل ۱۹۸۴)

بونے

پریم پال اشک

میگنی فائی گلاس کے ذریعے
میں بونوں کے بڑھے ہوئے قد ناپ رہا ہوں
کہنے کو یہ قد آور ہیں
لیکن ان کے جسم فقط ہیں کانچ کے پتلے
چھوٹے چھوٹے ذہن ہیں ان کے
ننھے ننھے دلوں کے مالک
علم و عمل کی قوت عنقا
اوروں کی شہ زوری پر یہ اتراتے ہیں
دیکھ پرائی دولت ان کی رال ٹپکتی
ان کا اپنا کوئی دھرم ایمان نہیں ہے
ان کے کہنے سے دھرتی پر کبھی نہیں آسکتی قیامت
کیونکہ قیامت، اپنی مرضی سے آتی ہے۔

(پرواز ادب — ۱۹۸۴)

دستور

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو۔ جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینے کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں
تم نہیں چارہ گر۔ کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

بھئے کبیر اُداس

اک پٹری پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر بیٹھا اور اک اُس کا داس
بھئے کبیر اُداس
اُونچے اُونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اُداس
گیت لکھائیں پیسے نہ دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیوں گائے کیوں نہ کاٹے گھاس
بھئے کبیر اُداس
کل تک جو تھا حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالب اپنے دیس میں سکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اُداس

حبیب جالب

(عصری ادب نئی دہلی، جنوری تا اپریل ۱۹۸۴)

کیا ہوا؟

حکیم منظور

کیا ہوا؟
آئینہ خانہ بنی ہے، دیکھنے والی نظر
جو بھی سیدھا ہے، وہی معکوس ہے،
جو مرے دائیں طرف، اب مرے بائیں طرف ہے
سات رنگوں کی ردا پہنی ہوئی قوسِ قزح آنکھوں میں ہے
سامنے کے سبز پیڑ
مسکراتے پھول
نشۂ خوشبو سے بوجھل صبح کی ٹھنڈی ہوا
لہلہاتے کھیت ہنستے مسکراتے راستے حدِ نظر تک اک انوکھا سلسلہ
نقطۂ موہوم جیسے بھی نظر آتے نہیں
یعنی جو کچھ پاس ہے وہ دور ہے
دُور کتنا پاس ہے
سلسلہ سارا علاماتی ہوا

دُور پاس
پاس دُور
دایاں بایاں
بایاں دایاں
"الف" پڑھنا چاہتا ہوں سامنے آتا ہے "یے"
کس سے پوچھوں ہمارے سلسلے اقدار کے،
افکار کے جو تھے وہ آخر کیا ہوئے؟

(آج کل نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۴ء)

زہرہ نگاہ

سمجھوتہ

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
کہیں بھی سچ کے گُل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اُٹھے گا آنگن
پکڑ لیں گے تو گر جائے گی چلمن
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے

(گلدستہ دہلی ۱۹۸۵ء) ۱۹۸۵ء

ناسپاس لہر کی تلاش

سحر کار چاند کے
مٹیلے غبار میں
سیپیاں تلاش کر رہا تھا
دفعتہً
کسی کراہ نے قدم پکڑ لئے
ایک بے قرار لہر تھی

سرد ریت اور
سخت پتھروں کی سیج پر پڑی ہوئی
رو رہی تھی پانیوں کے سوگ میں
میں نے اپنے جال میں اُٹھا لیا
کار میں سوار گھر کا راستہ لیا
اور اس خیال سے عمر بھر
بھیگتی رہی ہے سوکھ جائے گی

صبح اپنے لان کی سبز دھوپ میں
ڈال کر چلا گیا

واپسی ہوئی کہ بے کلی ہوئی
وہ کہیں چلی گئی
روز ڈھونڈتا رہا
وہ سمندروں کی روح
آج تک نہیں ملی

ساقی فاروقی

(شب خون، اپریل مئی جون ۱۹۸۵ء)

در گزر

کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
پھینک آئے تھے مجھے یوسفِ کنعاں کی طرح
کھینچ لائے تھے مجھے شہر کے بازاروں میں
سب کو دکھلاتے تھے آئینۂ حیراں کی طرح
لوگ کہتے ہیں کہ کوئی بھی خریدار نہ تھا
کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
چھوڑ آئے تھے سلگتے ہوئے میداں میں مجھے
ایڑیاں رگڑیں مگر چشمۂ زمزم نہ ملا
کیسے تنہا کیا کس حالِ پریشاں میں مجھے
کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
باغِ آسائشِ ہستی بھی دکھایا مجھ کو!
کوئی شداد نما تھا کوئی نمرود صفت
بے گناہی کی سزا تھی کہ وہ سچ کا انعام
رسن و دار کے ممبر پہ بٹھایا مجھ کو!
کون وہ لوگ تھے اب یاد نہیں آتا ہے
کوئی انساں کوئی شیطاں کوئی چہرہ کوئی نام
حافظہ شیشے کی مانند درک جاتا ہے
اے خدا تجھ سے تو پوشیدہ نہیں ہے کوئی راز
دوست ہوں گے کہ وہ دشمن مرا پہنچا دے سلام
شکر کرتا ہوں کہ دُنیا کے خزانے نے مجھے
کوئی موتی نہ سہی آنکھ تو گریاں دی ہے
کیا دیا کیا نہ دیا تو نے خدائے فیاض
کیا یہ کم ہے کہ مجھے دولتِ نسیاں دی ہے

شاذ تمکنت

(ماہنامہ اسلوب کراچی اکتوبر ۲۰۰۶ء)

اذاں تو آج بھی گونجی

صبا اکرام

اذاں تو آج بھی گونجی
صدائے لا الٰہ آئی
مگر لبیک کی شمع
نہ ہونٹوں پر ہوئی روشن
نہ ہاتھوں میں
دعاؤں کے کنول چمکے
وہاں تو آج
ہونٹوں پر اُگے تھے
خار نعروں کے
اور ان کے با وضو ہاتھوں میں
پتھر تھے
نہ جانے کس جنوں میں
آج اپنے گھر سے نکلے تھے
کہ وہ شیطاں پہ کنکر
پھینکنے والے
خدا کے گھر پہ ہی
پتھراؤ کر بیٹھے
اذاں تو آج بھی گونجی
مگر کرفیو میں کوئی آدمی
گھر سے نہیں نکلا!

(شب خون الہ آباد ۱۹۸۴ء)

جلاوطن

طارق عزیز

"مسافر ہوں بابا
مجھے روشنی کا پتہ دو
میں کب سے اندھیرے میں بھٹکا ہوا ہوں
میں گم ہو گیا ہوں
یہ گلیاں یہ اینٹیں
مرے واسطے اجنبی ہیں یہ رستے
یہاں رات کی رات رکنا ہے مجھ کو
سحر ہوتے ہوتے
یہاں بسنے والوں کے اچھے طریقے کی خوشبو لیے
عمر بھر سے مسافت بنے گی
اگر ہو سکے تو
مجھے ایک شب اپنے گھر میں جگہ دو
مسافر ہوں بابا"

"یہاں تو میں خود اک مسافر ہوں بھائی
یہ گلیاں یہ اینٹیں
مرے واسطے
اجنبی بن گئے ہیں یہ رستے
میں گزرے ہوئے وقت کا سب سے پہلا عمل ہوں
ابھی تم نے قدموں کی آہٹ سنی تھی
یہ بچے
مری گود میں کھیل کر کھو گئے ہیں
انھیں دیکھنے میں یہاں آ گیا تھا
یہاں تو مرے پاؤں بھی بے نشاں ہیں
میں خود واپسی کی مسافت میں گم ہوں
یہاں رات کی رات رکنا ہے مجھ کو
یہاں تو میں خود اک مسافر ہوں بھائی"

(مووی اسٹار نئی دہلی اگست ۱۹۸۴ء)

ایک نظم فلسطین کے لیے

اونٹ کی پیٹھ پہ بے خواب اندھیری راتیں
زندگی جلتے ہوئے صحرا میں شبنم لمحہ
اپنے خیموں کو سرابوں کے کنارے گاڑو
اور ہر اک موج کو پھر خونِ جگر سے باندھو
سانس کا شعلہ ہے یا آگ کا دریا شاید
درد کی چیخ ہے یا بم کا دھماکہ شاید
خواب کے نقشِ قدم ریت میں رہتے ہی نہیں
قافلے جاتے ہیں کس سمت یہ کہتے ہی نہیں
اونٹنی ہانپ رہی حاملہ تنہا تشنہ
اور کھلی آنکھ میں لہراتے کھجوری سائے
جلتے صحراؤں میں اک گونج ہے پانی پانی
بیٹھ مشکیزہ اُٹھائے ہوئے بڑھتے سائے
گونجتی دور تلک خوف خموشی میں اذاں
بکریاں کان ہلاتی ہوئیں آنگن آنگن
خون سے ریت پہ کھینچو نئی سرحد کی لکیر
آسمانوں میں ہو نمودار نزولِ عیسیٰ
اور نئی روح فلسطین میں پھونکی جائے

عادل منصوری

(الہام بمبئی جنوری ۱۹۸۴ء)

تری مری عمر کا سمندر

عزیز قیسی

کنویں کی منڈیر سے متصل
اُداس پیاسا اکیلا سوکھا ببول
کب سے
اُٹھا کے دو ہاتھ لکڑیوں کے
سمندروں کو پکارتا ہے
اور اس کا سایہ تمام دن دھوپ سے پریشاں
کنویں کے پانی میں چھپتا پھرتا ہے
سورج
یہ سوچتا ہے
نہ سائے کی پیاس ہی بجھے گی
نہ پیڑ سیراب ہو سکے گا
کنویں کا پتھر
خود اپنی بے مائگی پہ نادم
یہ کہہ رہا ہے۔
تری مری پیاس۔ زندگانی
تری مری آرزو۔ یہ پانی
یہی کمی ہے یہی ہے انعام تیرا میرا
تری مری عمر کا سمندر کہیں نہیں ہے
تری مری عمر کا سمندر یہیں کہیں ہے۔

(الفاظ علی گڑھ دسمبر ۱۹۸۴)

چہرے

علی سردار جعفری

یہ بے کس و بے قرار چہرے
صدیوں کے یہ سوگوار چہرے
مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہر دن کی طرح ہزار چہرے
لیجا کے انھیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شاہکار چہرے
افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادرِ روزگار چہرے
غازے سے سفیدے سے رنگین
اس دور کے داغدار چہرے
پھیکے ہیں فروغ زر کے بار صف
تابندہ ہیں خاکسار چہرے
گزرے ہیں نگاہ و دل سے ہوکر
ہر طرح کے بے شمار چہرے
مغرور انا کے گھونسلوں میں
بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے
ناقابلِ التفات آنکھیں
ناقابلِ اعتبار چہرے
شہرت سربلند آسماں پر
چھٹتے ہوتے ہے انار چہرے
پل بھر میں مگر دھواں دھواں سب
پل بھر میں فقط غبار چہرے
سونے کا چڑھا ہوا ہے پانی
اشارے شاندار چہرے
پہنے ہیں نقاب پارسائی
جنت کے کرایہ دار چہرے
ان سب سے مگر حسین تر ہیں
رندوں کے گناہ گار چہرے
چھنتے ہوتے نیزۂ دستاں پر
وہ شبنم نوک خار چہرے
چپکے چپکے سُلگ رہے ہیں
آتش کرن بہار چہرے
اُمید کی شمع سے فروزاں
شائستہ انتظار چہرے

(ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ ۵ ۱۹۸۵)

ماتم جشن امید

فیض احمد فیض

جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں
اب نہ مہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا میری طریقت بھی نئی
میرے قانون بھی نئے، میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے ..

(عصری ادب نئی دہلی جنوری تا اپریل ۱۹۸۴)

احمد ندیم قاسمی

مٹی

گزرتے وقت کے سفاک ہاتھوں سے
حنوط جا چکے ہیں ہم،
ہمارے پیکروں پر خود ہمارے ہی حوادث کی اُڑائی گرد
تہہ در تہہ جمی جاتی ہے،
ہم تو دست و بازو کیا ہلائیں گے
مگر طوفاں بھی جیسے راستہ ہی بھول بیٹھے ہیں،
کوئی جھونکا بھی ہم تک کب پہنچتا ہے۔
جو ہم پر ان گنت پرتوں کی صورت میں اترتی گرد کو
آ کر اڑائے
ورنہ ہم اپنے بدن کے سب مساموں سے
وہ سبزہ پھوٹتا دیکھیں گے
جو قبروں کی مٹی سے نکلتا ہے!

درد

وجود، احساسِ درد میں ہے
اگر یہ احساس ہی نہ ہو، تو
وجود اپنے عدم کے گہرے میں ڈوب کر
بے وجود ہو جائے،
درد عرفانِ ذات ہے
کائنات کو درد ہی نے چھانا ہے
درد ہی زہرہ و زحل تک رسائی ہے
اور خدائی بھی نور پر درد سے مستنیر ہے
اس کی تابشوں سے
حیات، اور پھر حیات سے ماورا کے سب ممکنات
روشن ہیں،
درد ہے تو جہاں بھی ہے،
اور آدمی بیکراں بھی ہے

رقابت

قتیل شفائی

رقیب اک دوسرے کے ہم نہیں اے دوست کیوں آخر؟
رقابت صرف غیرت مند انسانوں میں ہوتی ہے
اُسے پانا، اُسے کھونا تو ہے اِک مشغلہ اپنا
محبت جس کو کہتے ہیں وہ افسانوں میں ہوتی ہے

اُسے جب میں نے اپنایا تو یہ معلوم تھا مجھ کو
مرے پیچھے قطاروں میں کھڑے ہیں بوالہوس کتنے
وہ پھر جب تیرے ہاتھ آیا تو سوچا تو نے بھی ہوگا
پسِ پردہ ملیں گے تجھ کو تیرے ہم نفس کتنے
نہ شرم آئی کبھی تجھ کو نہ شرم آئی کبھی مجھ کو
بنائے آج تک ہم نے جوازوں کے قفس کتنے

لڑائی ہو نہیں سکتی کبھی دو ہوش مندوں میں
یہ غیرت کی بُری عادت تو دیوانوں میں ہوتی ہے
رقیب اِک دوسرے کے ہم نہیں اے دوست کیوں آخر
رقابت صرف غیرت مند انسانوں میں ہوتی ہے

(روبی نئی دہلی، جنوری ۸۵)

ایک قدم نارتھ پول پر

زمیں کے آخری کنارے کے پاس بھی
آسمان کا ہی ٹکڑا تھا
جو میرے صحن کے چھوٹے سے چوکھٹے سے نظر آتا تھا
وہاں کی ہوا، البتہ مجھے لیے لیے
سانس لیتے دیکھ کر خوش ہوتی تھی
میرے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونستی تھی
وہاں کے سمندر کو بھی
یہاں کے انسانوں کی طرح غصّہ نہیں آتا تھا
شاید اسی لیے وہاں سورج کو نکلنے سے خوف آتا تھا
دلوں کا اندھیرا، دلوں میں جاگزیں نہیں تھا
روشنی کی تیز دھار کو رشتوں کی طنابیں کاٹنے کے لیے نہیں
جسم کی گرہوں کو کھولنے کے لیے پیوست کیا جاتا تھا
عقل کی انگلیاں جُرم شمار کرنے کے لیے نہیں
احساس کی گرفت کے لیے پناہ گاہ بنتی تھیں
موسم کا سبز فرغل اور بھی سبز لگتا تھا
جوڑوں کا ادھیڑپن، بیراہن بیر کی نہیں
طمانیت کی درگاہ دکھائی دیتا تھا
وہاں خواب بھی تھے اور خواب دیکھنے والے بھی
وہاں حساب بھی تھے اور حساب رکھنے والے بھی
منظر کی صاف گوئی نے مجھے بھی صاف گو بنا رہا ہے
مجھے سمندر کے کنارے بیٹھی مرغابیوں کی سی آزادی چاہیے
میری آنکھ اور میری ذات، دونوں قید سے رہائی چاہتے ہیں!

کشور ناہید

(ماہنامہ اسلوب کراچی، جون ۱۹۸۵ء)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

نظم

پھر چلے بادِ بہاری پھر چلے بادِ مراد
صحنِ گلشن میں، واں ہو پھر صبائے اتحاد
کلفتیں سب دور ہوں مٹ جائیں سب رنج و تعناد
خیر سے عنقا ہوں پھر سب فتنہ و فسق و فساد
سوئے منزل رہروانِ تیز گام آئے تو ہیں
صبح کے بھولے جو تھے وہ وقتِ شام آئے تو ہیں
غیر کے دل کا کہا ہو جائے اچھا تو نہ تھا
ناروا جو ہو، روا ہو جائے اچھا تو نہ تھا
بھائی سے بھائی خفا ہو جائے اچھا تو نہ تھا
گوشت سے ناخن جُدا ہو جائے اچھا تو نہ تھا
خیر جو کچھ بھی ہوا لیکن بصد خلق و تپاک
آملیں اب سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
شیخ جی باتیں کریں قرآن کی رحمان کی
اور پنڈت داستاں چھیڑا کریں بھگوان کی
صاحبِ ایماں نمائش کیوں کریں ایمان کی
آؤ ہم انسان ہیں باتیں کریں انسان کی
ہم علی ہم احمدِ مختار کی باتیں کریں
آؤ ہم نانک کی کرشن اوتار کی باتیں کریں
ان کی باتوں سے سنور جائے گا ہر حالِ زبوں
ان کی باتوں سے ملے گا قلب کو سوزِ دروں
روح کو بالیدگی مل جائے گی دل کو سکوں
ان کی باتوں سے ملے گا اور کیا کیا کیا کہوں
آؤ ہم سب مل کے پی لیں ان کے شیریں جام سے
دادِ محشر بھی بخشے گا انھیں کے نام سے

ہے خدا کی دین یہ جمہوریت کا بندوبست
اس عوامی دور میں اب کوئی اعلیٰ ہے نہ پست
یوں تو کہنے کو کہیں جو چاہیں یہ مطلب پرست
لفظ بے معنی ہیں لیکن آج کل فتح و شکست

جنگ کرنا ہر طرح سے سعیِ لاحاصل ہے آج
یہ نہ جادہ ہے نہ رہبر ہے نہ یہ منزل ہے آج

جنگ ہم کہتے ہیں جس کو یہ خدا کی مار ہے
جنگ کرنا ہر طرح بے سود ہے، بیکار ہے
ہارنے والے کو یہ سب باعثِ آزار ہے
جیتنے والے کی بھی اس میں سراسر ہار ہے

دوست دشمن سب کو بیگانہ بنا دیتی ہے جنگ
ملک ہیں کیا چیز تہذیبیں مٹا دیتی ہے جنگ

جنگ کرنا ہے کریں ہم مل کے بیکاری سے جنگ
جھوٹ سے مکر و ریا سے چور بازاری سے جنگ
قحط سے سیلاب سے طوفاں سے بیماری سے جنگ
بھوک سے افلاس سے غربت سے ناداری سے جنگ

پوچھنا ہوگا یہ مجھ کو ہند و پاکستان سے
پیٹ بھوکوں کا بھریں گے جنگ کے سامان سے

آؤ دل سے دور کر دیں خود شعارِ انتقام
آؤ پھر دنیا کو پہنچا دیں محبت کا پیام
رہ سکیں امن و سکوں سے شاد ہوں اپنے عوام
اے سفیرانِ کرم پہنچے تمھیں میرا سلام

حال و مستقبل ہو اپنا تابدار و تابناک
زندہ و پائندہ باد اے سرزمینِ ہند و پاک

(گلدستہ، دہلی ۸۵ء)

۱۳

میرا ماضی میرے کاندھے پہ سوار

کیفی اعظمی

آج بھی دوڑ کے گلے ملتے ہیں جو مل جاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہے مرے سینے میں جنگل کوئی
سینگ ماتھے پہ ابھر آتے ہیں

پڑا رہتا ہے مرے ماضی کا سایہ مجھ پر
دورِ خوں خواری سے گزرا ہوں چھپاؤں کیوں کر
دانت سب خون میں ڈوبے نظر آتے ہیں

جن سے میرا نہ کوئی بیر نہ پیار، اُن پہ کرتا ہوں وار
اُن کا کرتا ہوں شکار اور بھرتا ہوں جہنم اپنا
پیٹ ہی پیٹ مرا جسم ہے دل ہے نہ دماغ
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ
دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کے یہ داغ

مَل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن
بربریت کا تھا جو داغ وہ چھوٹا ہی نہیں
گاؤں آباد کئے شہر بسائے ہم نے
رشتہ جنگل سے جو اپنا تھا وہ ٹوٹا ہی نہیں
اس کو مذہب کا جنوں کہیے کہ میری وحشت
قتل بھی کر دیا ہمسائے کو لُوٹا ہی نہیں

(ماہنامہ اسلوب کراچی جون ۱۹۸۵ء)

اپنے آسمان کی تلاش میں

محمد سلیم الرحمٰن

تمہاری آنکھوں میں میری ایک صبح ہو گئی
یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ کہ میں جہاں پر
ٹنگا ہوا ہوں وہ رات کا بے چراغ رُخ ہے۔

مری اسیری کا ہر تناظر، سیاہیوں کے سفر میں غلطاں
تمہاری صبحوں کے آسمانوں سے دور لپٹا چھپے چھپے
غروب ہوتی ہوئی زمینوں میں خاک خاک ہو رہا ہے۔

تمہارے ہاتھوں میں جیسے بن باس کم دنوں کے جڑوں سے اکھڑی
کہانیوں اور پہیلیوں کے لُٹے پٹے اور بھولی بھٹکی
لٹی ہوئی سوگوار خوشبو، جو ہوک ہے بھول بیتوں کی۔

تمہارے ہاتھوں میں وقت گویا سمٹ کے رہ گیا ہے
وہ میری آنکھوں پہ عمر بھر کے تئیں آج تک دھرے ہیں
تمہارا اصلی جو نام ہے وہ بھی مجھ کو شاید پتا نہیں ہے۔

تمہاری یادوں کے اس قفس میں ہمیشہ پچھلے پہر کا پھیکا
سماں ہے یا شام کا دھندلکا یا پھر کسی دور کی صدا میں
نہیں کہیں سے پکارے جانے کا دل کو دونیم کرتا دھوکا

پہیلیوں، خاردار باڑوں سے تیر کر بیٹی کھلتی
گھمیر اور ست جگوں کی باہیں تمہارا سایہ ہیں تم نہیں ہو
کہ اپنی دنیا میں اب بھی شاید وصال کی صبح کا سانس ہو تم۔

(کتاب نما، نئی دہلی جون ۱۹۸۴)

راکھ تلے چنگاری

ناصر چودھری

چاند کے ساتھ سلگ اٹھی مری تنہائی
دوست اس طرح شبِ غم میں تری یاد آئی
رکھ کے سینے پہ میں اک سنگِ جدائی سویا
اپنے سائے سے کئی بار لپٹ کر رویا
کرب میں میں نے بسر چاندنی راتیں کی ہیں
میں نے اکثر در و دیوار سے باتیں کی ہیں
دن گزارے ہیں اذیت کے کٹھن لمحوں میں
میں کہ کھویا ہی رہا کربِ تمنا سوچوں میں
میں ہوں کس حال میں اتنا بھی نہ سوچا تو نے
میری یادوں کے دریچوں سے نہ جھانکا تو نے
تیری چاہت کو میں سینے میں چھپاؤں کب تک
دل میں یہ دہکی ہوئی آگ دباؤں کب تک
پھر سے بچھڑے ہوئے لمحوں کا حوالہ بن کر
آ مری چشمِ تمنا کا اجالا بن کر
تیرے پیکر کو میں شعروں میں شفق بار کروں
روٹھنے والے تجھے ٹوٹ کے میں پیار کروں

(بیسویں صدی نئی دہلی جولائی ۱۹۸۴)



خراجِ عقیدت

ادارہ 'عالمی اردو ادب' دہلی

سورج کہاں بجھا...

اثر غوری

سورج کہاں بجھا ہے سمندر میں ڈوب کر
عالم میں سارے پھیل گیا گھر میں ڈوب کر
شہروں کے کونے کونے منور سے کر گئے
وہ نقش تیرے خواب کے منظر میں ڈوب کر
وہ شخص اپنی جان کی بازی لگا گیا
زخموں کے گہرے گہرے سمندر میں ڈوب کر
لنکن میں اور گاندھی میں سادات میں جو تھا
وہ خون تازہ ہو گیا پتھر میں ڈوب کر
کشتی ڈبو کے خود ہی مسافر ہے شرمسار
قطرہ لہو کا چمکا ہے ساگر میں ڈوب کر
خوشبو کا لمس پیار کی ٹھنڈک کی بوند کو
اُبھرا وہ اپنے دھول کے پیکر میں ڈوب کر
آخر لہو لہان مگر یوں ہی ہو گیا
کشتی کنارے پر ہے سمندر میں ڈوب کر
ہر اک مکاں کی چھت پہ اثر پھیلنے لگی
موجِ نسیم بوئے صنوبر میں ڈوب کر

(منصف۔ حیدرآباد ۱۰ دسمبر ۹۲ء)

یہ راکھ ہے کس کی؟

اقبال کرشن

یہ راکھ ہے کس کی، یہ خاک ہے کس کی؟
یہ راکھ ہے اس ہستی کی جو پیکر ثابت قدمی تھی
یہ خاک ہے اس ہستی کی جو خوگر حب الوطنی تھی
اے ظرف اجل پوش کیا تجھ کو خبر ہے یہ راکھ ہے کس کی؟
یہ راکھ ہے اس ہستی کی، یہ خاک ہے اس ہستی کی
زیر و زبر جس کے اشاروں سے ہوئے لشکر اغیار
اے خاک وطن کیا تجھ کو خبر ہے یہ راکھ ہے کس کی؟
جو شرم و حیا کی دیوی تھی جو مورتی جواہر کی بیٹی تھی
اے گنگا ندی کیا تجھ کو خبر ہے یہ راکھ ہے کس کی؟
یہ راکھ ہے اس ہستی کی، یہ خاک ہے اس ہستی کی
تقدیس وطن کی سوگند تھی جو
اے باد وطن کیا تجھ کو خبر ہے یہ راکھ ہے کس کی؟
یہ راکھ ہے اس ہستی کی، یہ خاک ہے اس ہستی کی
جو حسن عمل سے فاتح عالم تھی جو ذوق عمل سے مظلوم عالم تھی
یہ راکھ اسی ہستی کی ہے، یہ خاک اسی ہستی کی ہے

(ساتھی۔ پٹنہ ۱۰ نومبر ۹۲ء)

الوداع اندرا جی

بانو طاہرہ سعید

یوں ہمیں چھوڑ کے نہ جا اے دوست
ایک لمحہ میں کیا ہوا۔ اے دوست
ظلمتوں میں تھی تیری ذات "دیا"
بجھ گیا وہ بھی اک "دیا" اے دوست

ضبط کی آج سخت حاجت ہے
شانتی کی بڑی ضرورت ہے
مُلک کی، قوم کی ہیں آنکھیں نم
دِل میں ہم سب کے اِک جراحت ہے

آخری ہے سلام۔ الوداع۔ الوداع
رہ گیا تیرا نام۔ الوداع۔ الوداع
ہے کہاں کا ارادہ یہ کیسا سفر
کہہ رہے ہیں عوام۔ الوداع۔ الوداع

(عوامی اقتدار، ۷ر نومبر ۱۹۸۴ء)

نغمۂ امن تھی...

بشیر فاروقی

عالی راہ نما، روحِ وطن، جانِ وطن
تو نے سینچا تھا لہو دے کے گلستانِ وطن
تو نے ہر طرح بڑھائی ہے وطن کی توقیر
تجھ سے تابندہ ہوئی شمعِ شبستانِ وطن

نغمۂ امن تھی تو سارے زمانے کے لیے
اپنی آواز میں کچھ اتنا اثر پایا تھا
تو نے ذہنوں میں جگایا ہے شعورِ قومی
دل جواہر کا تو گاندھی کا جگر پایا تھا

تیرا مشرب تھا محبت، ترا مذہب تھا خلوص
شاخِ گلہائے اخوت تھا ترا طرزِ کلام
حریت کی وہ مہک تھی ترے پیراہن میں
جس سے ہر لمحہ معطر ہے زمانے کا مشام

رانی جھانسی ہو کہ رضیہ ہو کہ زینت سب میں
تو اک انداز دلبرانہ جُدا رکھتی تھی
تیرے فرمان پہ جیتے تھے فدایانِ وطن
تو بھی اک صورتِ جانانہ جُدا رکھتی تھی

یہ ترا قتل نہیں قتل ہے تقدیروں کا
قتل ہے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیروں کا

(تاج ورڈ، گورکھپور ۸ر نومبر ۱۹۸۴ء)

مہاتما گاندھی سے اندرا گاندھی تک

●

گاندھی نے دے کے اپنا لہو، کل کی بات ہے
بخشا تھا اک نکھار تجھے اے وطن کی خاک
کیوں اتنی جلد پیاس تری پھر بھڑک اٹھی
دو روز ہی میں سوکھ گئی کیوں چمن کی خاک

●

شاید اسی لیے کہ شہیدوں کے خون سے
پاتی رہی ہے روح تری زندگی نئی
مجھ کو یقین ہے کہ پھر اس پاک خون سے
آئے گی تیرے چہرے پہ تابندگی نئی

●

یہ خوں جو آج پھر ترے دامن پہ ہے رواں
ہندوستاں کی روحِ مجسم کا خون ہے
صدق و صفا کا خون ہے، مہر و وفا کا خون
پاکیزگیٔ عشقِ دو عالم کا خون ہے

●

یہ تو بجا، وطن کے شہیدوں کی بزم میں
آج اس کا مرتبہ ہے بلند اور معتبر
یہ بھی بجا کہ اس کے لہو کی ہر ایک موج
ظلمات میں بنے گی تجلی کی رہ گذر

●

قاتل سے پوچھتا ہوں کہ یہ تو نے کیا کیا
قاتل سے پوچھتا ہوں گنہگارِ ملک و قوم
مارا اسی کو جس کی حفاظت تھی تجھ پہ فرض
آیا تھا تو تو بن کے وفادارِ ملک و قوم

●

ہندوستاں کی روح میں گولی اتار کر
اے کم شعور! تو نے نہایت بُرا کیا
ہے کس بہادری کی نمائش کا یہ دستور
عورت پہ تو نے ہاتھ اٹھایا یہ کیا کیا

●

اس دور میں کہ جس کو کہیں ابتلا کا دور
محفوظ تھا وطن کا وقار اس کے ہاتھ میں
ہر اک طرف کہ بادِ خزاں خیمہ زن تھی جب
پوشیدہ تھی چمن کی بہار اس کے ہاتھ میں

●

کیا خونِ بے گناہ اکارت گیا کبھی
خونِ شہید ہے یہ، کبھی رنگ لائے گا
چلتا نہیں کسی کو بھی اس طرح کا جنوں
یہ خونِ بے گناہ اکارت نہ جائے گا

(نیا دور، لکھنؤ، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۵ء)

مادرِ عالم

حسرت جے پوری

وہ صبح کے ماتھے پہ جھلکتی ہوئی سُرخی
دیتی ہے شہادت کہ لہو تیرا بہا ہے
اے مادرِ عالم! اے مادرِ عالم!
قاتل وہی قاتل ہیں کوئی اور نہیں ہے
جو سانپ کے مانند ترے ساتھ رہے تھے
دولت کے ہی شیطان نے اندھا کیا جن کو
اس دیش کی خاطر ہی ستم تو نے سہے تھے
اے مادرِ عالم! اے مادرِ عالم!

دھرتی پہ گرے ہیں جو ترے خون کے قطرے
یہ سات سمندر بھی انہیں دھو نہ سکیں گے
تو سورگ میں رہے چین سے اے مادرِ عالم
اس ہند کی آواز کو ہم کھو نہ سکیں گے
اے مادرِ عالم! اے مادرِ عالم!

چھلنی کیا جب جسم کو اس دشمنِ جاں نے
اس وقت ہمالہ کا جسم کانپ اُٹھا تھا
گنگا ہو کہ جمنا تڑپ اُٹھی تھیں لہریں
اس ظلم پہ یہ نیل گگن رونے لگا تھا
اے مادرِ عالم! اے مادرِ عالم!

ہیں اور بہت لال ترے دیش میں زندہ
ہم امن کے جھنڈے کو لیے آگے بڑھیں گے
ہونے نہیں دیں گے کبھی کمزور وطن کو
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے
اے مادرِ عالم! اے مادرِ عالم!

(عوامی اقتدار۔ حیدرآباد ۲۶ رجنوری ۸۴ء)

امر ہے اندرا گاندھی

حیات لکھنوی

وہ کوہِ استقامت ٹوٹ کر بکھرا
وہ سورج کے ہوئے ٹکڑے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
جو قطرہ قطرہ موجیں مارتا پیاسی زمینوں پر برستا تھا
لہو کا وہ سمندر بہہ گیا طغیانیاں دے کر
یہ کیسی تشنگی، تشنہ لبی ہے
گھنا شاداب سا اک پیڑ جس کے سائے کی خوشبو
زمانے کو معطر کر رہی تھی
کاٹ ڈالا ہے
تمازت ہی تمازت ہے
یہ قتلِ اندرا گاندھی کئی منظر دکھاتا ہے
ہمیں کچھ یاد آتا ہے
جہاں اوتار پیکر اپنے سینوں میں چھپائے
نیکیوں کے راز لائے ہیں، ہزاروں زخم کھائے ہیں
جدھر دیکھو اُدھر بھیگے ہوئے مرجھائے سے چہرے
اُمنڈتے اشک آنکھوں میں، زباں خاموش لب ہیں
درد میں ڈوبی اگلتی ہے
فضا مغموم، بوجھل، نرم لہجوں میں
زمیں سے آسماں تک گونجتی ہے اور کہتی ہے۔
امر ہے اندرا گاندھی
امر ہے اندرا گاندھی

اندرا کا قتل اصل میں بھارت کا قتل ہے!

خواجہ شوق

تہذیب و امن و خلق و مروت کا قتل ہے
انسانیت کا خون۔ شرافت کا قتل ہے
طوفاں شکن جسارت و ہمت کا قتل ہے
جمہوریت کی بولتی عظمت کا قتل ہے
تاریخ ساز دورِ قیادت کا قتل ہے
اندرا کا قتل، اصل میں بھارت کا قتل ہے

جگا دیا بہ عزمِ جواں ملک و قوم کو
سمجھایا منزلوں کا نشاں ملک و قوم کو
بخشا مزاجِ دیدہ وراں ملک و قوم کو
پہنچا دیا کہاں سے کہاں ملک و قوم کو
بیدارئ شعورِ سیاست کا قتل ہے
اندرا کا قتل اصل میں بھارت کا قتل ہے

تھے شب چراغ جس کے ہمالائی حوصلے
اپنے نکالے حسنِ تدبر سے راستے
دشمن بھی معترف رہے اس باکمال کے
سب کارنامے اہلِ جہاں دیکھتے رہے
وقت آشنا نگاہِ بصیرت کا قتل ہے
اندرا کا قتل اصل میں بھارت کا قتل ہے

بھارت کو مل سکے گا اب ایسا رہنما
نہرو کے بعد جس کو کہیں اوجِ ارتقا
ممکن نہیں کسی سے بھی پورا ہو یہ خلا
اندرا تھی ہند۔ ہند تھا اندرا بنا ہوا
یہ قتل ایک زندہ حقیقت کا قتل ہے
اندرا کا قتل، اصل میں بھارت کا قتل ہے

اے قائدِ عظیم تجھے آخری سلام
دنیا نے تجھ کو مان لیا رہبرِ عوام
تجھ کو مٹا دیا گیا، رستے سے لا کلام
لیکن مٹا سکیں گے نہ دل سے ترا مقام
بیٹی کا ماں کا بہن کا عورت کا قتل ہے
اندرا کا قتل، اصل میں بھارت کا قتل ہے

(منصف حیدرآباد ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

امر شہید

ساحر ہوشیارپوری

ایک رانی کے دو محافظ تھے
ایک "بے انت" بے وفائی ہیں
ایک "ست ونت" بے حیائی ہیں

دیش کے داغ، قوم کے غدار
بدنظر، بدلحاظ، بداطوار

بدرگ و بدقدم، وطن دشمن
بدسرشتی میں زاغ اور زغن

غیر سے نامہ و پیام کیے
زر کے بدلے ضمیر بیچ دیے

کام دونوں نے لامثال کیا!
خوب حقِ نمک حلال کیا!

اپنی رانی کو مار دی گولی
دھوم سے کھیلی خون کی ہولی

امن کے دشمنوں کی عید ہوئی
اندرا اماں امر شہید ہوئی
اندرا اماں امر شہید ہوئی!

آہ! اندرا گاندھی

سعادت نظیر

آہ کن آنکھوں سے دیکھوں یہ قیامت کا سماں
جیسے سورج چھپ گیا تاریکیوں کے درمیاں
سوزِ غم کا ہے یہ عالم دل سے اٹھتا ہے دھواں
غرقِ ظلمت کیوں نہ ہو جائیں زمین و آسماں

راہِ ہستی میں خدا جانے یہ کیا موڑ آگیا
دوپہر کے وقت میں اندھیرا چھا گیا

قوم کا غم کون کھاتے، جب نہ ہو غم خوارِ قوم
کون پھر راہیں سجھاتے، جب نہ ہو سالارِ قوم
سروری ہو کس کو زیبا، جب نہ ہو سردارِ قوم
رہ گئی تعمیر، رخصت ہو گئی معمارِ قوم

غنچہ و گل پر سیاست کے اداسی چھا گئی
گلشنِ فکر و نظر میں اک خزاں سی آ گئی

اے مجاہدؑ اے دیارِ آرزو کی پاسباں
اے پرستارِ وطن اے قائدِ امنِ جہاں
اے جواہر لال کی بیٹی، امیرِ کارواں
تھی تری سیاسی فطرت موشگاف و نکتہ داں

ہے لہو، تیرا بھی شامل ہند کی تصویر میں
روحِ عصری کارفرما تھی تری تدبیر میں

اندرا کی یاد میں

شاعر شہید

تم گئیں تو بزمِ عالم میں صفِ ماتم بچھی
وہ اندھیرا دن میں ہے شب کی سیاہی کچھ نہیں

اک قیامت ہم پہ ٹوٹی آج جس کے سامنے
ناگا ساکی ہیروشیما کی تباہی کچھ نہیں

ہر طرف ہے ہو کا عالم چپ زمین و آسماں
ایسا لگتا ہے کہ انساں مرغ و ماہی کچھ نہیں

ایک دن پہلے ہمیں اس بات کا کب تھا گماں
یک بیک رخصت ہوئیں ہم سے کہا بھی کچھ نہیں

لب کشا رہتی تھیں تم ہر مسئلہ پہ رات دن
آج یوں خاموش ہو جیسے ہوا ہی کچھ نہیں

سوچتا رہتا تھا باتیں کل جہاں کی جو دماغ
آج گرد و پیش کا اس کو پتہ بھی کچھ نہیں

اک بچی تھی جان وہ بھی آج دیدی دیش پر
تم نے دیں قربانیاں جن کا صلہ ہی کچھ نہیں

تم غریبوں کی مسیحا بے کسوں کی آسرا
موت سے بہتر تو نیکی کی جزا بھی کچھ نہیں

(آفتاب جدید ۲ رنومبر ۱۹۸۴ء)

قتلِ اعتماد

شمیم شہزاد

زمیں کا سینہ شق ہوا اور آسمان لرز اٹھا
لہر لہر تڑپ اٹھی شجر شجر سہم اٹھے
فضائے زندگی ردائے ماتمی کو اوڑھ کر
سراپا حزن بن گئی سراپا درد بن گئی

نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے یہ جھوٹ ہے یہ سچ نہیں
یہ سر بسر مذاق ہے یہ سچ نہیں یہ جھوٹ ہے
مجھے نہ آزماؤ تم یوں کشمکش میں ڈال کے
نہ کشمکش میں ڈال کے یوں امتحان لو مرا
مرے خلوص کا مری عقیدتوں کا امتحاں
نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے یہ جھوٹ ہے یہ سچ نہیں
یہ سر بسر مذاق ہے یہ سچ نہیں یہ جھوٹ ہے
بھلا خود اپنی ماں پہ کوئی وار کر بھی سکتا ہے!
لہو بہا بھی سکتا ہے کہ قتل کر بھی سکتا ہے!
نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے یہ جھوٹ ہے یہ سچ نہیں
ارے تمہاری آنکھ سے یہ اشک کیوں ابل پڑے
تمہاری آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہے کیوں!
کہو کہو کہ چپ ہو کیوں جواب دو جواب دو!
ارے تو کیا یہ سچ ہے سچ اگر ہے سچ تو جان لو
یہ قتل اعتماد ہے یہ خون اعتبار ہے!

زمیں کا سینہ شق ہوا اور آسمان لرز اٹھا
لہر لہر تڑپ اٹھی شجر شجر سہم اٹھے
فضائے زندگی ردائے ماتمی کو اوڑھ کر
سراپا حزن بن گئی سراپا درد بن گئی

(اشتراک ۲۴ رنومبر ۱۹۸۴ء)

لہو کا چراغ

ظہیر ناشاد دربھنگوی

اے مورخ اُٹھا قلم اپنا
داستاں لکھ لہو سے اب اس کی
زندگی عہد ساز تھی جس کی
اہلِ گیتی کو ناز تھا جس پر
نام جس کا مدبروں میں تھا
جس کے سینے میں پیار ماں کا تھا
اس صدی کی عظیم رہبر تھی
شانتی، امن اور جرأت کی
راہ جس نے دکھائی دُنیا کو
ذہن میں جس کے مسکراتا تھا
خواب تھا اک حسین دُنیا کا
جس کی اُلجھی ہوئی سیاست کا
ذکر تھا محفلِ سیاست میں
عزم و ہمت کی جو ہمالہ تھی
تیرگی میں جو اک اُجالا تھی
مادرِ ہند کی وہ بیٹی تھی
سارے عالم کی وہ چہیتی تھی
اندرا روشنی کی دیوی تھی
روشنی قتل ہو نہیں سکتی
سنگ دل قاتلوں کی گولی سے
اے مورخ اُٹھا قلم اپنا
اس حقیقت کی ترجمانی کر
اندرا کے لہو کی بوندوں سے
آ رہی ہے یہی صدا پیہم
وقت کو روشنی مُبارک ہو
وقت کو روشنی مُبارک ہو

(آج کل نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۴)

کویتا کی موت

عبدالمتین نیاز

بہت دن سے اس فکر میں تھا پریشاں
کہ تیرے لیے اک کویتا لکھوں گا
کویتا کہ جس میں ترے روپ جھلکیں
تری آرزوؤں کے سب رنگ چھلکیں
بنے تیرے خوابوں کی تصویر جس میں
تری حکمتوں کی ہو تنویر جس میں
کیا ہے جو بھارت کی خاطر وہ سب ہو
سہا ہے جو خدمت کی خاطر وہ سب ہو
ترے کارناموں کے قصے سناتے
کویتا، تری شخصیت میں سماتے
میں لکھوں کہ تو امن کی روشنی ہے
اس عالم میں انسانیت کی ہنسی ہے
ترا جو اثر تینوں دنیاؤں پر ہے
نو دانشوروں کی تجھی پر نظر ہے
نئے ہند کی ایک خالق ہے تو بھی
کہ جاں ملک و ملت کی ہے، آبرو بھی
صد افسوس لیکن، میں کچھ لکھ نہ پایا
لہو تیرا کچھ وحشیوں نے بہایا
بنا زخم ہر لفظ، روئی کویتا
پھر اشکوں میں میں نے ڈبوئی کویتا
کہ تیرا لہو سب کی آنکھوں سے ٹپکا
الم کا ہر اک دل میں شعلہ سا لپکا
گئی تو بھی باپو کے نقشِ قدم پر
کہیں شعر کیا، اندرا تیرے غم پر
کویتا بھی چپ، لفظ بھی بے صدا ہے
سخن غم کے آزار میں مبتلا ہے

ایک عہد کا قتل

کرشن بہاری نورؔ

(قومی تنظیم۔ پٹنہ ۱۰؍ نومبر ۸۴ء)



یہ کیسا شور ہے خاموشیوں کا ہر جانب
یہ کیسا چھا گیا سناٹا ساری دنیا پر
اداس ہو گئی ہنستے ہوتے دلوں کی فضاء
یہ کیسا دکھ ہے جو ذہنوں کو کر گیا ماؤف
یہ روشنی میں اُجالے کو قید کس نے کیا
یہ کس یقین نے کیا آج اعتماد کا خون
یہ کس نے اپنی تمناؤں کی پرستش میں
سکوں کو ظلم کی جھوٹ پہ کر دیا قرباں
یہ انتقام کا جذبہ نہیں تھا سازش تھی
یہ تیر وہ تھا جو اک دستِ غیب سے چھوٹا
بھلا نہ پائے گی تاریخ اس کو صدیوں تک
یہ ایک فرد نہیں ہے یہ ایک عہد کا قتل

وہ عہد جس نے ترقی کے طے کئے زینے
وہ عہد جس نے مقدر سنوارے انساں کے
وہ عہد جس نے سلیقہ حیات کا بخشا
وہ عہد جس نے کئی خواب کر دیئے پورے
وہ عہد جس نے ہمیں سربلندیاں دی ہیں
وہ عہد جس نے دکھوں کا سراوا ڈھونڈ لیا
وہ عہد جس نے اہنسا کی راہ کی ہموار
وہ عہد جس نے کئی مسئلوں کو سلجھایا
وہ عہد جس کی طرف تھی نگاہ دنیا کی
وہ عہد جس کی روش پر ہے فخر ماضی کو
وہ عہد جس کے اشاروں کا منتظر تھا حال
وہ عہد جس میں چمکنے لگا تھا مستقبل

چراغ بجھ کے غرور ہوا کو توڑ گیا
وہ اپنی روشنی اپنے دھوئیں میں چھوڑ گیا

کرن کلیانی

"تمہارے نام میری آخری وصیت ہے"

سا ہے پرکھوں سے دھرتی کا تن گلشن کے لئے
ہ ہیں خاک میں گُلِ محبت چمن کے لئے
ھیرے خواب کی تعبیر مل گئی مجھ کو
ں خوش نصیب کہ میں مٹ گئی وطن کے لئے

ے التجا ہے میری دیش واسیو! تم سے
مارے نام میری آخری وصیت ہے
ہاں میں خون خرابے سے کچھ نہیں ملتا
وں کو فتح جو کرتی ہے وہ محبت ہے

ہوں فرقہ پرستی کے داغ دھو ڈالو
چل کے خنجر کو نفرت کے بھوت کو مارو
خلوص، پیار، مروت کی تمام کر دار
تم کے سانپ، عداوت کے بھوت کو مارو

جگا کے روح کے آنگن میں دوستی کے چراغ
دلوں سے ظلم کا احساس تم فنا کر دو
وہ پیاس، جس سے جھلستا ہے آدمی کا بدن
لہو بہانے کی وہ "پیاس" تم فنا کر دو

بچاؤ دیش، غریبی کے ناگ، اجگر سے
مٹا کے ساری کدورت، قدم ملا کے چلو
پڑوسیوں سے اُلجھنا بھی ٹھیک بات نہیں
کوئی جو پیار سے آئے تو بڑھ کے ملو

کسی کے دھرم کو، مذہب کو مت بُرا بولو
کسی کا دل نہ دُکھاؤ کبھی، مرے بچو
چھپیں گرودوارے کے ناروں کی پھونک دو لیکن
"خدا کا گھر" نا جلاؤ کبھی، مرے بچو

جو دُکھ بھرے ہیں زمانے میں ان گِنت لوگو!
انہیں تم اپنے مقدر کی کچھ خوشی دے دو
وہ تھک کے بیٹھے ہیں ظلمت کدوں کے صحرا میں
تم اُن کی چھوٹی سی کٹیا کو روشنی دے دو

یہ رنگ و نور، نظارے، سبھی تمہارے لئے
زمیں تمہاری ہے، یہ آسمان تمہارا ہے
بس ایک بات، جو آپس میں اتحاد اگر
گرہ میں باندھ لو، سارا جہاں تمہارا ہے

میں یاد بن کے رہوں گی تمہارے بیچ مگر
کسی ڈگر پہ بھی محنت کی بات مت بھولو
مری چتا کی، مری راکھ کی تمہیں سوگند
دکھائی میں نے جو راہِ نجات مت بھولو

بچھڑ کے تم سے مری آتما دکھی ہے بہت
مگر ہے ریت یہی، ہمدمو، خدا حافظ
میں جا رہی ہوں کہ منزل بلا رہی ہے مجھے
مرے عزیزو! مرے ساتھیو! خدا حافظ



(شمع دسمبر ۱۹۸۳ء)

سورج ہے لہو تیرا

(مادرِ عالم اندرا شہید کے نام)

مجروح سلطانپوری

گردش میں ہے قرنوں سے یہی خون کہ جس سے
نشّہ ہے برہمن کا مسلماں کا وضو ہے
ٹپکا ہے وہی آج ترے پاک بدن سے
قاتل یہ سمجھتا ہے کہ یہ تیرا لہو ہے

داغ اس کا چھپائے نہ چھپے لوحِ جبیں سے
شعلے میں لپٹ کر تہہِ خاک دبائیں
نیزے پہ شقاوت کے اچھالا ہے جب اس کو
تب اس کی ہر اک بوند سے آئی ہیں صدائیں

پھر میری نوا چرخ پہ روشن ہوتی آؤ
سورج کو بجھا سکتے ہو لوگو تو بجھاؤ

جب یوں ہے تو اے ماں ترے فرزند سلامت
چُن کر یہ تری خاک سے سب پھول وطن کے
اس طرح بکھیریں گے سرِ عرصۂ عالم
موسم ہی بدل جائیں گے سب تیغ و کفن کے

تو چین سے سو جا کہ ہمیں اس کی خبر ہے
پوشیدہ ترے بام کے پیچھے بھی ہے کوئی
قاتل کے اُٹھے ہاتھ پہ سایہ ہے کسی کا
سایہ یہی کہتا ہے کہ پیچھے بھی ہے کوئی

کوئی بھی ہو کیا غم ہے کہ اے مادرِ عالم
ہم لے کے اٹھیں گے تری آواز کا پرچم

(نیا دور لکھنؤ جنوری، مارچ ۸۵)

اندراجی کی یاد میں

منور رانا

تصور میں ہمارے گاندھی و نہرو نہیں آئے
تمہارے نام کو یہ ہونٹ جب تک چھو نہیں آئے
تمہارے بعد دلی شہر ایسے پھول جیسا ہے
کہ جس میں حسن تو موجود ہے خوشبو نہیں آئے
دکھوں کی آندھیاں چلنے کو یوں چلتی رہیں لیکن
ترے چہرے پہ اُڑ کر عمر بھر گیسو نہیں آئے
بہن کے پیار ماں کی ممتا کو کون بھولے گا
یہ ممکن ہی نہیں ہے یاد ہم کو تو نہیں آئے
یہ کس کی یاد میں صحرا سے چشمے پھوٹ نکلے ہیں
وہ آنکھیں رو پڑیں جن میں کبھی آنسو نہیں آئے

(قومی تنظیم ۱۰ نومبر ۸۴)

صفحۂ ماتم

محترمہ اندرا گاندھی

(وفات ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ہے یہ ان کی زندگی کے روگ کا کوئی علاج
ابتدا ہی سے ہے شاید شہر والوں کا مزاج
اپنے اعلیٰ آدمی کو قتل کرنے کا رواج
مارنے کے بعد اس کو دیر تک روتے ہیں وہ
اپنے کردہ جرم سے ایسے رہا ہوتے ہیں وہ

منیر نیازی

(شب خون ۱۹۸۵ء)

بیادِ اندرا گاندھی

نسیم بھوپالی

زندگی انساں کی ہے ناپائیدار و بے ثبات
قوم کی خدمت میں مرجانا ہی ہے اصلِ حیات
ہر طرف چھائی ہوئی ہے درد و غم کی بے بسی
ختم ہو کر رہ گئی ہے اجتماعی زندگی
اپنے غم سے سارے عالم کو درخشاں کر دیا
تو نے مر کر اور بھی خود کو نمایاں کر دیا
منزلت حاصل تھی ایسی عظمتِ سرمد تجھے
ہے مناسب ہم جو کہدیں قوم کی مادر تجھے
ہمنوائی میں قدم تیری اٹھا سکتا تھا کون
تیری گردِ راہ منزل کو بھی پا سکتا تھا کون
تو نے بدلا جس یقیں سے ملک کی تصویر کو
مدتوں رو دیں گے اہلِ دل تری تعمیر کو
کس قدر مقبول تھی تیرے عمل کی ہر ادا
اہلِ یورپ کو بنایا تو نے اپنا ہمنوا
حلقۂ فکر و نگاہ و پیکرِ پندار و جوش
با مروت، اہلِ جرأت، صاحبِ کردار و ہوش
بات کرتا کیا مقابل، کس کے بس کی بات تھی
تو کھڑی تھی جس جگہ تنہا وہ تیری ذات تھی
عام تھا اہلِ وطن پر فیضِ میخانہ ترا
رہتی دنیا تک رہے گا لب پہ افسانہ ترا
ختم کرتا ہوں نسیمؔ اس کی یہیں پر داستاں
جس کے غم میں رو رہی ہے گردشِ دورِ جہاں

شناخت

نظمی سکندرآبادی

چاہ میں یوسفِ کنعاں کو گرانے والے
تختۂ دار پہ عیسیٰ کو چڑھانے والے
خون لنکن کا تعصب سے بہانے والے
موت کی نیند کنیڈی کو سلانے والے
تشنگی خون سے باپو کے بجھانے والے
راہ سے اپنی لیاقت کو ہٹانے والے
مارنے والے ہر اک عیسیٰ نفس کو بڑھ کر
گولیاں اندرا گاندھی پہ چلانے والے

ایک ہی نسل سے ہیں اور بشر کی صورت
ہر طرف آج بھی آباد یہ ہرجائی ہیں
یہ نہ ہندو نہ مسلماں نہ یہودی ہیں نہ سکھ
پارسی ہیں نہ بدھسٹ نہ عیسائی ہیں
بزمِ امکاں میں کوئی دھرم نہیں ہے ان کا
یہ سبھی کار اندھیروں کے تمنائی ہیں

واقعہ یہ ہے کہ اس بھیڑ میں انسانوں کی
اندرا گاندھی نے پہچان لیا تھا اُن کو

نذیر بنارسی

اس کا لہو دیش کی رگ رگ میں رواں ہے

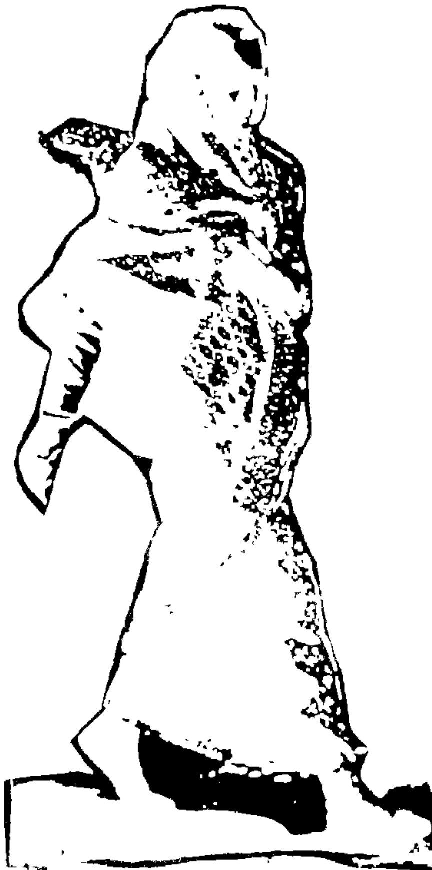
شان اُس کی ہمالہ کی بلندی سے عیاں ہے
سمٹے تو وہ اک شمع ہے جو پھیلے تو جہاں ہے
جس شمع نے پروانوں کو دی زندگی تو
پروانے تو موجود ہیں وہ شمع کہاں ہے
پیغام کوئی اس کا بکا ہے نہ رُکے گا
وہ چپ سہی تاریخ کے منہ میں تو زباں ہے
کل تک تو لہو اس کا تھا اس کے ہی بدن میں
اب اس کا لہو دیش کی رگ رگ میں رواں ہے
جو گولیاں کھا کھا کے سرِ راہ گری تھی
کتنوں کے لیے آج وہ منزل کا نشاں ہے
وہ کیسی گھنی چھاؤں ہمیں دے کے گئی ہے
آج اس کا لگایا ہوا ہر پیڑ جواں ہے
وہ اپنا جواں لال جسے سونپ گئی ہے
وہ تا قلزاب اور بھی تیزی سے رواں ہے
نازاں ہیں نذیر اس پہ خواتینِ زمانہ
وہ ہند کی عورت ہے جو خاتونِ جہاں ہے
ہم سوختہ سامانوں کا غم سب پہ عیاں ہے
بھارت میں چتا جلتی ہے دنیا میں دھواں ہے

اِتنی جاگی فکرِ وطن میں
سوگئی جاکر شانتی بن میں

اس طرح سے گذر گیا ہے کوئی
جیسے ہر گھر میں مر گیا ہے کوئی

بیس سورج کی دیوی

اندرا گاندھی



آج پھر نیم وحشی انساں نے
آج پھر دشمنِ گلستاں نے
رنگ و بو و وقار لوٹ لیا
حسن و درد بہار لوٹ لیا

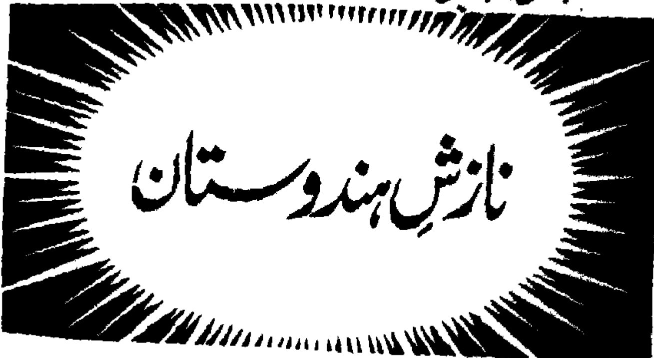
برگ بے رنگ، خار آزردہ
غنچے نمناک، پھول پژمردہ
سرنگوں شاخیں، مضمحل پودے
بے ثمر پیڑ، پر تپش سائے
جھاڑیاں مضطرب، روش ویراں
صحن سر سبز، ترجمان خزاں
کنج بے کیف، گوشہ گوشہ اُداس
ذرہ ذرہ اسیر حسرت و یاس
ایک اک پنکھڑی ہے دیدۂ غم
اشکِ سوزاں ہیں قطرۂ شبنم
بادِ صرصر بنی ہے بادِ صبا
بادِ غم سے گراں ہے ساری فضا
ابرِ باراں ہے آج شعلہ فشاں
مثل خوں موجزن ہے آب رواں
باغ کا کچھ عجیب عالم ہے
اُس شہید چمن کا ماتم ہے
جس نے تا عمر زندگی بخشی
زندگی دے کے زندگی بخشی

موسم گُل کی جو پیمبر تھی
مُلک کی بے مثال رہبر تھی
بیس سورج جو لے کے آئی تھی
اِندرا ایک ایسی دیوی تھی

واحد پریمی


مضامین

اجمل اجملی



تو نازش بھی چلے گئے۔

نازش جتنے بڑے شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اُردو کے محتاط مفتیانِ ادب ان کے شاعرانہ مقام کے سلسلے میں عظیم کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کریں لیکن نازش کو جس نے بھی دیکھا ہے، برتا ہے ان سے ملا جلا ہے ان کے ساتھ رہا ہے یا ان کی صحبت میں کچھ خوبصورت لمحے گزارے ہیں وہ بلا تامل یہ کہے گا کہ اُردو دنیا عصرِ حاضر کے ایک قدآور شاعر سے نازش کی موت کے ساتھ یقیناً محروم ہوئی ہے لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آج کے تجارت بستہ ماحول میں جب اعلیٰ قدریں روبہ زوال ہیں اور دیکھتے دیکھتے معدوم ہوتی جا رہی ہیں، انسانیت نے ایک عظیم سچے اور کھرے انسان کو کھو دیا ہے۔

اور یہ تھا ایک عظیم سچا اور کھرا انسان میرا دوست نازش پرتاپ گڑھی۔ جو ساری زندگی اپنے کاندھے پر حالات اور مسائل کی صلیب اٹھائے ہمت، بہادری، خلوص اور لگن کے ساتھ زندگی کے اُن راستوں پر چلتا رہا جن کا انتخاب خود اُس نے کیا تھا اور پھر ایک صبح بلرام پور کے ہسپتال میں اس صلیب کی بزم سجا کر زندگی اور اس کی اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین قدروں کا نام لیتا ہوا قربان ہو گیا۔ اور جاتے جاتے دُنیا کو یہ پیغام بھی دیتا گیا کہ میرے بعد میری صلیب کو دفن کر دینا تاکہ پھر کسی نازش کو اس قربان گاہ کی بھینٹ نہ ہونا پڑے۔

نہیں نازش نہیں زندگی کی یہ صلیب آج کے ہر انسان کا مقدر ہے اور ابھی ادیبوں اور شاعروں، دانشوروں اور عام انسانوں، عظیم سچے اور کھرے آدمیوں کی کئی نسلوں کو یہ صلیب اپنے کاندھوں پر ڈھونی پڑے گی۔ تب جا کر کہیں رات کا اندھیرا چھٹےگا اور اس صبح کی روشنیاں بکھریں گی جس کا خواب ہم دیکھتے رہے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں اور ہمارا یہ دور دیکھ رہا ہے تاکہ آنے والی دنیا

ایک ایسی دُنیا بن سکے جس میں ہر شریف آدمی ہر سطح پر شرافت مسرت اور طمانیت کے ساتھ زندہ رہ سکے۔

نازش نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا "آگ کھاتا ہوں تو انگارے اگلتا ہوں میں" یہ ایک طرح سے اپنی شاعری پر ـــــــــ اُس کا بھرپور تبصرہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نازش زندگی بھر آگ کھاتا رہا اور انگارے اگلتا رہا لیکن اس لیے نہیں کہ یہ اس کی عادتِ ثانیہ تھی بلکہ اس لیے کہ زمانے نے اسے آگ کھانے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ ان پیشہ ور ادیبوں اور شاعروں میں نہ تھا جو زندگی کی دہکتی جھلستی اور جھلساتی ہوئی دھوپ کو نرم نرم چھاؤں بنا کر پیش کرتے ہیں جب وہ اپنی ارد گرد کی دُنیا میں بکھری ہوئی نفرت، دشمنی، بغض و حسد تعصب بربریت، تشدد، وحشت اور دوسرے انسانیت سوز مظاہر دیکھتا تھا تو وہ ان سے آنکھیں چرا کر شاہراہِ عام سے ہٹ کر ہر شہر ہر قصبے ہر گاؤں اور ہر گھر میں لگی ہوئی اس آگ سے کترا کر گزر نہیں جاتا تھا بلکہ یہ ساری آگ جو اپنوں نے بھی لگائی تھی اور دوسروں نے بھی، اپنے سینے میں سمیٹتا بڑھتا رہا اور جب شہر میں آگ سلگ رہی ہو جب جذبات میں حشر برپا ہو اور جب قدم قدم پر یہ احساس شدت کے ساتھ ہو رہا ہو کہ حالات کا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے تو نازش پھول کیسے بکھیر سکتا تھا۔ سچا آدمی تھا اور سچا دانشور تھا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ نازش جیسے لوگ ہماری اس دُنیا کے لیے قطعی موزوں نہیں، یہ سمجھوتوں کی دُنیا ہے۔ بکنے اور خریدنے کی دنیا ہے۔ مصلحتوں کی دُنیا ہے اور جس میں بچے رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اپنے آپ کو آگ اور کیچڑ سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسروں پر کیچڑ اُچھالا جائے۔ نازش کو اور سارے ہنر بھلے ہی آتے ہوں لیکن یہ ہنر کبھی نہیں آیا اور اسی لیے نازش ہماری اس دنیا میں کبھی وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا، نہ عام زندگی میں نہ ادب کی سطح پر۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بڑے مشاعرے میں نازش نے انتہائی تلخ لہجے میں ایک ایسے شاعر کو مخاطب کر کے ایک شعر پڑھا تھا جس کی عظیم الشان قربانیاں ایک زمانے تک نازش اور اس نسل کے ہم سبھی شاعروں اور ادیبوں کے لیے سرچشمۂ فیضان تھیں۔ نازش نے جو شعر پڑھا تھا وہ یہ ہے۔

حیراں کھڑے ہیں مصلحتِ وقت کے حضور
کیوں اے جنوں اسی لیے نکلے تھے گھر سے ہم

اور پھر دوسرے شعر میں نہ صرف انھیں بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہر زبان ہر خطے اور ہر مکتبہ خیال کے شاعروں اور ادیبوں کو قربانی اور جہاد کا یہ پیغام دیا تھا ؎

آؤ دیارِ دار سے ہو کر نکل چلیں
سنتے ہیں اس طرف سے مسافت رہے گی کم

نازش کے بعد بچے رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ابھی نازش اور زندگی کا یہ قرض ادا کرنا ہے۔

نازش کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے کبھی مصلحتِ وقت کا پاس و لحاظ نہیں کیا۔ بیرونی سامراج سے لڑنے والا نازش تحریک آزادی کے حسین پرچم کی چھاؤں میں انگریزوں سے پنجہ آزمائی کرتا رہا۔ آزادی کے بعد جب اس نے یہ دیکھا کہ جن آدرشوں کو لے کر آزادی کی جنگ لڑی گئی انھیں خود وہ لوگ پامال کر رہے ہیں جو آزادی کی لڑائی میں اس کے شانہ بشانہ معروف جہاد رہے تھے تو اس نے اپنے ساتھیوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کر دیا حالانکہ اگر نازش نے مصلحت پسندی سے کام لیا ہوتا تو ایوانِ حکومت کی بلندیوں تک اس کی رسائی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر نہیں نازش نے مصلحت کے مقابلہ میں اپنے دل اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ پرتاپ گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر صبح سے شام تک سردیوں میں قیامت کی سردی اور گرمیوں میں برستی ہوئی آگ کے درمیان زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔ بیڑ اور خس کی ٹٹیوں سے گرم سرد محلوں اور ایوانوں میں چور دروازوں سے داخلہ کو نہیں۔ مالی مدد کے لیے حکومت کے سید دولت پر دستک دینے کے بجائے اس نے اپنے زور بازو کے بل پر بھلی یا بُری زندگی گزاری اور چھوٹی چھوٹی مسرتیں حاصل کرتا اور اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے لوگوں میں بانٹتا رہا۔

پرتاپ گڑھ الہ آباد سے بہت قریب ہے یوں بھی نازش کے ساتھ میں ہمیشہ ذہنی اور جذباتی وابستگی محسوس کرتا رہا ہوں اس لیے بار بار ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں کبھی الہ آباد میں میرے گھر پر کبھی پرتاپ گڑھ میں کبھی فیض آباد میں حکیم ابن کے یہاں تو کبھی بستی میں شفیق بھائی کے یہاں رائے بریلی میں کاظم، کیلاش ماہر اور چرن سرن ناز کے یہاں تو لکھنؤ میں رضیہ آپا کے یہاں۔ اور ہر جگہ مجھے یہی لگتا کہ جیسے یہ نازش کا گھر ہو جیسے میزبانی کے سارے حقوق نازش نے صرف اپنے لیے سمیٹ لیے ہوں۔ مہمان بننا اور دوسروں سے اپنی خاطر کرانا نازش کو آتا ہی نہ تھا۔ مشاعروں میں چھٹ بھیئے شاعر طمطراق کے ساتھ آتے جیسے شاعرے میں شرکت کر کے وہ انتظام کاروں پر

رہی نہیں بلکہ سامعین پر بھی بہت بڑا احسان کر رہے ہیں نازش ہمیشہ چپکے سے آکر ایک کونے میں بیٹھ رہتے۔ قلندرانہ شان کے ساتھ جیب سے بیڑی یا سگریٹ نکال کر مستقل پیتے رہتے اور جب پڑھنے کھڑے ہوتے تو اسٹیج پر بیٹھے شاعروں سے کہیں زیادہ سامعین کا حصّہ بن جاتے در اصل نازش نے کبھی عوام سے ہندوستان کی جنتا سے اپنے کو الگ نہیں سمجھا۔ غرور اور نخوت کی فلک بوس چوٹیوں پر کھڑے ہو کر دوسروں پر حقارت کے کوڑے برسانا اور پیمبرانہ شان کے ساتھ دوسروں کو پیغام دینا نازش کا وطیرہ نہیں تھا۔ کہ ان سب باتوں کے لیے جس ریاکاری کی ضرورت ہوتی ہے نازش ان سے یکسر محروم تھے۔ اتنی صاف شفاف شخصیت کہ بلور کی طرح آرپار نظر آئے اور یہ اس کھلی ہوئی شخصیت ہی کا وصف تھا کہ نازش کے سامنے مخالف کا سر بھی جھک جاتا تھا۔

غالباً مخالف کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا ہے نازش کے پاس تھا ہی کیا کہ مخالفت کا موضوع بنتا جس آدمی کے پاس صرف خلوص اور محبت کی دولت رہی ہو اور جس کے بانٹنے کے معاملے میں اس نے کبھی کسی طرح کنجوسی نہ برتی ہو اس کا مخالف بننے کے لیے بھی بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے یہاں حاسدوں کی کمی نہ تھی اور ایسے لوگ اس کے شہر پرتاپ گڑھ میں بھی تھے اور پرتاپ گڑھ سے باہر بھی ان کی کمی نہ تھی۔ کبھی کہا جاتا کہ نازش کے شعور میں کچا پن ہے کبھی کہا جاتا کہ نازش فن کی باریکیوں پر قدرت نہیں رکھتے کبھی بتایا جاتا کہ وہ دوسروں کے خیالات نظم کرنے کے ماہر ہیں ان کے یہاں اپنا کچھ نہیں اور عام طور پر یہ باتیں ایسے لوگ کرتے ہیں جن کا تعارف شعور کی شَے سے بھی نہ تھا پختگی اور کچاپن تو دور کی بات ہے۔ مگر نازش پر ان سب باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا ہر انسان کے لیے اس کے دروازے کھلے ہوتے تھے اور ابھی ہم جیسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ نازش نے خود سے حسد رکھنے والے لوگوں پر بھی کیا کیا احسانات کیے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ کم سے کم ایسے آدھے درجن شاعر تو خود میری نظر میں ہیں جنکی روزی روٹی نازش کے زور قلم کا نتیجہ تھی۔ آج مجھے ایک دُکھ یہ بھی ہے کہ نازش کی موت نے ان بے چاروں کو روزی روٹی سے محروم کر دیا کیونکہ ہماری اس دنیا میں نازش جیسے بہت کم لوگ ہیں جو اپنا کلام محض یہ سوچ کر دوسروں میں بانٹ دیں کہ چلو شاعروں میں گا کر یہ بے چارہ کچھ پیسے کمائے گا۔ جہاں تک نازش کے شعور کی بات ہے تو اس کا اظہار ان کی نظموں میں بھی ہوتا ہے اور غزلوں میں بھی اور ان تحریروں میں بھی جن کے ذریعے وقتاً فوقتاً نازش اپنی بات دوسروں تک پہنچایا کرتے تھے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے ایمرجنسی سے کچھ پہلے کا زمانہ اور سنجے گردی

ادورِ شباب تھا۔ تبھی اربابِ اقتدار کو خیال آیا کہ شاعروں اور ادیبوں کو بھی ڈھکڑا کر چلنے والی اس گاڑی میں ایک پُرزے کے طور پر جوڑا جائے چنانچہ یک آل انڈیا تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی جس میں بیشتر ایسے لوگ تھے جو ترقی پسند مصنفین پر محض اس لیے غیر شاعر اور غیر ادیب ہونے کی تہمت لگاتے رہتے تھے کہ وہ ایک تنظیم کا حصہ ہیں۔ بڑے بڑے جغادری جبہ سا اس تنظیم میں شامل ہو گئے اور ترقی پسندوں سے الگ رکھنے کے لیے اسے قوم پرست ادیبوں کا فورم کہا گیا۔ اس فورم کے تحت دلی میں ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی جس میں انتظام کاروں کے بقول صرف قوم پرست شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا اور بابو جگ جیون رام نے جو خیر سے اس وقت تک وزارت کی مسند پر برقرار تھے شال کے روپ میں شعرائے کرام کو خلعتیں عطا کیں نازش چونکہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے اس لیے انھیں بھی اس مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ سادہ لوح نازش دلی آگئے مشاعرے میں شریک بھی ہوئے لیکن جب انھوں نے جگمگوٹ دیکھا تو یہ تاڑ گئے کہ مقصد کیا ہے چنانچہ انھوں نے اسی اسٹیج سے یہ اعلان کیا کہ قوم پرستوں کا ایسا کوئی کل ہند اجتماع نہیں ہو سکتا جس سے ترقی پسندوں کو الگ رکھا جائے اور جس مشاعرے میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، غلام ربانی تاباں اور ایسے دوسرے قوم پرست شاعر محض ترقی پسند ہونے کے جرم میں نہ بلائے گئے ہوں اسے میں قوم پرستوں کا مشاعرہ نہیں کہہ سکتا اور اس کے بعد انتہائی بے باکی کے ساتھ اپنی مشہور نظم "قلم" سنائی۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی دلی سے واپسی پر انھوں نے ایک گشتی خط اخباروں کو بھیجا جس میں اس اجتماع اور اس تنظیم سے اپنی لاتعلقی اور ناوابستگی کا اعلان کیا۔ ہو سکتا ہے کہ نازش کی اس جرأت کو جذباتیت کہا جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا موقف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کے پاس اتنا شعور ہو کہ وہ صالح اور غیر صالح قوم پرستی کا نازک فرق محسوس کر سکے۔ نازش جانتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ صالح قوم پرستی بین الاقوامیت پسندی، سامراج دشمنی، استعماریت، جارحیت، نسل پرستی اور نسلی امتیاز کی مخالفت کے بغیر محض کھوکھلا نعرہ بن کر رہ جاتی ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ نازش کے سیاسی اور ادبی شعور پر کھل کر باتیں کروں لیکن بات بہت پھیل جائے گی ضرورت اس کی ہے کہ نازش کے بعد نازش کے اس ورثہ کا بھرپور جائزہ لیا جائے اور نازش کے ادبی اور سیاسی نظریات پر تفصیل کے ساتھ کام کیا جائے کیونکہ چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں البتہ چند نظموں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نازش

کی جو نظمیں خصوصی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں وہ ہیں زبان، قلم، اپنے بچّے کے لیے لوحہ۔ قوم پرست مسلمانوں کا المیہ اور ان کی طویل نظم زندگی سے زندگی کی طرف۔ کاش ہماری یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار جواب تک بلیشر گڑے مردے اکھاڑنے میں دلچسپی لیتے آتے ہیں، نازش کی ان نظموں کی طرف توجہ دیں اور ادب کا کوئی طالب علم نازش کے اس سرمائے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے جس کا دامن ۴۵-۱۹۴۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں نازش نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ انھوں نے سیماب اکبرآبادی کی شاگردی سے لے کر انقلاب تک کا سفر طے کیا ہے اور اس پورے زمانے میں وہ ہندوستان کی سیاست، ہندوستان کے سماجی و معاشی مسائل بدلتے ہوئے حالات اور کروٹیں لیتی ہوئی زندگی کے ہر موڑ پر اس کے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی حیثیت ایک ایسے آئینے کی ہے جس میں اس انتہائی بحرانی دور کی پوری تصویر اُبھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے۔

تو یہ تھے نازش۔ جو ایک عرصہ تک ہمارے ساتھ چلتے چلتے تھک گئے تھے جنھیں طرح طرح کی بیماریوں نے کھوکھلا کر دیا تھا اور جن سے پچھلی سبھی ملاقاتوں میں اس حادثہ کی آہٹیں محسوس ہونے لگی تھیں جس پر آج دنیا آنسو بہا رہی ہے۔ میں نازش کی موت پر غالب کی طرح آسمان سے یہ شکایت نہیں کروں گا کہ ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مجھے نازش کی بھرپور زندگی دیکھتے ہوئے کسی کمی یا تشنگی کا احساس نہیں ہوتا البتہ اگر کبھی خالق کائنات سے ملاقات ہوئی تو یہ ضرور پوچھوں گا کہ اگر تو نے ہماری دُنیا میں نازش جیسے سو پچاس انسان اور پیدا کر دیئے ہوتے تو تیرے کارخانۂ قدرت میں کیا کمی واقع ہو جاتی!

(چنگاری، دھلی ۱۹۸۴ء)

ظ۔ انصاری

ساغر نظامی

ساغر کو سلیقے سے تھامنے والے نسوانی ہاتھ تو کہیں ۳۵ برس بعد زندگی کی خلوت و جلوت میں شریک ہوئے لیکن خلوت و جلوت کا سلیقہ ساغر صاحب کو فطرت پہلے ہی عطا کر چکی تھی۔ زندگی سے منصفانہ اور جچا تلا برتاؤ اُنھوں نے کسی سے اگر سیکھا ہو گا تو اتنا ہی جتنا مچھلی کا بچہ تیرنا سیکھے۔

ساغر صاحب نے، جو گھر کے نام صمد یار خاں سے شروع ہوئے تھے علی گڑھ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں "سومنہ" میں اپنے بچپن کا ماحول بڑی للک سے بیان کیا ہے:

.... برگد کا وہ گھنا درخت، جس کا سایہ پجاریوں کے لیے آرام گاہ تھا اپنی زمین میں نہیں، میرے دل میں ہے.... اس گھنے برگد کے سائے میں سیتلا دیوی کا مندر تھا، جہاں منگل کے منگل لوگ آتے اور پوجا پاٹ کر کے چلے جاتے۔ برگد کے پاس بڑی جھیل مجھے یاد ہے، جس میں سارس اپنی فاختئی شہپروں کو سکیڑے ہوئے اپنی مادہ سے آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتا اور میں اس کی باتیں اس طرح سنتا جیسے سن ہی تو رہا ہوں.... ان کھیتوں میں لال پیلی چوڑیاں کسے ناریاں ہنستی ہوئی نمودار ہوتیں۔ کولہوں پر گاگریں اُٹھائے، ہاتھوں میں گڑتیاں لیے وہ آتیں اور کیاریوں میں پانی دے کر کنویں پر لوٹ جاتیں۔ جاتے جاتے ان میں سے کوئی بے تحاشا ہنس پڑتی اور بے محابا مٹھی بھر موتی میرے منہ پر مار کر چلی جاتی اور میں دیکھتا رہ جاتا اور میں کچھ نہ سمجھ سکتا۔ مسجد میں بستی کے مسلمان آکر نماز پڑھتے اور جب باہر نکلتے تو ایک ٹھاکر اپنے شناسا سے پوچھتا۔ کچھ میرے لیے بھی خدا سے دُعا مانگی؟ مندر میں پوجا پاٹ کے بعد لوگ باہر آتے تو ایک مسلمان بچے کو لیے کھڑا ملتا۔ اجی اس بیمار بالک پر تو پھونکتے جاؤ.... اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ، جن میں غریب امیر، برہمن، ویش،

کھڑی، سبھی کے بچّے ہوتے۔ اسکول جاتا، جاتے جاتے باغ میں مولسری کا درخت مجھے
اپنے پھولوں کی نازک زنجیروں میں کس لیتا اور میں دیکھتا گھاس پر چاروں طرف
بے شمار پھول پڑے ہیں۔ بھول ہی پھول! اور میں سوچتا ان پھولوں کو چھوڑ کر اسکول
کیسے جاؤں ؟ ان سب کو میں کیوں نہ لوں ؟ اور میں وہ پھول اپنے روئی کے کوٹ کی
جیبوں میں بھر لیتا ۔۔۔۔

بچپن کا یہ منظر یا ان مناظر کا بچپن ہم سے بہت کچھ کہتا ہے۔ پھول، پنگھٹ، گھریلو خوش گواری کھنکتے قہقہوں اور دن رات کے ڈپڑھوں کے درمیان پلنے والے لڑکپن کو شاعری اختیار کرنے کے لیے اور کیا رہ جاتا ہے۔ طبیعت کی موزونی، احساس کی شدت اور قوّت مشاہدہ کی بیداری، سو یہ نعمت بھی ساغر صاحب کو اسی عمر سے نصیب تھی۔

پرائمری اسکول کے استاد پنڈت جی کے بارے میں ساغر بتاتے ہیں:

۔۔۔۔ وہ مجھے اپنے پاس بلاتے اور سب پھول جیبوں سے نکلوا لیتے اور لتنے پھول دیکھ
کر وہ مسکرا دیتے اور کہتے دیکھو کنول پانی میں اور پھول اپنی شاخ ہی پر بھلا لگتا ہے۔

انجانے میں کتابوں پر پھولوں کو ترجیح دینے والے نوخیز شاعر کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ ایک شگون ہے۔ اب وہ زندگی بھر کتابوں کی بجائے پھولوں سے اپنی گود بھرتے رہیں گے۔ اور رسمی تعلیم جس کا کوئی بدل نہیں اور جس کی کمی دور کرتے کرتے آدمی کا بھرکس نکل جاتا ہے۔ اس رسمی تعلیم سے ساغر اپنے وجود کی جیبیں بھرے بغیر گزر جائیں گے۔ اچھی صحبت، ذہن، آداب و اطوار پر سان رکھتی ہے، علم کی تشنگی بھی صیقل کرتی ہے، ساغر کو اچھی صحبت ملی یا یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے عمر و تجربہ کی منزلیں مارتے وقت اعلیٰ درجے کی اور اچھی صحبتیں اپنے لیے چنیں۔ اُن سے فیض اُٹھایا تاہم آداب و اطوار کے نباہنے میں اتنی فرصت زمانے نے نہ دی کہ وہ جی لگا کر گرد و پیش سے بے نیاز اور شبانہ نشستوں سے بے مروّت ہو کر علم کی تشنگی بجھاتے اور من بھاتے موضوعات پر اس طرح جم کر مطالعہ کر لیتے جس طرح بڑے فنکار کیا کرتے ہیں (شاعر اعظم جوش کی شاہی اسکول کا گریجویٹ ہمیشہ اس کا رونا رویا کرتا تھا کہ اس کی تعلیم ناقص رہ گئی ہے۔ دنیا بھر سے کتابیں منگا منگا کر مطالعے اور علمی آگاہی کے گڑھے بھرتا رہتا تھا۔)

ساغر اپنے گاؤں سے نکلے۔ چار قدم پر علی گڑھ کا ایم اے او کالج یونیورسٹی بنا تھا' اس کا ہائی اسکول تھا مگر وہ ادھر نہیں گئے۔ آس پاس کے مشاعروں میں جانے لگے۔ حسن نظامی دہلوی کا

اُن دنوں شہر و نُصرد و نزدیک تھا۔ ساغر نے انھیں سے نسبت پیدا کی۔ صمد یار خاں ایک خوش رو، خوش گلو، خوش کلام، خوش اندام، خوش لباس، نفاست پسند ہونہار شاعر کے حق میں چشتی صوفی کی شفقت بھی امرت ہوتی۔ اگر ان کے درمیان حضرت نظام الدین اور امیر خسرو کا سا رشتہ قائم ہو سکتا۔ مگر حسن نظامی ایک ڈیرہ دار صوفی خود نہایت مشقت پسند دنیا دار تھے۔ والیانِ ریاست اور امرائے خوش ذوق سے ان کا ربط ضبط رہتا تھا۔ وہیں تک ساغر کو بھی پہنچا دیا۔

تصدیق نہیں ہو سکی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد (وزیر اعظم ریاست حیدر آباد) سر سالار جنگ (حیدر آباد) نواب ٹونک (راجستھان) سروجنی نائیڈو کی ادب نواز محفلوں میں ساغر صاحب کی رسائی اسی راہ سے ہوئی ہوگی۔ پھر جب ایک بار آمد کامیاب رہی تو آمد و رفت کا سلسلہ چل نکلا اور ساغر رفتہ رفتہ ان صحبتوں کے رسیا ہوتے گئے۔

علی گڑھ سے آگرہ قریب تھا اور اس علاقے میں ایک ہی استاد (سیماب اکبر آبادی) ایسا تھا، جو بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں سے باخبر، موضوعات میں تازہ تر، شعر کے دھارے کو حالات کی طرف موڑ دینے کے لیے بے چین اور ادبی مشقت کو کُل وقتی باضابطہ پیشہ بنائے ہوئے اپنے ماہناموں اور شاگردوں کا حلقہ بڑھائے جا رہا تھا۔ یوپی کے مشاعروں میں شاگردوں کی پوری کھیپ لے کر اُترتا اور مشاعروں کی فضا بدل ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتا تھا، ساغر کو استاد نے چُنا یا اُستاد کو ساغر نے، لیکن ان کے حلقۂ ارادت میں آنے سے یہ ضرور ہوا کہ اُدھر کی بے نمکی نے ساغر کی لہک مہک سے تلافی پائی اور ساغر کی نہاردی کو سیماب کا پورا کارواں نصیب ہو گیا۔ جس مشاعرے میں دونوں جاتے، استاد کو احترام ملتا، شاگرد کو داد۔ استاد کا لوگ ادب کرتے، شاگرد پر پھول چڑھاتے۔ استاد کے بیٹے بھی شاعر تھے۔ مگر ساغر کے آگے بھلا کس کا طوطی بولتا۔ اُستاد ایک پُرگو، قادر الکلام، مگر نہایت محتاط اور ساتھ ہی بدانتظام، شاگرد اُچھلتی موج پر بہکنے والا، بے محابا چھکنے والا، قومی تحریکِ آزادی سے دونوں متاثر، دونوں ہم نوا، مگر زبان دونوں کی جُدا جدا۔ ساغر کی اُٹھان تھی، اسی نسبت سے جوش و خروش اور دل کشی بھی۔ سیماب اور ساغر کا ساتھ بہت عرصہ تک نہیں رہا۔ صرف ایک تعلقِ خاطر رہ گیا۔

ہندوستانی سیاست میں اور اسی کے ہم رکاب قومی بیداری میں ۲۰ ویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی بڑی فیصلہ کن گزری ہے۔ آج تک ہم اُن اٹھارہ انیس برسوں کے پھول اور کانٹے چن رہے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جب تہذیبی، مذہبی، سیاسی جلسوں میں قومی نظمیں سنائی جانے لگی تھیں اور

بڑے مشاعروں میں غزل کا بازار مندا ہو گیا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب مولانا صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، حفیظ جالندھری اور جوش کے ساتھ اُن کے جونیر روش صدیقی، احسان دانش اور ساغر نظامی موضوعاتی نظمیں بھرے عوامی جلسوں میں سناتے اور داد پاتے تھے۔ انہی لوگوں نے آئندہ کے ترقی پسندوں کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کے پاس گیت بھی تھے، رسیلی آواز بھی تھی، اور نئے زمانے کے شاعر کی حیثیت سے ایک امیج بن گیا تھا۔ اس امیج کے سبب اور کچھ اپنے اپنے لسانی مرکزوں کے ادبی اختلاف کے باعث ساغر اور حفیظ میں معاصرانہ بلکہ علاقہ وارانہ چشمک بھی رہنے لگی اور اس چقماق سے مشاعرے اور چمکنے لگے۔ ساغر کی شاعری کا دورِ شباب یہی ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں انھیں قومی رہنماؤں سے ملنے ملانے اور ان کی نظر میں چڑھنے کے موقعے ملے۔ قومی تحریک آزادی کے عام دھارے میں چونکہ مُلک کی سوشلسٹ کیونسٹ لہریں بھی ملی جُلی چل رہی تھیں۔ جوش، قبلۂ رندانِ جہاں، کہ اول تا آخر آزادہ رو اور آزادی پسند رہے۔ اسی دھارے میں ہوتے ہوائے کیمونزم کے نظریات سے لب تر کرنے لگے۔ مبہم سا عمومی سا اثر، جوش کے ساتھ ساغر کا دامن بھی رنگین کر گیا۔ ان دونوں میں فرق ہلکے اور گہرے رنگ کا نہیں، شخصیتوں کا، ذہنی رسائی کا اور تدبیر و بے تدبیری کا بھی تھا۔ ساغر قوم پرستانہ جے جے کاروں سے ہم آہنگ اور اس راہ پر ثابت قدم رہتے ہوئے بھی تدبیر سے کبھی غافل نہیں رہے۔ پاؤں رکاب میں تو ہاتھ باگ پر بھی ہوتے۔ ساحل پر سفینہ سلامت رکھنا ساغر کے سلیقے کا ہی ایک سلسلہ تھا۔ جوش و ساغر کے نام ساتھ ساتھ آنے کا اور یکے بعد دیگرے فلمی نگار خانے میں اُترنے کا یہ ایک ہی زمانہ ہے۔

ساغر نے مشاعروں سے جتنا فیض اٹھانا تھا، اٹھایا، مگر انھیں کافی کبھی نہ جانا۔ وہ اپنے ذہنی کس بل کو، انتظامی قابلیت کو، خیالات کی ترنگ کو ماہنامہ "ایشیا" کے صفحات پر جلوہ گر کرتے تھے اور پہلے میرٹھ میں پھر بمبئی میں، ساغر کے گھر سے نکلنے والا یہ ماہنامہ اپنے وقت کے نہایت کارگر اور ممتاز ادبی رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا اپنا ایک علمی و ادبی حلقہ بنا۔ میرٹھ میں مستقل یا عارضی سکونت رکھنے والے اہلِ علم و اہلِ قلم محمد یحییٰ، گوپی ناتھ تنہا، صفدر حسین، مقصود زاہدی، ابوالکاظم قیصر، اختر الایمان وغیرہ کسی نہ کسی حیثیت میں "ایشیا" کے شریک رہے۔ پرانی روش کے استاد شاگرد والے جو جمائے ادبی حلقے اس رسالے اور اس کے "عطائی" شاعر سے سخت برہم

تھے۔ جہاں موقع ملتا اس برہمی کا اظہار کر کے اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے۔

بے محل نہ ہوگا کہ اگر ہم میرٹھ کالج کے ایک سالانہ مشاعرے کا منظر یہیں لکھتے چلیں: ۱۹۲۹ کی سردی کا موسم ہے۔ اس پُرشور کالج کا سالانہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔ کالج کے اور شہر کے معززین اپنے بہترین لباس میں درجہ بدرجہ صف بہ صف جمے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں میں ایک کرسی بھی خالی نہیں۔ اسی کالج کے ایک منچلے اور محترم طالب علم ابوالقاسم قیصر سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور مشاعرہ باقاعدہ شروع ہونے تک اپنا کلام سنائیں۔ قیصر آتے ہیں۔ ترش خودداری کے لہجے میں اعلان کرتے ہیں کہ وہ خلا کو بھرنے کے کام نہیں آئیں گے۔ کلام نہیں سنائیں گے۔

انتظار اور اسی کے ساتھ نوجوان حاضرین کی بے چینی طول پکڑتی جا رہی ہے۔ سب کی نظریں بار بار گیٹ کی طرف اُٹھتی ہیں کہ اب اور تب وہ فورڈ کار احاطے میں داخل ہوا اور اس میں سے بہزآد لکھنوی نکلیں، یہ کار بہزآد کو لینے دہلی گئی تھی۔ بہزاد لکھنوی کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اختری بائی فیض آبادی (بعد کو بیگم اختر) کے گاتے ہوتے ریکارڈ گلی گلی بجتے۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

اور اس ریکارڈ کے ساتھ بہزاد کے عشق و جنون کے افسانے۔ ان افسانوں اور گانوں کے ساتھ نئے نئے آل انڈیا ریڈیو کے نعتیہ پروگرام، بہزآد ہی بہزآد۔ ان کی درد بھری آواز اور شیروانی میں دل کے مقام پر لٹکی سوتی ایک سفید دھجی کو بار بار کھینچنے کی دھج۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے!

میرٹھ کے اساتذہ برہم کہ یہ ایسا کہاں کا شاعر ہے۔ دو لخت مصرعے اور دم پخت استعارے لکھ کر ایسا اہم ہو گیا کہ وہ نہ آئے تو مشاعرے کی رسم ادا نہ ہو۔ خدا خدا کر کے وہ "حقیقتِ منتظر" لباسِ مجاز اور بہزاد میں آگئی اور مشاعرہ اس قیامت کی سردی میں گرم ہوا۔ سبھی شعر کہنے اور سنانے والے اس صورتِ حال سے جلے بھُنے بیٹھے تھے کہ ساغر صاحب کا نام پکارا گیا۔ آوازیں آئیں۔

.....جوانی لٹا دی۔

پٹ مندر کے کھول پجارن۔...

ساغر صاحب نے تازہ تازہ ایک نظم سنانی شروع کی ؎

آ۔۔۔میں تجھے تن من میں بسالوں اے بابنی کے باسی۔

ہم لوگ جو ساغر صاحب کے طلسم میں گرفتار تھے، ابھی داد نہ دینے پائے تھے کہ مجمع میں

اِدھر اُدھر سے پھر وہی آوازیں "جوانی لٹا دی" وغیرہ بلند ہوئیں۔ اب ان آوازوں میں تمسخر یا ہوٹنگ کا رنگ بھی تھا۔ ساغرؔ صاحب اکھڑ گئے۔ نظم روک دی۔ تن کر آستینیں چڑھانے لگے۔

"جن صاحب کی ہمت ہو، سامنے آئیں۔ میں نے پٹھانی کا دودھ پیا ہے۔" مجمع میں سناٹا ہو گیا۔ ہوٹنگ کی نیت رکھنے والے یقیناً پٹھانی کا دودھ پئے بغیر آتے تھے۔ پھر مشاعرہ چلا، ساغر چلے، خوب چلے اور آخر میں بہزاد چلے۔ وہی اس مشاعرے کا گل سرسبد تھے۔

جوشؔ اور ساغرؔ دونوں میں ایک صفتِ مشترک "پٹھانی کا دودھ" بھی تھا، جو کسی بے محل بات یا واقع پر ایسے وقت میں یاد آتا تھا، جب ہجانی دودھ کے دو چار جام خالی ہو چکے ہوں۔ جوشؔ تو سارے بدن سے تھرانے لگتے تھے۔ اور ساغرؔ آستینیں چڑھا کر شیروانی کے بٹن کھولنے بند کرنے لگتے تھے۔ حفیظؔ، فراقؔ، سلامؔ اور کس کس ہم مشاعرہ سے ایسے ہی موقعوں پر بگڑی اور پھر بنی نہیں۔

ویسے ساغرؔ اپنی طرف سے نہایت وضع دار، مروت، لحاظ والے اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ خود کسی کی توہین کے درپے نہ ہوتے تھے۔ کسی حال میں ہوں، سرعام نہ انھیں دوسروں کی تذلیل پسند تھی نہ اپنی سبکی گوارا تھی۔ مشاعروں میں بڑوں کا لحاظ کرتے، چھوٹوں کا دل بڑھاتے اور جس کسی میں کوئی ہنر دیکھتے، اُس کی کھلے دل سے داد دیتے۔

چوتھی دہائی کے شروع میں وہ پونا گئے۔ پونا فلم کمپنی میں جو گزری (اور اس کے بعد کے چند سال) اس کی کچھ جھلک جوشؔ کی "یادوں کی بارات" میں ملتی ہے۔ جوشؔ و ساغرؔ کم از کم تیس سال ہم نوالہ ہم پیالہ رہے، لیکن ساغرؔ کے وقتاً فوقتاً زبانی ریمارکوں سے اور جوشؔ کے "ذکر ساغرؔ" سے ایسا کھلتا ہے کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ پہلے پونا اور پھر بمبئی میں دونوں نے ایک جیسے سرمستی اور تنگ دستی کے حالات دیکھے جتنی امیدیں لے کر شمالی ہند سے آئے تھے، چار سال کے اندر اندر سب نے دغا دی اور گھر بار سمیت بمبئی منتقل ہوئے تو مُلک میں افراتفری شروع ہو چکی تھی۔ (۱۹۴۵ - ۴۶) اور فلم انڈسٹری میں نفسا نفسی۔

کئی یادداشتوں میں اہلِ قلم کی اس وقت کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ جوشؔ نے بھی اپنی سوانح میں، براگندہ نقاب سوانح میں اپنی ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ساغرؔ صاحب کی جھلک دکھائی ہے۔ میں نے اُس بُرے وقت میں، اُن کی زندگی کے سب سے آزمائشی وقت میں، انھیں ہمت کھوتے زمانے کی جان کو روتے اور تنگ دل ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاتھ کھلا تھا، خرچ اُجلا تھا، مکان سلیقے کا تھا۔ بیوی ایسی مثالی جس کے ساتھ چودہ برس کا بن باس بھی ہنستے کھیلتے کٹ جائے۔ قریب

کے لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے ہر ممکن تدبیر کی کہ "ایشیا" ماہنامہ نکلتا رہے اور اس سے لکھنے والوں کو بھی معاوضہ پہنچتا رہے۔ سارے جتن کر ڈالے۔ خود انتہائی ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی ضرورت میں دامے درمے کام آتے رہے اور باہر کی شان بنائے رکھی۔ بھوک میں مونچھوں کو گویا پلاؤ قورمے کی چکنائی دے کر محفل کا سامنا کرنا گہرے کلچر اور عالی ظرفی کی نشانی ہے۔ یہ نشانی اس زمانے کے ساغر اور بیگم ساغر کے چہروں اور لباسوں سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور اس کی بدولت اُردو شاعروں کا بھرم بنا رہتا تھا۔

ترقی پسند ادبی حلقوں میں (۱۹۴۸ء کی پارٹی لائن کے کارن) انتشار اور تفریق کی فضا خواجہ احمد عباس اور ساغر نظامی تک نام نہاد انجمن کی ممبری سے خارج کر دونوں کا جھکاؤ جواہر لال نہرو کی کانگریس کی طرف تھا۔ سکہ بند اور لیبل پسند کمیونسٹ اہلِ قلم سرکاری اداروں اور سرکاری پرچوں سے راندۂ درگاہ۔ (ان سطروں کا لکھنے والا بھی اپنی بساط بھر انہی میں شامل تھا۔)

ٹھیک انہی حالات میں جوش سرکاری رسالے "آج کل" کے ایڈیٹر ہو کر دہلی چلے گئے اور انھیں وہاں کچھ ایسی معاشی فراغت نصیب ہوئی کہ ساغر صاحب اوّل اوّل اُن کے اس "ہرجائی پن" سے خفا رہے۔ ان کے عمل سے عبرت پکڑی۔ پھر اُسے مثال بنایا اور بالآخر چار پانچ سال بعد بوریا ٹاٹ تیک دیا۔ چار و ناچار "ایشیا" کے ادارے سمیت دہلی چلے آئے اور حکومتِ ہند نے انھیں آل انڈیا ریڈیو کے ایک عہدے میں کھپا لیا۔ نہ ان کا دل بدلا تھا نہ دَل۔ شروع ہی سے وہ اس لائن کے آدمی تھے اور ریڈیو میں وہ صرف تنخواہ اور الاؤنس لینے نہیں بلکہ اُسے کچھ دینے کا حوصلہ لیے ہوئے آتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی آمد سے اس میڈیا کو جو فیض پہنچا تھا، وہ اپنی جگہ، لیکن ایک طرف ساغر صاحب نے چُن چُن کر روشن خیال اہلِ قلم کو نشریات رسیتے، کام دیا، کام لیا۔ اور دوسری طرف نشریات پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ رہے۔ فلمی نگار خانوں سے دید شنید (Audio Visual) تکنیک کے تجربوں سے اور ۵۰ برس غنائی اور قومی شاعری کی پختہ مشق سے جتنا کچھ ذخیرہ دانہ دانہ کر کے سمیٹا ہوگا، سب کو ٹھکانے لگانے اور کارداں میں لٹانے کا وقت آ گیا تھا اور وقت عزیز کو ساغر نے رائیگاں جانے نہیں دیا۔ عمر کے یہ آخری بیس سال انھوں نے جی لگا کر، دن رات ایک کر کے، ادبی مہم بنا کر، وقت کی تجوری اور اپنی صحت و آسائش، دونوں پر ڈاکہ ڈال کر لگاتار اتنے ورق سیاہ کئے، اتنا لکھا کہ ساٹھ برس کا کام اٹھارہ بیس برس میں کر کے رکھ دیا۔

منظوم ترجمے، اصل نظم نگاری سے زیادہ جوکھم کا کام ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں

کئی نامور شعراء نے دوسری زبانوں کی شاعری کو اپنی زبان میں ڈھالا ہے اور ایک زمانے کی شعری مشق کے بعد ہی یہ بھاری پتھر اُٹھایا ہے۔ (مثال کے طور پر جرمن، انگریزی اور روس میں ایسا ہی ہوا) ہماری شاعری کے تالاب میں یہ کنول یوں بھی کم ہی کھلے اور پھر ان کی قدر اتنی کم ہوئی کہ کم حوصلے کا شاعر منظوم ترجمے کے لیے قلم اٹھاتے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ تخلیق کار سے گھٹ کر مترجم نہ رہ جائے۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ ایک صدی میں جو کئی سو نظمیں مانوس ملکی و غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ ہو کر چھپی ہیں، ان میں کسی معروف شاعر کے ترجمے کئے ہوئے چند سو شعر بھی یک جا نہیں ملیں گے۔ وجہ وہی: خود اعتمادی کی کمی اور حوصلے کی پستی۔ فرسودگی کی منڈی میں اس جنسِ گراں کی ناقدری۔

ساغر صاحب جوانی گزارنے کے بعد منظوم ترجمے کے سوئمبر میں اُترے۔ اور رام بان اٹھایا۔ "بادۂ مشرق" اُن کا پہلا مجموعۂ کلام ۳۵-۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ اس میں بلند و پست سبھی طرح کی چیزیں تھیں۔ اہلِ نظر کی پسند اور تماش بینوں کی دل چسپی، نوجوانی کی لپک اور ناپختگی کی جھلک، سبھی کچھ۔ ساغر اس کے بعد بھی لکھتے رہے۔ سناتے رہے، داد پاتے رہے، مگر ۵۵ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جو انھوں نے ایک اور تازہ دم اور بھرپور زندگی جینے کا تہیہ کیا تو عظیم شعری کارنامے "شکنتلا" پر ہاتھ ڈالا۔

کالی داس کا یہ سنسکرت مہاکاویہ نظم و نثر میں ہے، جو لوگ سنسکرت پر عبور رکھتے ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ ایک بندۂ خاکی کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کس طرح آسمانی صحیفوں کے جلال و جمال سے ہم وزن ہو گئے ہیں۔ ساغر سنسکرت نہیں جانتے، حسن کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں۔ "پٹھانی کا دودھ" اور پھولوں سے بھری جیبیں اُن کی فطرت کا مزاج اور مذاق کی تربیت میں دُور تک گئی ہیں۔ "شکنتلا" رزمیہ نہیں بلکہ بزمیہ ہے، یہاں جمال ہی جمال ہے۔ آدمی اور فطرت کا دل نواز رشتہ ارضی اور ماورائی کرداروں کی آنکھ مچولی، ترکِ لذات کا مرحلہ اور پھر ترکِ ترک کی منزل، جہاں پہنچ کر انسان اپنے عمل کا دائرہ پورا کر لیتا ہے، ان "مقامات" کا باہمی ربط، یہ سب اور اس کے علاوہ حسنِ بیان، حسنِ کلام اور فطری ترنم، اس کا عرفان یقیناً ساغر صاحب کو ہوا ہے۔ انھوں نے "شکنتلا" پر جو اسی صفحے کا فکر انگیز دیباچہ لکھا ہے، اصل سنسکرت سے لاعلمی کے باوجود نہایت علمی پہلوؤں کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوئے ہے یہ اسی صفحات ایک فطری شاعر کے دھڑکتے ہوئے دل اور بلند حوصلگی اور برسوں کی دیدہ ریزی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اُسے پورے منظوم "شکنتلا" کے برابر تولا جا سکتا ہے۔ تولا جانا چاہیے تھا۔ آج تک کسی منظوم ترجمے پر اتنا وقیع، اتنا قیمتی، عالمانہ، شاعرانہ

دیباچہ ہماری نظر سے نہیں گزرا (حالانکہ ہم خود اس کوچہ سے نابلد نہیں گزرے ہیں۔)

الفاظ، انداز، بحروں، لہروں اور ترکیبوں استعاروں کے انتخاب کے بارے میں شاعر کا نقطۂ نظر یہ ہے:

"۔۔۔ دراصل اچھے اور بُرے الفاظ کا ترازو صرف معنی ہی نہیں ہیں، سماعت الفاظ کی صوتی لہروں کے بہاؤ اور سکون کو قبول اور مسترد کرتی ہے۔ جو کانوں کو بھلا لگے وہی لفظ استعمال کے لیے موزوں ہے۔ ہندی اور سنسکرت سے ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے ہم معنی الفاظ لکھنے پر ہی قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ کان لگا کر سننا بھی چاہیے کہ لفظوں کے سازسے کون سی صدا پھوٹ رہی ہے۔ لفظ آپس میں باتیں بھی کرنے لگے ہیں یا نہیں۔ الفاظ و معانی کے رشتے مسلّم سہی، لیکن آہنگ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔۔۔"

یکم نومبر ۱۹۶۰ء کی تاریخ پڑی ہے اس دیباچے پر۔ اسی سال کے آخر میں نہایت اہتمام، سلیقے، ہوش مندی اور ہر ممکن نفاست کے ساتھ ساغرؔ صاحب کی منظوم "شکنتلا" نکلی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر تاراچند اور سجاد ظہیر کے دیباچے اس کے شروع میں یہ بتانے کو کافی تھے کہ خود ساغرؔ صاحب اپنے اس کارنامے کو کیا حیثیت دیتے ہیں۔ اس منظومے پر تبصرے، ریمارک اور مضامین چھپ چکے ہیں۔ مقبول و نامقبول سبھی کچھ کہا جا چکا ہے تب بھی وہ بات کہنے اور سمجھانے کو باقی ہے۔ جو سنسکرت، کالی داس اور اردو کلاسیکی شاعری کا کوئی ایک عالم، ایک ودوان ایک نہ ایک دن کہے گا۔ ممکن ہے وہی بتا سکے کہ اگر یہ کہانی جوں کی توں اردو میں ہوتی اور ساغرؔ کو دیدی جاتی تو وہ اُسے نظم میں ڈھالتے وقت یہی صورت اور معیار رکھتے یا اس سے مختلف۔ تب اُس دن ساغرؔ کے کارنامے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

"شکنتلا" پر جو داد و بے داد شور مچا اس نے ساغرؔ کا نشہ اور تیز کر دیا۔ اور اس بار انھوں نے ڈرامے کی دُنیا کا گھسا پِٹا موضوع "انارکلی" لے کر اُسے اوپیرا کی تکنیک اور اپنے تصور کے سانچے میں ڈھالا۔ اب یہ ساغرؔ کی انارکلی تھی۔ اُن کے تخیل کا عالمِ خواب و بیداری، جس میں شہزادہ سلیم مثالی عاشق ہے، جس کے عشق کو زمین پر بے بسی مقدر ہوتی تھی۔ اور عالمِ بالا پر حسن کی پرستش کا پورا اختیار۔ ساغرؔ نے یہاں فرد اور سماج، اطاعت و سرکشی، حسن و عشق، جبر و اختیار، جذبہ و اقتدار جیسے مسائل کے سنگلاخ میدان میں اشہبِ قلم کو دوڑانے کی پوری چھوٹ دی ہے۔ اور اپنی اس معرکہ

انظم کے تعارف میں لکھا ہے۔ (١٩٦٣ء)

منظوم شکنتلا کی طرح انارکلی بھی مثنوی نہیں ہے۔ نہ اس پر طویل نظم ہونے کا شبہ کرنا چاہیئے۔ دونوں غنائیے پڑھنے کے خیال سے نہیں لکھے گئے۔ ان کے فرائض میں اسٹیج ہونا بھی شامل ہے۔ ہاں اس میں اور شکنتلا میں ایک امتیازی فرق ضرور ہے۔ شکنتلا میں کرداروں کی خودکلامی ڈرامائی تسلسل میں قدرے رکاوٹ پیدا کرتی تھی، مگر یہ اصل کا عکس تھا۔ انارکلی اس عنصر سے محفوظ ہے کیوں کہ خود اپنی اصل ہے۔ مگر اس میں بھی ڈرامائی مدوجزر اور جذبات کے کیف وکم کے لحاظ سے بحروں کا تغیر وتبدل عمل میں لایا گیا ہے اور ضرورت کے مطابق ایسی بحریں اختیار اور وضع کی گئی ہیں تاکہ نفرت ومحبت، الم ومسرت، غیظ ورحم، حرکت وسکون اور انتشار وتوازن کی بھرپور نمائندگی ہوسکے۔ اور جب اسٹیج پر کردار مکالمے بولیں تو بحر سے مقصود جذبہ خود بخود بول اٹھے۔

لیکن اس ڈرامائی نظم سے مقصود جذبہ جس کا نام یہاں نہیں آیا، وہی ہے جو بالآخر ہر ایک کار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جبر و اختیار کی کش مکش کا اگلا پچھلا حساب طلب کرتا ہے۔ ساغر نے اپنی ہم پیشہ برادری کے عام مزاج سے ہٹ کر "انارکلی" میں انسانی اختیار سر سہرا باندھا ہے۔ جودھابائی کی ممتا اور انارکلی کی سپردگی دونوں ہی ساغر کے عالمِ خیال نکہ گزار نظر آتی ہیں۔

اس نفیس، دل کش، آراستہ، پیراستہ شعری مجموعہ کے گلے میں دو قیمتی ہار پڑے ہیں۔ ٢٢ صفحے عالمانہ دیباچہ انگریزی کے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا اور ٥٥ صفحے کا مقدمہ خود ساغر صاحب وہ کلچر پسل کا۔ یہ مولسری کے پھولوں کا۔ ساغر نے یہاں پھر اپنی شاعرانہ نثر سے منظومے کی رہی سہی ر نکال دی ہے۔

ان کا تیسرا طویل منظومہ "نہرو نامہ" ہے۔ جس کے بارے میں وہ معمول سے زیادہ جذباتی بگئے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ساغر کو مدتوں کا خصوصی نیاز حاصل تھا۔ ان کے فکر و عمل راہ بھی وہی "نہروانہ" تھی۔ پنڈت جی کا انتقال مئی ١٩٦٤ء میں ہوا۔ اگلے سال یہ نظم لکھی گئی۔ بڑھ سال کے شب و روز میں تمام ہوئی، پھر اشاعت کی دھوم دھام ہوئی۔ درمیان میں جو بیتی وہ تر اور ان کے کلام کی مہتمم بیگم ذکیہ سلطانہ سے ہی سنیئے:

۱۶ر اگست ۱۹۶۵ء کی رات پونے بارہ بجے عرس حضرت محبوب الٰہیؒ کے موقع پر عرس محل نظام الدین اولیاء میں دل کا حملہ ہوا، مگر ان کی جان ان کے جسم میں کہاں تھی، نہرو نامے میں تھی۔ موت ان تک غلط پہنچی تھی۔ پورا ایک سال (۶۶ء) دل کی بیماری میں بیتا لیکن وہ اس نازک ترین حال میں بھی نہ مانے۔ ذرا جان آئی تھی کہ پھر وہی دن رات شروع ہو گئے۔ وہ صبح و شام پھر زندگی سے مذاق کرنے لگے۔ اس مرتبہ پھر تخلیقی عمل، ترمیم و تنسیخ، نقل نویسی اور" مرصع کاری" کے ساتھ ساتھ نہرو نامے کے انگریزی ترجمے کا کام بھی شروع ہو گیا۔ (جولائی ۶۷ء)

"نہرو نامہ" جیسی طول طویل، مختلف بحروں، کیفیتوں، مسلوں اور شکلوں سے گزرتی ہوئی نظم شاید ہی کسی زبان میں نہرو کی سمادھی کو نصیب ہوئی ہو۔ اگر آئندہ بھی ہو جائے تب بھی ساغر کا "نہرو نامہ" سب سے آگے اور قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے طول نے شعریت کو اور شاعر کے جذبۂ بے اختیار کو بار بار پیچھے کھینچا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مصرعے بُری طرح ناہموار ہو گئے ہیں اور منطقی ربط راہ سے بے راہ۔

"نہرو نامہ" جذباتی شدت کے عالم میں اور نہرو جیسی تاریخ ساز شخصیت کی موت پر اُن قدروں کی یاد دہانی کی نیت سے شروع کیا گیا تھا جو قدریں خود قومی آزادی کے اُبال میں اُٹھنے والے ساغر کو بھی اتنی ہی عزیز تھیں۔ موضوعِ سخن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش میں آمد نے آورد کو راہ دی اور آورد میں بعض فنی خامیاں در آئیں (مثلاً صـ۱۸۳ پر سہل کی جگہ آسان کے مکرر الفاظ)

نظم تمام ہوتے ہوتے ساغر نظامی کی جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ آنکھوں نے غالباً اس کے دنیاوی امکانات بھی دیکھ لیے اور جولائی ۶۷ء میں جب وہ واقعہ ظہور پذیر ہوا جسے واقعی زیورِ طباعت سے آراستہ ہونا کہتے ہیں تو اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر سید محمود، سجاد ظہیر کے علاوہ انور صدیقی، محمود جالندھری، بلراج کومل اور ذکیہ سلطانہ ساغر کے قابلِ ذکر مضامین بھی شعری معرکوں کے ایک فاتح کے سینے پر تمغوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اب وہ (سرکاری منصب سے ریٹائر ہونے پر) اپنے لیے نئے معرکے اور وسیع تر میدان کا تقاضا کر رہے تھے۔ ساغر اور ان کے کارنامے اور اُن کے تمغے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کی زندگی میں ہی ساغر کو ان کے حسبِ مراد ایک اہم، قومی پیمانے کا عظیم الشان فریضہ سونپ دیا گیا۔ پوری جنگ آزادی کو

منظوم کرنا، اس پروجیکٹ پر وقت، سرمایے اور ضخامت کی کوئی پابندی نہیں مانی گئی۔
یوں ساغر نے زندگی سے جو آخری سودا کیا۔ وہ بھی بڑے سلیقے سے، خودداری کے ساتھ اور مول بھاؤ میں اپنا بول اونچا رکھ کر کیا اور عمر بھر کی کمائی کو ارزاں نہیں جانے دیا۔
خود کو اس طرح منوالینا محض فنی ریاضت اور ذہنی محویت نصیب نہیں ہوا کرتا۔
دس سال سے اوپر انھوں نے اسی منظوم تاریخ کی تکمیل میں بسر کئے۔ اگرچہ وہ مکمل نہ ہوسکی۔ تاہم "مشعلِ آزادی" کی جو ایک جلد ہمارے سامنے آئی ہے، وہ ساغر صاحب کے تھکتے ہوئے بیمار جسم اور جاگتے ہوئے تیمار دار ذہن اور حوصلے کی قدم قدم پر گواہی دے رہی ہے۔ اگر انھوں نے یہ کام "شکنتلا" کے منظوم ترجمے کے وقت میں اٹھایا ہوتا تو انھیں بار بار کی ترمیم، اصلاح اور تکمیل کا وقت مل جاتا۔ اگر ساغر نے ستم ستم کر، وقفے دے دے کر اس صہبائے تند کو آبگینے میں ڈھالا ہوتا تو اس پر دوستوں دشمنوں کے طعنے، آوازے اور تقاضے کچھ کام آتے، لیکن ہونی انہونی میں اگر مگر کا دخل کچھ بھی نہیں۔ اب یہ منظوم تاریخ آزادی جیسی ہے، ساغر صاحب کا سبد چیں ہے۔ جاتی فصل کا آخری پھل پھول۔ ارمغاں۔ قیمت آنکنے کے لیے نہیں، ایک ایسی بیش قیمت یادگار ماننے کے لیے، جس تک پہنچانے والی پگڈنڈی سبزے سے ڈھکی رہے گی۔
۸۷ برس پورے کرکے ۲۷ فروری ۱۹۸۴ء کو جب ساغر نظامی سکونِ قلب کے ساتھ قلب کے آخری حملے میں دنیا سے سدھارے تو ان کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ امیر کبیر رشک کریں۔ اور اسی شام غالب اکیڈمی میں جس ادبی جلسے کی وہ صدارت کرنے والے تھے۔ وہ جلسہ ان کا پہلا تعزیتی اجلاس بن گیا۔ زندگی سے انھوں نے انصاف کیا تھا۔ موت نے ان سے مروّت برتی۔ جس آن بان سے وہ جیتے تھے، وہ شان دیر تک ان کی یاد کے ساتھ سلامت رہے گی۔
میں نے گھنٹہ گھر میرٹھ کے بازار سے جلدی جلدی گزرتے ہوئے ساغر نظامی کو اس وقت دیکھا تھا، جب میں پنجوں کے بل اُچک کر ہی انھیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرٹھ کے ایک نامور شاعر اور میں عربی زبان وادب کا ایک بے حیثیت طالب علم۔
اُن کے والد جو محکمۂ صحت کے ایک افسر تھے، دارو غہ جی کہلاتے اور گھوڑے پر دورہ کرنے نکلتے تھے۔ اپنے ایک اسسٹنٹ، میرے شفیق وعزیز ماموں (امداد علی) پر خصوصیت سے مہربان تھے۔ میں کچھ تو ماموں کے رشتے سے اور کچھ ساغر صاحب اور اُن کے نامور مہمانوں کی زیارت کی خاطر ساغر صاحب کے مردانہ مکان پر آنے جانے لگا۔ جوش ملیح آبادی اور نیاز فتح پوری کو یہ

بار دیکھا۔ اہلِ قلم ایسے قدآور اور شاندار ہوتے ہیں، یہ سوچ کر میں اپنے کمزور اور حقیر جسم سے بہت شرمایا تھا اور اس کے ساتھ طے کیا تھا کہ بڑے ناموں سے دن کی روشنی میں پہلی بار کبھی ملنے نہیں جاؤں گا۔ یہ منہ اور مسور کی دال!

پھر انھیں ریڈیو پر سُنا۔ ریڈیو نیا نیا چلا تھا۔ جس گھر میں ہوتا آس پاس کے درجنوں لوگ سرِ شام خبریں اور نشریئے سننے جمع ہو جاتے۔ اہلِ قلم کا نام گھر گھر پہنچانے میں بھی ریڈیو پروگراموں کا دخل بڑھ گیا تھا۔ جنگ شروع ہوئی۔ (ستمبر ۳۹ء) تو نیشنل وار فرنٹ کے مشاعرے اور ادبی پروگرام، ناچ گانے بھی سنے جانے لگے۔ جنگی خبروں کو لوگ مشتبہ سمجھتے اور ادبی پروگراموں کو معتبر ساغر نظامی ہر مشاعرے میں چمکتے اور گونجتے۔

۱۹۴۲ء میں جب گاندھی جی نے جنگ کے خلاف (یعنی جنگ عظیم میں ہندوستان کو خواہ مخواہ گھسیٹنے کے خلاف) انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا تو ساغر صاحب کا دل ستیہ گرہ کے ساتھ تھا اور ان کی کھنکتی ہوئی آواز ان شاعروں کے ساتھ، جو سرکاری سرپرستی میں مشاعروں کا بازار گرم کیا کرتے تھے، جوش اُن سے بڑے بنے۔ ساغر کی بے داغ شیروانی پر آنچ نہیں آئی۔ اب اُن کے سر کنبے کا بوجھ بھی تھا۔

بھاری بھرکم کنبہ۔ بڑے خرچ اور کمانے والا شاہ خرچ باپ ریٹائرڈ۔ جن پر گزری ہے وہ جانتے ہوں گے کہ جنگ کی شدت اختیار کرتے کرتے جب قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں، ایک بڑے کنبے کو شاعری کے کنویں سے شاداب رکھنے کے لیے آدمی کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہوں گے اور پھر ساغر جیسا کھلے ہاتھ کا آدمی، جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے۔ سخت آزمائش کا توڑ آنے سے پہلے ہی جوش، ساغر، کرشن چندر، اختر الایمان اور بھرت ویاس کو پونا (شالیمار پکچرز۔ ڈبلیو زیڈ۔ احمد) سے بلاوہ آگیا اور بُرا وقت ٹل گیا۔

اس شاہانہ ملازمت کے اللّے تللّے ہم نے کچھ سنے ہیں۔ کچھ پڑھے ہیں۔ (کرشن چندر اور جوش کی زبانی) انجام اس کمپنی اور ملازمین کا ہندوستان کی خونی تقسیم کے ساتھ ہوا۔ سب بکھر گئے۔

ساغر بمبئی آتے تو یہ سوچ کر چھپر چھایا تھا کہ فلمی دنیا میں دھوم مچا دیں گے۔ نخشب جارچوی (مرحوم) نے، کہ ایک نمبر کے خبط پسند اور مہم دوست اور جوان مرگ شاعر تھے، کسی خلوت میں ساغر صاحب کو مشورہ دیا کہ یہاں جس سے تنخواہ یا معاوضے کی امید ہو، اُس کے ساتھ شام کے شباب و کباب میں شرکت سے پرہیز کیا کیجیے۔ آپ خود کو قومی لیول کا شاعر سمجھتے ہیں، نہ جانے ترنگ میں کیا کہہ جائیں۔

وہ خود کو سیٹھ یا مالک سمجھ کر آپ کی بات کو نیچی کرے گا۔ انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔ مگر ساغر صاحب تخشب کو کہاں خاطر میں لاتے تھے، جو یہ مشورہ دل پر لیتے۔ انجام بخیر نہیں ہوا۔

گھر کے اندر کی بات ہے کوئی نہیں بتائے گا، اس لیے بتائے دیتا ہوں کہ بیگم ساغر نے اس کٹھن گھڑی میں بڑے سے بڑا وقت دیکھا اور شوہر کو سنبھالے رہیں۔ انھوں نے کاروبار کی ٹھانی۔ مچھلی ڈبوں میں بند کر کے ایکسپورٹ کرنے کا ڈول ڈالا۔ مچھلی ایکسپورٹ ہونے سے تڑپ کر نکلی تو روزمرہ کی غذا میں چمکنے لگی اور ساغر صاحب اپنی قوت تخیل سے مچھلی، فاسفورس اور دماغی قوت کا باہمی رشتہ سمجھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہفتوں لگاتار مچھلی کھانے کے بعد جو دماغ روشن ہوا تو انھوں نے بمبئی کی فلمی دنیا کو اس ناہنجار حال میں چھوڑا اور خود قومی حکومت اور اس کے رہنماؤں سے رجوع کیا۔ اس رجوع کا پھل اُردو ادب کو (۱۹۵۵ء - ۸۱) ۲۵ برس تک برابر ملتا رہا۔ پروگراموں کی ترتیب، پابندیٔ اوقات، فرض کی ادائیگی، تصنیف و تالیف میں انہماک، مجلسی زندگی میں سرگرمی، قومی مسائل میں شرکت، سبھی میں ساغر کا سلیقہ مثالی تھا۔

انھیں دو بار ملک سے باہر جانے کا موقع ملا۔ پہلی دفعہ دو رُکنی وفد میں پولینڈ گئے تھے۔ باہر کے ادیبوں اور ادبی سرگرمیوں کا مشاہدہ ان کے لیے بڑا حوصلہ افزا نکلا۔ دوسری بار وہ ۱۹۶۲ء میں ادیبوں کے ایک بھرپور وفد کے ساتھ سوویت یونین گئے۔ مشرقی یورپ دیکھا اور آزاد بندوں کی عزیز سیرگاہ پیرس میں گھومے۔

ماسکو میں ایک روز سنانے لگے: افسوس ظ۔ انصاری صاحب، ہم نے یہ دُنیا اتنی دیر سے دیکھی۔ یہاں تو قدم قدم پر۔۔۔ کیا صاف ستھرے شہر ہیں! کیا دل رُبا نقشے ہیں، علم کی گرم بازاری ہے اور ایک ہم وہاں اپنی ڈفلی بجاتے رہے!

ساغر صاحب، میں تو یہاں بھی اپنی ڈفلی بجا رہا ہوں۔

نہیں صاحب، ذرا غور کیجیے۔ وہ اپنے اُردو ہندی کے تنگ نظر ماحول پر، شرمیلی قوم پر (قوم کے لیے یہ لقب میں نے پہلی بار انھیں کی زبان سے سنا، بعد میں جوشؔ کی آپ بیتی میں نظر آیا۔) میں نے دبی زبان سے عرض کیا: کیا پیرس میں بھی شرمیلی قوم کا یہ شاعر شرماتا گزرا؟

فرمایا: اجی چھوڑیے، لاحول ولا قوۃ! میں نے ڈنکر جی سے کہا (ڈنکر جی: رام دھاری دنکر کوی مہاشے) آؤ شام کا سمے ہے۔ پیرس کے بدنام کوچوں کی سیر کرالاؤں، کیا با دکر وگے بولے، نابندھو، ہم اس کوچے کے کام کے نہیں رہے۔ یہ کہا اور ہوٹل کے بند کمرے میں بیٹھے

دور دور دھا پہنچتے رہے۔

ساغر مہذب آدمی تھے، بیدار حواس کے آدمی تھے، یار باش آدمی تھے، مگر شرمیلی قوم کی نمائندگی پر راضی نہیں تھے۔ جو کیا دھڑلے سے کیا اور جو تہیہ ایک بار کر لیا اس پر جُٹ گئے۔ گفتار میں بھی۔ کردار میں بھی۔ آخری بیس برسوں کی شعری کاوش کے پانچ مجموعے جہاں اُن کے حوصلے اور سلیقے کے گواہ ہیں۔ وہیں اُس کے بھی کہ ساغر کے ملک گیر تعلقات، لبرل نظریات اور دیار مغرب کے سفر اس حوصلے اور سلیقے میں برابر کے شریک تھے۔ وہ بھی اُنھیں اکساتے رہتے تھے۔ انسپریشن یا اُتساہ کے عجب عجب سرچشمے ہوتے ہیں اور کام صرف اُتساہ سے نہیں چلتا۔ پبلک ریلیشنز کی چکی چلانے اور جھُولا جھُلانے والے ہاتھوں کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ سو یہاں اس کی کمی نہ تھی۔

ساغر صاحب کے نام اور کام کے اس ہلکے سے جائزے کو ایک لطیفے پر تمام کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان کی جو تصنیف کھولتا ہوں، اس کے سرورق پر ساغر صاحب کے دستخط ہیں، تاریخ و مقام درج ہیں۔ ایک آدھ مخلصانہ جملہ ہے عزت افزائی کا یا ہم عصر کو خطاب کرنے کا سا لہجہ ہے۔

"نہرونامہ" کے سرورق پر تو انھوں نے ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا:

۱۷ سال کے دلی تعلقات کی یادگار

اپنے عزیز محترم ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے لیے

تب ساغر صاحب ۷۱ کے ہوتے تھے اور وہ مجھے بھی (نہ جانے کیوں) ۷۱ کا سمجھتے تھے۔ جو اپنی عمر کسی اکسیری نسخے کی بدولت چھپائے پھر رہا ہے۔ کئی بار انھوں نے زبان اور قلم سے مجھے ہم عمری اور ہم عصری کا اعزاز بخشا اور میں نے یہ غلط فہمی دور نہ ہونے دی تاکہ ہم مشربی کا لطف نہ جانے پائے۔

"انارکلی" کا تحفہ دیتے وقت لکھا تھا:

اسے پڑھنا اور مجھے نہ بھولنا۔

اگر میں نے اسے نہ پڑھا ہوتا تب بھی اُن کو بھول نہ پاتا کہ میں نے خود ساغر صاحب کو چالیس سال پڑھا تھا۔ اور ہمیشہ انھیں ایک ہمدرد، حوصلہ مند اور قدر داں انسان پایا تھا۔ آخری دم تک وہ یاد رکھے جانے کے قابل ایک یادگار شخص تھے اور آخری دم تک زندہ و تابندہ رہے۔ شاعری سے ہٹ کر بھی ان کے وہ تین مقالے، جو مقدمے کے طور پر شعری تصانیف میں شامل ہیں۔ اہل نظر سے اپنا صلہ طلب کرتے رہیں گے۔ ایسے کاموں کا کیا کھا کے کوئی صلہ دے گا۔

(آج کل نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۴ء)

عابد رضا بیدار

قاضی عبدالودود

منفی تنقید کے سوا قاضی صاحب نے کیا کیا ہے؟ کتنے بڑے معروف محققوں نے مجھ سے متعدد موقعوں پر یہ جوابیہ سوال کیا ہے! دوسروں پر تنقید اور نکتہ چینی صحیح برمحل اور بجا۔ سوال آگے بڑھتا ہے۔ لیکن انھوں نے خود کوئی مستقل تصنیف کی؟

مستقل تصنیف کبھی کتاب کی شکل میں ہوتی ہے کبھی اشخاص کی شکل میں۔ جمال الدین افغانی نے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالوں کے سوا قاضی صاحب کے معیار کی طرح چھ مہینے میں ایک رسالہ نکالا تھا۔ بس اتنا ہی اس کا تصنیفی کام ہے لیکن کوئی ٹھکانہ ہے اس کے کام کا! ایک تنہا ذات نے مشرق میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔ ایران کے انقلاب میں اس کا ہاتھ، مصر کی پہلی آزادی خواہ تحریک پر اس کا سایہ، مہدی سوڈانی کے وہ ساتھ، ہندوستان کی آزادی خواہوں اور انقلابیوں میں وہ شامل۔ انگریز اور سامراجی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اس نے بھی انگریزوں پر منفی تنقید کی بوچھاڑ کر رکھی تھی۔ اس کی بھی مستقل تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر بھی نسکر گزار مصر و ایران نے کبھی افغانی سے یہ سوال نہیں پوچھا جو قاضی صاحب سے پوچھا گیا۔ اس کی تصانیف لوگوں پر سعد سوسن کی طرح عیاں تھیں کہ جس حصۂ زمین میں چند سال رُک گیا، نئے جمال الدین افغانی پیدا کر دیئے۔ اور آج تک وفات کے اسّی سال گزر جانے کے بعد بھی فیضان کا سلسلہ جاری ہے۔

خالص ریسرچ کے میدان میں بھی مغرب میں، جو ایسے معاملات میں ہمارا معیار قرار پاتا ہے، بڑے محققوں کی کوئی کتابیں نہیں گنتا، ان کے ریسرچ پیپر دیکھے جاتے ہیں اور ان کی بھی تعداد نہیں اہمیت مدّنظر ہوتی ہے۔

قاضی صاحب نے پچھلے ۲۵۔ ۳۰ سال میں ادبی تحقیق کے میدان میں آزمودہ کاروں اور نوآزمودہ دونوں کی جس طرح تربیت کی ہے، اس کی مثال اُردو کیا، عربی فارسی میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اپنی نجات کے لیے ہر شخص قدرتی طور سے کوشش کرتا ہی ہے۔ دوسروں کی نجات کے لیے ذہن کو تپانا اور جلانا پیغمبری کا کام ہے۔ اپنے آپ مصنف تو ہیں آپ سبھی بن جاتے ہیں۔ دوسروں کو صحیح، تحقیقی راہ پر لگانا اور ریزہ ریزہ پوری عمارت بناتے

لہ قاضی عبدالودود کا انتقال ۲۵ر جنوری ۱۹۸۴ء کو ہوا

جانا۔ اس قدر خاموشی کے ساتھ کہ یہ اعتراض ہونے لگے کہ یہ ریزے ہیں، عمارت کا کریڈٹ ہم انہیں نہیں دے سکے:
یہ صرف ایسا شخص کر سکتا ہے جو کام کو انعام سمجھتا ہے۔ انعام کو کام نہیں۔

کبھی وہ دوسرے درجے کی کسی چیز پر قانع نہیں ہوئے آم اور آلوچے سے لے کر شعر و فلسفہ تک، فرد اور سماج تک! یہی وجہ ہے کہ ایک دو کے سوا (اور وہ بھی ایک حد تک) نہ کوئی شخص ان کی نظر میں جچا ہے نہ کوئی معاشرہ۔ ایک عام شکایت ہے کہ صاحب، قاضی صاحب کو تو کوئی مضمون (کتاب) پسند ہی نہیں آتا۔ فوراً نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تھوک پسند اور خیراتی کا معیار، دونوں اصرار کریں کہ قاضی صاحب بھی اسے اپنائیں۔

اُردو کی ادبی تحقیق جو گھٹنوں چل رہی تھی، قاضی صاحب نے اُسے پاؤں چلنا سکھایا۔ لیکن اُردو تحقیق کا مزاج؛ چہل سال عمر عزیز گزرنے کے بعد بھی حالِ طفلی سے نہیں بدلا ہے۔ محقق... جن میں قدیم و جدید دونوں شامل ہیں، قاضی صاحب کا احترام کرتے ہیں بلکہ ڈرتے ہیں لیکن قاضی صاحب نے کیا لکھا ہے۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ ان کے لکھے ہوئے کا صرف بیس فی صدی ادبی تحقیق کا کام کرنے والے اُردو کے جن مصنفوں نے بالاستیعاب پڑھا ہے، ان کی تعداد میرے ہاتھ کی دو انگلیوں کے پوروں پر پوری نہیں ہوتی۔ میتر نے قاضی صاحب کے سلسلے میں ایک مصرع لکھا ہے:

بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

اُردو زبان و ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم قاضی صاحب کا ادب و احترام کرتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے لیکن بس وہ انہیں پڑھتا نہیں ہے، إلا ماشاءاللہ! ہم لوگ یوں بھی پرستش ضرور کر سکتے ہیں مگر معاملات میں دخل اندازی نہ خدا کی گوارہ کریں گے نہ رسول کی، قرآن مجید رحل کی زینت ہو سکتا ہے۔ طاقوں اور الماریوں میں سج سکتا ہے۔ کبھی کبھی تبرکاً بغیر سمجھے پڑھا بھی جا سکتا ہے، لیکن اُسے ہدایت حاصل کرنے کے لیے پڑھنا، سمجھنا، عمل کرنا، اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے اُردو کے چوٹی کے محققوں کو اس بات پر جھنجھلاتے دیکھا ہے کہ ر: نسخۂ رامپور، ق: نسخۂ انجمن ترقی اُردو، خ: نسخۂ خدا بخش کا فارمولا مضمون کے شروع میں دے کر متن میں لکھا جا رہا ہے، کہ ق کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "اور خ اور ر کے مشتملات میں جہاں تک قصائد کا تعلق ہے کچھ فرق پایا جاتا ہے" وغیرہ۔ نتیجہ یہ کہ یہ چوٹی کے محققین بھی اس مضمون کے سوا، جس میں خود ان پر تنقید ہوئی ہے، بقیہ مضامین بمشکل پڑھ پاتے ہیں۔

قاضی صاحب کے پچاس فیصدی مضامین وہ ہیں جن میں کسی شاعر کے کمیاب یا نایاب قلمی (کبھی کبھی مطبوعہ) دیوان یا کسی قدیم اخبار یا رسالہ کے فائل کا تفصیلی تعارف مقصود ہے۔ اس میں محض چار چھ سطروں کا نثری تعارف کرا کے باقی صرف یہ ہوتا کہ انتخاب کلام (مندرجات) دے دیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے (اور ان میں اچھے اچھے پڑھنے والے شامل ہیں) اس انتخاب والے حصے کو قطعاً نہیں پڑھتے اور از خود ایک آسان فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کسی

دیوان یا رسالے سے یہ یا اس جیسا انتخاب تو ہم بھی کر سکتے تھے، حالانکہ اس انتخاب کے کام میں کتنی محنت اور وقت صرف ہوا اور ان گنت خزف ریزوں میں سے صرف موتی (اور سارے کے سارے موتی) نکال کے دوسروں کو مہیّا کر دینے والے نے کتنا بڑا کام کر دیا، یہ اس انتخاب کو بالاستیعاب پڑھنے کے بعد ہی پتہ چل سکتا تھا۔

غالبؔ قاضی صاحب کا پہلا عشق ہیں۔ غالب کی یاد میں ایک بین الاقوامی سیمینار صدی جشن کے موقع پر ہوا جس میں خطبۂ صدارت قاضی صاحب نے پڑھا۔ میں اس جلسہ میں شریک تھا اور اپنی آنکھوں دیکھی کانوں سنی بات ہے اُردو کے چوٹی کے ادیبوں کے اس منتخب روزگار مجمع میں ایسا کوئی بھی نہ تھا، جس نے ناک بھوں نہ چڑھائی ہو، یا زیرلب اور سیمینار کے بعد بآوازِ بلند نہ مانا ہو۔ واہ صاحب یہ کیا بات ہوئی کہ غالب سیمینار میں غالب کی بُرائی ہو رہی ہے۔ اسے کم علم، دروغ گو، خوشامدی، فریب کار، بدمعاملہ، نافہم یا کج فہم اور دُنیا دار ثابت کیا جا رہا ہے پھر اس کے پاس کیا بچا؟ قاضی صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ کچھ بچا یا ہے یا نہیں۔ غالب سیمینار میں غالب پر تحقیق کا ایک معیار پیش کرنا تھا۔ یہ بتانا تھا کہ غالب بحیثیت انسان اور بحیثیت اسکالر تحقیق کی روشنی میں کوئی درجہ نہیں رکھتے اور اس سب کے باوجود "غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنا تھا کہ اصولی طور سے ایک گھٹیا اسکالر یا ایک گھٹیا انسان ہونے کے باوجود اس کی عظمت کو اُردو کا کوئی شاعر نہیں پہنچ پاتا۔ سننے یا پڑھنے والے ایسے موقع پر ذہنی تہی مایگی کے سبب یا بدنیتی سے پہلی ہی منزل پر رہ جاتے ہیں، اگلی کا موقع ہی نہیں آپاتا۔

غالبؔ پر جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ قاضی صاحب نے کام کا پلان بنایا (جہانِ غالب جس کا ایک ہلکا سا نمونہ ہے) اور اس کی زندگی اور فن کے ایک ایک گوشہ کا احاطہ کیا۔

غالبؔ کے بعد سب سے زیادہ توجہ سے سوداؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ پر کام کیا ہے، اس شغف کے ساتھ کہ متعدد بار ذکر ہوا ہے کہ ان تینوں پر ایک ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ہے جس میں نصف سے زیادہ حصہ تو گویا شائع ہو ہی چکا ہے۔

سلہ مولانا ابوالکلام آزادؔ پر قاضی صاحب کی بے محابا تنقید پڑھ کے اور سُن کے اُردو کے ایک معروف اہلِ قلم (جو اچھے خاصے مفکّر بھی ہیں، فلسفہ کے اُستاد رہ چکے ہیں۔ عالمی فلسفہ ادبیات کا گہرا مطالعہ ہے) بڑی دل سوزی سے قاضی صاحب سے کہنے لگے، کم سے کم اس امر کی خاطر ہی ان کی کمزوریوں پر نہ لکھیے کہ جب اتنے بڑے بڑے ستون گر جائیں گے تو ہمارے پاس بچے گا کیا؟ ہم کہ یوں ہی کم مایہ بلکہ فرومایہ ہوتے جا رہے ہیں، پھر اغیار کی نظر میں جو بھرم ہے، پھر تو وہ بھی نہ رہے گا۔ قاضی صاحب نے اِن پر ایک کڑی نظر ڈالی، پھر یکایک خیال آگیا کہ یہ ان کے یہاں مہمان آئے ہوتے ہیں، خاموش ہو کے رہ گئے۔ بعد میں کہنے لگے کہ کتنے اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی مصلحت و مصالحت سے تحقیقی کام کو غلط موڑ دیتے رہے ہیں۔ اس خاص سلسلے میں وہ جامعہ کے کچھ لوگوں کے بھی خاصے شاکی تھے۔

ادبی رسالہ کس معیار کے ساتھ نکالا جاتے، ایک ماہنامہ معیار نکال کے ایک شوق پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ضمناً ایک معیار بھی دے دیا۔

ایک دلچسپ سلسلہ آوارہ گرد اشعار کی تلاش اور تعین ملکیت کا تھا۔ اس کی متعدد قسطیں جا بجا نکلتی رہیں اور حق بحقدار پہنچتا رہا۔

شاعروں میں شاد عارفی اور محققوں میں قاضی صاحب (کوئی رسالہ والا فرمائش کر دے تو صحت اگر ٹھیک ٹھاک ہے) پھر اسے رد کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ نئے چراغ (کھنڈوہ) ساغر آہنگ (دہلی) بہار کی خبریں مطالعہ وغیرہ۔ کچھ کے دو تین نمبر ہی مشکل سے نکلے۔ کچھ ایسے جن کے نام سے اُردو والے عام طور سے ناواقف۔ مگر قاضی صاحب کا مضمون اس میں مل جاتے گا۔ غنیمت ہے کہ مضامین کا تین چوتھائی حصہ معاصر اُردو ادب، نوائے ادب، ہماری زبان، آج کل اور تحریک میں محفوظ ہے۔

صحتِ متن اور اصولِ تحقیق پر دو بنیادی اہمیت کے مقالے تحریک اور آج کل میں محفوظ ہیں۔ ادبی تحقیق پر عملی تنقید کے بنیادی مقالے ہماری زبان اور نوائے ادب میں اس نہج سے آگئے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے جو مقالے مختلف جامعات میں منظور ہوکے شائع ہوتے قاضی صاحب نے اِن پر تنقید کی ہے۔ اسی ذیل میں اِن کا وہ طویل مقالہ بھی آجاتا ہے جو میر حیات اور شاعری پر لکھا گیا ہے۔ ان تنقیدی مقالوں سے قاضی صاحب کا طریق کار سمجھ میں آجاتا ہے جو وہ تحقیق کے سلسلے میں دوسرے سے توقع رکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں۔

لغت کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ ابھی اُردو کا جامع لغت لکھنے کا وقت نہیں آیا ہے تا آں کہ غیر مطبوعہ متون مدون ہو کے شائع نہ ہو جائیں۔ اپنے متعدد مضامین میں، جن میں بعض غیر مطبوعہ متون کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، اِن میں یہ خاص خیال رکھا ہے کہ جتنے نئے لغات یا رائج لغات کے غیر معروف اسناد یا نئے معانی ہاتھ آجائیں، سب کے سب درج کر دیئے جائیں۔ اِن دنوں مصحفی کے دیوان ہشتم کی تدوین اِسی خیال کے پیشِ نظر ہو رہی ہے کہ اس میں نئے لغات کا بے اندازہ ذخیرہ موجود ہے جو یکجا ہو کے پیش کیا گیا تو لغت نگاروں کا ایک اہم ماخذ ہو جاتے گا۔

تدوین کا اہم نمونہ دیوانِ جوشش (اور ایک حد تک قطعات دلدار) میں ملتا ہے۔ جو تیس پینتیس سال قبل شائع ہوا تھا۔

اکثر اُردو والے قاضی صاحب کو صرف اُردو کے بڑے محقق کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ اُردو میں اِن کا جو درجہ ہے، اس سے کسے انکار ہے، لیکن فارسی زبان اور ادبیات پر بھی (فارسی کے اس قدر مطالعے کی روشنی میں) اِن کا جتنا وقیع کام ہے، اور جیسی نظر ہے... وہ کسی بھی لحاظ سے اُردو کام سے کم رتبہ نہیں اور ہمارے محققوں میں ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے (ایران میں بھی خال ہی خال ہوگا) جو عہدِ اسلامی کی فارسی زبان و ادب پر ایسی نظر رکھنے کے ساتھ پہلوی اور پرانی فارسی (اولڈ پرشین) پر بھی محققانہ نظر رکھتا ہو۔ غالب اور اس سے

بھی بڑھ کے دساتیر کا جعل ثابت کرنے کے لیے انہوں نے عمر عزیز کے پینتالیس پچاس سال گزرنے کے بعد اس میں مہارت حاصل کی، یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے۔

غالب، شاد اور ابوالکلام آزاد وہ تین موضوع ہیں جن پر بات چھڑ جائے تو پھر تنگ: وہ کہیں اور سنا کرے کوئی! غالب کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ تو ان کا محبوب ترین شاعر ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ انہوں نے بالاستیعاب کئی کئی بار پڑھا ہے۔ اُردو کلام قریب قریب سارا کا سارا ازبر تھا۔ جس کا بڑا حصہ آج بھی یاد ہے باقی رہے شاد اور ابوالکلام تو (غالب کی مانند شاد کو شاعر کی حیثیت سے پسند کرنے کے باوجود) ان دونوں نے اپنے بارے میں غلط بیانی اور مبالغہ سے اس قدر کام لیا ہے اور اپنی عظمت کا ایمج ابھارنے کی ایسی بے جا کوششیں کی ہیں جس سے ایسی طبیعتوں میں جیسی قاضی صاحب کی ہے، ایک شدید ردِّ عمل ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں ان کے لیے ابرجی کا سا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ غالب پر تو ان کے قلم کی بہترین کاوشیں شائع ہو چکی ہیں، البتہ شاد پر (شاد کی کہانی۔ شاد اور حیدرآباد وغیرہ) چند مضامین ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے بارے میں چار چھ متفرق مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن ان شائع شدہ مضامین کی ضخامت سے چار پانچ گنا زیادہ مواد ان دونوں کے بارے میں ان سے گفتگو کے درمیان چند گھنٹوں میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ بس ان کا ذکر چھڑنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب ہمعصروں میں، واجد علی خاں کیمبرج کے ساتھیوں میں، مسٹر نورالدین احمد اور مسٹر فخرالدین علی احمد بے تکلف قریب ترین دوستوں میں اور مولانا محمد علی بزرگوں میں، وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قاضی صاحب بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اور میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو تو شاید وہ محبت سے آگے احترام کا درجہ بھی دے دیتے ہیں۔ اور نورالدین صاحب وہ تنہا شخص تھے جو قاضی صاحب کو ان کے منہ پر بڑے پیار سے کتنی ہی صفات سے متصف کرتے ہوتے تھے جن میں سے کوئی ایک صفت کسی دوسرے کی زبان پر آجاتی تو قاضی صاحب ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیتے مگر یہاں سنتے رہتے اور مسکراتے رہتے۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو ٹوٹ کے پیار کرتے تھے اور کتنا طویل المدت رشتہ تھا یہ! کالج کا ساتھ عمر بھر کا ساتھ ہو گیا تھا۔ یوں کہنے کو کیمبرج کے دوستوں میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) بھی تھے۔ فیض (بمبئی) بھی، کرنل زیدی بھی، عمر حیات ملک بھی، واجد محمود بھی، لیکن پرانی دہلی کے بیرسٹر نورالدین احمد سے جیسی دوستی تھی اس کے آس پاس کچھ پہنچ جاتے ہیں تو بس فخرالدین علی احمد۔ لیکن پھر بھی کتنا بڑا فرق رہ جاتا ہے۔ "تم" سے "تم" کے رشتے ہیں اور "تم" سے آپ کے رشتے ہیں۔

میں کچھ آگے نکل گیا۔ کہنا یہ تھا کہ اپنے اس جگری دوست کے بارے میں بھی جب بے لاگ جائزہ اور رائے کی بات نکلی تو ان کی زبان سے ایسی باتیں بھی نکلیں جو نورالدین کا انتہائی سخت ناقد ہی کہہ سکتا تھا۔ یہی حال ڈاکٹر صاحب کے سلسلے میں رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اور ان سے گفتگو کی جزئیات تک یاد ہیں۔ برلن میں پہلی ملاقات سے لے کر گورنر بہار تک اور پھر صدر جمہوریہ تک! ڈاکٹر صاحب

ں ایک کشش تھی۔ بڑے کلچرڈ آدمی تھے۔ بہت اچھے   تھے۔ مسلمانوں کے لیے بڑا درد تھا اُن کے دل میں۔ جب بھی ذکر چھڑ جائے، یہ اور بہت سی اسی قسم کی باتیں جن سے ذاکر صاحب ایک پیاری قابلِ احترام شخصیت بن کے ابھریں، ان کی زبان پر جاری رہتی ہیں۔ ذاکر صاحب شاید وہ تنہا شخص ہیں جن کے شورے کو بن وعن قبول کرتے رہے۔ ایک سخت تنقیدی (بلکہ معاندانہ) مضمون شاد کی کہانی پر تبصرہ کا آغاز ایسے مدّاحانہ انداز پر کیا جو بقیہ پورے مضمون سے بالکل الگ اور برعکس ہے (اور اس ذیل میں ذاکر صاحب کا طریق کار بھی بتانے لگے کہ کسی نے پوچھا، کیا مولانا آزاد فرنچ سے واقف تھے ذاکر صاحب نے جواب "نہیں" سے شروع نہیں کیا۔ کہنے لگے "جی ہاں، مولانا ترجموں کے ذریعے فرنچ سے خاصے واقف تھے") اس سب کے باوجود ذاکر صاحب علی گڑھ کے سوال پر کیوں خاموش رہے، جین منی سے ملنے گئے تو پیر کیوں چھوتے، نمسکار کرنے کے لیے اپنا وقار چھوڑ کے ہاتھ کیوں جوڑنے لگے تھے، سنسکرت آمیز ہندی میں کیوں قسم لی۔ اور اس قسم کے معلوم عوام اعتراضات میں وہ نہ صرف دوسروں کے ساتھ ہیں بلکہ کچھ زیادہ سختی کے ساتھ تنقید کرتے ہیں۔

منصف مزاجی جب اس انتہا کو پہنچ جاتے تو ہو یہ جاتا ہے کہ پھر زبان اور قلم دونوں اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے انصاف پسندی کے فرشتہ نے اپنے شہپر پھیلا کر زبان قلم دونوں کو ان کے مالک کے قبضہ سے کھینچ کے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

ایک روز بڑی بے بسی سے کہنے لگے، کبھی کبھی تو اپنی اس عادت سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایسی بُری عادت پڑ چکی ہے کہ زبان سے ایسی باتیں نکل ہی جاتی ہیں، سننے والے اس شخص سے جا کے کہتے ہیں، جاننے والا ہوتا ہے اور اسے دُکھ ہوتا ہے تو اس سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے، مگر کیا کروں۔"

اپنے والد کے سوا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو ان کی تنقیدی زد سے باہر نہیں پایا، لیکن تنقید میں نہ تضحیک، نہ استہزا، نہ دل آزاری، بلکہ صرف بیانِ واقعہ!

مرعوب ہونا شاید انہوں نے کبھی جانا ہی نہیں۔ محمد علی، راجن بابو، جواہر لعل نہرو جیسے اکابر سیاست کی ہم نشینی، فخر الدین علی احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے مشاہیر کے ساتھ برابر کی دوستی، عبدالحق، عندلیب شادانی، زبیر صدیقی، عبد الستار صدیقی، اکرام، حمید احمد خاں اور ان گنت مشاہیر ادب کے ساتھ برابر کا اٹھنا بیٹھنا (جو مشاہیر ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا اور ان میں سے کون نہیں جانتا، محترم نہیں سمجھتا) پھر یورپ میں چھ سات برس قیام۔ کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم، اس سے قبل علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم۔ اس علی گڑھ میں جو خود کیمبرج اور آکسفورڈ کا نمونہ بن رہا تھا اور اس سے بھی قبل بالکل بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد بڑا بیٹا ہونے کے ناطے گھر کا مطلق العنان ہو کے ابھرنا، اور گھر بھی وہ جو پٹنہ کے چوٹی کے کھاتے پیتے رئیس گھرانوں میں سے ایک ہو..... پھر مرعوب ہونے کا خانہ ہی کہاں بچتا ہے!

خدایا مجھے سکت دے کہ اپنے آپ کو دیکھ سکوں، ایسا جیسا کہ میں ہوں، بات چیت کے درمیان بودلیر کا یہ قول

قاضی صاحب اکثر دہرا دیتے ہیں اور جرأت ناک حد تک اپنی حدود، وسعت، صلاحیت، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں۔ اس درجہ سختی سے جیسے وہ کوئی دوسرا شخص ہوں جس کے بارے میں ان کی ذمہ داری ان پر آگئی ہو۔

ان کے بارے میں معاصر لکھنے والے لکھ سکتے ہیں (اور آئندہ تو جانے کیا کچھ لکھا جائے) کہ وہ اُردو فارسی کے علاوہ ہندی، عربی، جرمن، لاطینی پر بھی پوری دسترس رکھتے ہیں۔ یہ زبانیں انہوں نے پڑھی ضرور تھیں لیکن زبانوں کا معاملہ یہ ہے کہ مزاولت کے بنا کام نہیں چلتا اور ان سے ملیے تو مولانا آزاد کی طرح جرمن یا لاطینی کی کتاب لے کر نہیں بیٹھ جائیں گے، بلکہ بڑی صراحت کے ساتھ آپ کے ذہن نشین کر دیں گے کہ عربی بہت کچھ بھول گیا، لاطینی اب اتنی کم جانتا ہوں کہ نہ جاننے کے برابر ہے، جرمن بہت کچھ بھول گیا مگر لاطینی کی طرح نہیں، ہندی اب بالکل نہیں پڑھ سکتا، پہلوی رسم الخط بھی بھول گیا۔

وہ کہتے ہیں، آدمی کو سمجھنا میری ہوبی رہی ہے اور (اس کے نتیجے میں) میں اشخاص اور اعمال کا بڑا سخت ناقد رہا ہوں، لیکن دل کی طبعی نرمی نے ایک دن ان سے نہ معلوم کس موڈ میں یہ اعتراف بھی کرا لیا کہ کسی کے بارے میں ایسی بات کہہ کر دُکھ ہوتا ہے جس سے اُسے تکلیف پہنچے، چاہے وہ بات سچ ہی کیوں نہ ہو، خصوصاً کسی ایک شخص کے بارے میں جس سے کوئی علاقہ ہو، یہ الگ بات ہے کہ سچ کہنے سے باز پھر بھی نہیں رہ سکتے۔

جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ لڑکپن اور نوجوانی میں اس مقولے پر اس قدر اعتقاد تھا کہ اپنے پیڈ پر انہیں معنی کا لاطینی جملہ چھپوا لیا تھا۔ اب وہ ایک عرصے سے اس قول پر اعتقاد کھو چکے ہیں۔

تیور، انداز اور اطوار اس قدر کڑے کہ ان کی طبیعت میں نرمی یا گداز ہونے کا سان گمان تک نہیں ہوتا۔ پھر کیسے یقین ہوگا کہ مثلاً بنگلہ دیش تحریک کے زمانے میں کسی ستم رسیدہ کی داستان کے دو جملوں کے بعد تیسرا جملہ سننا ان کے لیے محال ہو جاتا تھا اور دل کی حالت اتنے ہی میں غیر ہو جاتی تھی۔ اور پھر تو رفتہ رفتہ ایسا ہو گیا تھا کہ محض اس ذکر پر ہی ان کا دل بھر آتا تھا۔

بناوٹ یا بننے والے شخص کو پسند ہی نہیں کرتے، یہ ناپسندیدگی نفرت اور حقارت کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ناپسند کرنے اور ذاکر صاحب کو پسند کرنے کی ایک بنیاد یہ بھی ہے۔

اچھے شاعر کے لیے رشید احمد صدیقی کے برعکس قطعی ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ اچھا آدمی بھی ہو۔ خسروؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تینوں کے سلسلے میں اپنے اس نظریے کا اطلاق پوری وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں اور خسروؔ کی دوہلداری، غالبؔ کی ناراست گفتاری، اقبالؔ کی خوشامد اور اخلاقی کمزوریاں دوسرے لوگ چھپاتے ہیں، تاویلیں کرتے ہیں، قاضی صاحب انہیں، جیسے کہ وہ ہیں، اسی صورت میں دیکھتے ہیں اور پیش کر دیتے ہیں۔ خسروؔ قطعی صوفی آدمی نہیں تھے، بلکہ خاصے دنیا دار تھے، غالبؔ موقع و مصلحت شناس، جھوٹے، بددیانت، مالی معاملات میں کمزور طبیعت، خود غرض، کینہ پرور اور مجموعی طور سے خاصے احمق آدمی تھے۔ علمی اعتبار سے خاصے کورے تھے، اتنا کہ تاریخ کو اساطیر سے ممیز نہیں کر سکتے تھے۔ لغت کے میدان میں دخل ضرور دے پڑے حالانکہ وہ اس فن سے نابلد تھے۔ اقبالؔ

معمولی عہدوں کی امید پر ارباب اقتدار کی تعریفوں میں زمین کو آسمان کہہ سکتے تھے۔ گھریلو زندگی میں وہ اچھے شوہر، اچھے باپ، اور اچھے دوست شاید نہیں تھے۔ کلام میں مربوط فکر یا کوئی واقعی فلسفہ ان کے یہاں دور دور تک نہیں ملتا۔

یہ، یا اس قسم کی باتیں خسروؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں کہہ دینے کے بعد کوئی توقع نہیں رکھتا کہ صحرا میں نخلستان بھی آئے گا۔ لیکن جب قاضی صاحب انہی لوگوں کے بارے میں کہنے لگتے ہیں کہ:

مگر خسروؔ کی شاعرانہ عظمت کو ماننا پڑتا ہے۔

مگر ان امور سے غالبؔ کی شعری عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

مگر اقبالؔ کی شاعری میں جو شعری کشش ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔

تو وہ جو صرف سیاہی یا سپیدی کے قائل ہیں، یہ سب کچھ ان کی ذہنی گرفت میں آتے آتے پھسل پھسل جاتا ہے۔

اردو کے ایک معروف محاورے کے مطابق وہ دیگ کا ایک چاول دیکھ کر پوری دیگ پر حکم لگا سکتے ہیں۔ ہماری انتظار میں ایسا کرنا انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً اس طرح جس نتیجہ پر وہ پہنچتے ہیں وہ صحیح ہی ہوتا ہے (اور گفتگو میں وہ اگر چہ اس ایک چاول ہی کا ذکر بھلے ہی کریں لیکن لکھتے وقت جب تک پوری دیگ کو اچھی طرح نہیں کھنگال لیں گے، ان کے قلم سے کچھ نہیں نکلے گا)

ایک مشہور عاشق رسولؐ کا واقعہ تاریخوں میں محفوظ ہے کہ ایک حدیث کے اسناد کے ذیل میں رواۃ میں کسی ایک راوی کے بارے میں انہیں پتہ چلا کہ وہ زندہ ہیں اور کسی دور دراز کے علاقہ میں مقیم ہیں۔ سفر کی چند در چند صعوبتیں اٹھانے کے بعد وہ جب ان تک پہنچے تو دیکھا، گھوڑے کو بلا رہے ہیں اور دانہ کا برتن کھڑکاتے جاتے ہیں جس کی آواز پر گھوڑا پیچھے آتا جاتا ہے۔ برتن اس زاویہ سے رکھا ہے کہ گھوڑے کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن اسناد حدیث کے متلاشی نے دیکھ لیا کہ برتن خالی ہے۔ صرف گھوڑے کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ وہ اس میں چارہ سمجھ کے کھنچا چلا آئے۔ چنانچہ وہ اس طرح پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ عاشق رسولؐ جو میلوں پاپیادہ سفر کر کے اس محترم راوی سے ملنے گیا تھا، خاموشی کے ساتھ الٹے پاؤں واپس پھر گیا۔ سبب پوچھنے والے کو اس نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جو قاضی صاحب بطور اصول جا بجا برتتے ہیں۔ اس نے کہا تھا، جو شخص بے زبان جانور کو اس طرح دھوکے سے بلا سکتا ہے، اس کی روایت پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے متعدد معروف محققوں کی اس قسم کی کوئی ایک معمولی سی بات جس کی طرف میری آپ کی نظر کبھی نہ جائے ان کے ذہن میں محفوظ ہے اور جب وہ اسے سامنے لاتے ہیں تو ان محققوں کے ذہن کی بنیادی کمزوری، کبھی پاکٹ مجتی کا اندازہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تحقیق یوں بھی حق ادا کرنا، حق کو سامنے لانا حق اور صرف حق کہنا ہے۔ تحقیق میں مصلحت اور مصالحت کے خانے نہیں ہوتے اور کتنے ہیں جو اس کڑے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

ولفریڈ اسکیون بلنٹ جو ایک عرصے تک فرانس میں انگلستان کا سفیر رہا اور پھر سرکاری بندشوں سے اکتا کے یہ بوجھ سر سے اُتار کے آزادی خواہوں کی حمایت میں جس سر فروشی کے ساتھ میدان جنگ میں اُترا اور آخر تک جما رہا اور مہدی، سوڈانی، مفتی محمد عبدہ، اور جمال الدین افغانی کے ساتھ جس طرح دوستی نباہی، وہ سب کچھ تاریخ عالم کا ایک تابناک باب بن چکا ہے۔ فیوچر آف اسلام، اسی بلنٹ کی کتاب ہے جس کا ترجمہ مستقبل اسلام کے نام سے ہو چکا ہے اور اکبرالہ آبادی کا نام بھی اس ترجمے کے ساتھ وابستہ ہو کے اسے خود اردو میں ایک پایندہ مقام دلا چکا ہے۔ ان حضرت، بلنٹ نے منجملہ متعدد کتابوں کے متعدد ڈائریاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں کسی جگہ خدا کے بارے میں بھی دو تین صفحوں میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کائنات میں ایک نظم اور نظام ہے، سسٹم اور آرڈر، اور یہ ورلڈ آرڈر مجھے مجبور کرتا ہے کہ کم سے کم اسے ضرور مانوں۔ میں نے جب بلنٹ کا یہ اندراج پڑھا تو خوشی ہوئی۔ بلنٹ مجھے پسند تھا۔ اس لیے یہ جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی جگہ ہٹ دھرمی اختیار کرے اور اس کا اتنا لکھنا میرے لیے کافی تھا۔ "نہیں" سے شروع کر کے اس نے ہاں لکھ دیا تھا، گو طریق کار ماڈرن اور سائنٹفک تھا۔ برٹرنڈ رسل کی خود نوشت میں بھی اس معاملے میں قریب قریب اسی قسم کا اندازِ فکر ہے اور ہماری طلسماتی داستانوں کے شہزادہ کی مانند جب آتن اشاتن بھی چھتے گھونٹ کی تلاش میں نکلا تو بالآخر یہیں پر آ کر دم لیا تھا کہ کچھ تو ہے۔ عہد قدیم میں اس قسم کی ایک مثال، بڑے لوگوں میں شاید تنہا مثال، گیا کے گوتم کے یہاں ملتی ہے، جو اس عظیم درخت کی چھاؤں میں نور۔ رتر کی تلاش میں عمر کے بیٹھا تو اسے پا کے ہی اٹھا۔ "ہمیں بتاؤ کہ وہ کیا ہے؟" دنیا کے بازاری حقیقت اعلیٰ کو بھی کوئی ایسی لین دین کی چیز سمجھ بیٹھے تھے جیسے کوئی پا کے ایسی ہی آسانی سے مٹھی بھر بھر کے دوسرے کے دماغ کی جھولی میں ڈال سکتا ہے۔ وہ اس کا کیا جواب دیتا۔ لوگ اور جھنجلاتے: "تم بتاتے کیوں نہیں؟ بولتے کیوں نہیں تمہارے پاس علم ہے۔ تم نے زندگی اس کی تلاش میں تج دی ہے۔ ہمیں راستہ دکھاؤ گوتم، ہمیں راستہ دکھاؤ! بتاؤ کیا اس دُنیا کا کوئی خالق، مالک، پروردگار کوئی ہے، تو کون ہے، کیا ہے، کہاں ہے (اور کیوں ہے) لوگ چیختے رہے۔ اور کپل وستو کا شہزادہ اپنے نحیف بدن کو بمشکل سنبھالے بوڑھے برگد کی چھاؤں میں بیٹھا دور خلاؤں میں تکتا رہا، تکتا رہا۔ لوگ چیختے رہے اور وہ بس خاموشی سے تکتا رہا۔ تھک تھک کے لوگ ایک کے بعد ایک واپس ہونے لگے، کچھ سمجھ کے، کچھ بے سمجھے بوجھے! اور گوتم کی خاموشی میں سے ایک نغمہ نکل کے منڈلانے لگا:

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

پانے والے رمز کو پا سے گئے۔

قاضی صاحب بڑی صفائی سے (اور قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ) پہلی ہی ملاقات میں آپ سے یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ "میں مذہبی آدمی نہیں ہوں" لیکن ایسا وہ کیوں کہتے ہیں اور مذہب بیزاری ان کے اندر کیسے آئی۔ اس کے دو

بنیادی اسباب ہیں، جو مختلف موقعوں پر باتوں باتوں میں مجھ پر واضح ہوتے ایک تو وہ بنیادی طور سے امن پسند آدمی ہیں اور خون خرابہ، جنگ و جدل، جھگڑے فساد سے سخت نفرت ہے اور مذہب کے نام پر جس قدر خون خرابہ ہوا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ دوسرے مذہب کو لبادہ کے طور اوڑھنے والے لوگ بالعموم مذہب کو جس قدر بدنام کرنے کا باعث بنے ہیں، وہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ایک طرف، اور ستراسی سال کی متنوع زندگی میں مذہب کو مال تجارت بنانے والے افراد کا ذاتی تجربہ دوسری طرف، یہ دونوں چیزیں مل کر کافی تھیں کہ کسی بھی منصف مزاج، حق پسند شخص کو اس مذہب سے دور لے جاتیں! وہ دور ضرور ہوتے لیکن صرف اس مذہب سے جس کا اُوپر بیان ہوا۔ ورنہ مذہب اگر مذہبی اقدار کا نام ہے، منصف مزاجی اور حق پسندی جس کے بنیادی پتھر ہیں، تو ان کا جیسا مذہبی مجھے میرے زمانے میں تو نظر آیا نہیں۔ "سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں" یہ الفاظ کہہ دینا جتنا آسان ہے، ان کا پالن اتنا ہی دشوار گزار مرحلہ ہے، دشوار جو ناممکن کی سرحدوں کو چھوتا ہے، اس ناممکن کو ہمہ وقت ممکن میں ڈھلتے دیکھنے کے بعد کون ایسے شخص کو مذہبی یا لامذہبی کی درجہ بندیوں میں قید کرے گا۔

اقبال نے اپنی ذاتی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے:

"میرے اکثر احباب مجھ سے پوچھ بیٹھتے ہیں، کیا تم خدا کے وجود میں عقیدہ رکھتے ہو؟ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب دینے سے پہلے جو الفاظ یہ استعمال کر رہے ہیں ان کے معنی ان سے پوچھ لوں۔ میرے ان دوستوں کو اس بات کی وضاحت کرنی ہوگی کہ عقیدہ سے ان کی کیا مراد ہے۔ وجود سے وہ کیا مطلب لیتے ہیں اور خدا کو کن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ خاص کر آخری دو کے بارے میں ضرور پوچھنا چاہوں گا، اگر وہ اپنے سوال کے جواب پر مصر ہوں۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھ پایا ہوں۔ اور جب کبھی میں ان لوگوں سے جرح کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح ناواقف محض ہیں۔"

اگر قاضی صاحب قانون داں نہ ہوتے، دو اور دو کو سپاٹ طریقے سے چار کہنے کے عادی نہ ہوتے اور حق پسندی انہیں مجبور نہ کرتی کہ عام آدمی کو اسی کی زبان میں جواب دے کر رخصت کر دیں، تو ان کا فلسفیانہ جواب بھی یہی ہوتا جو اقبال نے دیا۔

عالمی انسان کا تصور ہمارے عہد کے متعدد مفکروں نے پیش کیا۔ رسل کی مانند ایک آدھ دیوانے نے اس پر عمل پیرا ہو کے نمونہ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں کبھی کبھی اس بات پر مسرور سے آگے اپنے کو مغرور سا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اپنے عہد کے ایک عالمی انسان کو میں نے بھی اتنا قریب سے دیکھا ہے سنا ہے!!

قاضی صاحب جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، خدا کو بھی مانتے ہیں تو اسی آفاقی نظر سے۔ بطور ایک سسٹم کے، ایک آرڈر کے! نظم و ضابطہ جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے! کائنات جو ایک ہے، نظام شمسی جس کا ایک معمولی حصّہ ہے، جس میں نظام شمسی کا ایک ادنیٰ حصّہ ہماری زمین ہے! قوم پرستی اور قومیت کے سخت دشمن

ہیں۔ اور اسی آفاقی نظر کے تحت، جانوروں کی طرح لڑتی ہوئی قوموں کی نجات صرف اس میں دیکھتے ہیں کہ ایک عالمی ریاست، ورلڈ اسٹیٹ قائم ہو اور سارے ممالک اس ایک ریاست کے انتظامی صوبے ہوں اور بس! ملنے جلنے میں، تحسین و تقدیر میں، معاملات میں، سب جگہ یہ آفاقی انداز نظر قائم رہتا ہے۔ شیعہ، سنی، ہندو، مسلمان، ہندی، ایرانی، امریکی، انگلستانی سب یکساں۔ فوقیت صرف اس کی ہے کہ کون کتنا عقلیت پسند، راست گو، صاحب علم اور صاف ذہن کا مالک ہے۔

قاضی عبدالودود اواخر ذیقعدہ ۱۳۱۳ھ (۸ رمئی ۱۸۹۶ء) میں پیدا ہوئے اور ۲۵ رجنوری ۱۹۸۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ تقریباً ۸۸ سال کی عمر پائی جس میں وہ صرف ادب اور تہذیب کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے اپنے کو وقف کئے رہے۔ وہ ایسے بے لاگ محقق کی حیثیت سے مدت دراز تک ادب دوستوں کو یاد رہیں گے جنہوں نے سچ کی تلاش میں سچ سننے، سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو مدت تک اسے نبھا دیا۔

سچ صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں!!

(کتاب نما، نئی دہلی، مئی ۱۹۸۵ء)

بقیہ: کتابیات

نور سحر (شاعری)	نور کوہلی	ڈیمائی	۱۴۴	۱۲	"	ناشر / مصنف
نیلا امبر (افسانے)	حمیدہ سلطانی			۲۰	"	ایجوکیشنل بک ہاؤس
واردات	اثر عباسی					
ہر بار کہا دل نے	اودے سن ارمان		۲۲۴	۲۵	"	اردو گھر نما دہلی
ہم ہندوستانی				۲۵۰	"	نیشنل بک ٹرسٹ
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی			۲۵	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا	احمد الحسن آزاد فاروقی			۴۰	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
ہندوستان کے قبائلی بچے	ایس ایس ششی	ڈیمائی	۷۰	۱۰	"	ترقی اردو بیورو
ہندوستان میں فارسی ادب	نعیم الدین			۵۰	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
ہندوستان میں لائبریری کا آغاز و ارتقا	رام شوبھت پرشاد سنگھ	ڈیمائی	۱۴۸	۵۰	"	بھارتی پرکاشن نئی دہلی
ہندی ڈرامے کا ارتقا	ابراہیم یوسف			۲۱	"	

عبد المغنی

اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام

جب کلیم الدین احمد انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے تو انہیں ایف. آر. لیوس جیسے مشہور نقاد کی تعلیم و تربیت سے استفادے کا موقع ملا اور انہوں نے متن و عبارت کے تجزیے کی تکنیک اس مغربی نقاد سے گویا سبقاً سبقاً سیکھی۔ اسی زمانے میں آئی اے رچرڈز نے "عملی تنقید" کا ایک نصاب سا اپنی کتاب PRACTICAL CRITICISM میں تجویز کر دیا۔ اس کے بعد جب کلیم الدین احمد ہندوستان لوٹ کر پٹنہ یونیورسٹی میں یک سوئی کے ساتھ انگریزی ادب کی تدریس میں مصروف ہوتے تو اسی دور میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ اردو ادب میں بلند ہوا اور ضرورت سے زیادہ زور سیاست اور خطابت پر دیا جانے لگا۔ چنانچہ متن و عبارت کے فنی تجزیے کا جو اسلوبِ تنقید کلیم الدین احمد انگلستان سے سیکھ کر آئے تھے اور اپنی انگریزی کلاسوں کے اندر پٹنہ یونیورسٹی کے طلباء کو سکھا رہے تھے، اس کا استعمال انہوں نے پورے ادب کی تنقید میں مجموعی و عمومی طور پر ایک دعوے اور طنطنے کے ساتھ شروع کر دیا۔ نتیجتاً اردو شاعری پر ایک نظر، اور اردو تنقید پر ایک نظر جیسی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان دونوں کتابوں میں شاعری اور تنقید کے متعلق ایک انتہا پسندانہ نقطۂ نظر پیش کیا گیا۔ یہ نقطۂ نظر خالص مغربی تھا، اگرچہ اُسے عالمی ادب کا معیار فرض کیا گیا۔ اس میں نہ صرف یہ کہ مشرق کے ادبی تصورات سے یکسر ناواقفیت کا اظہار کیا گیا یا ان کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا بلکہ مغرب کے بھی عام ادبی تصورات سے عجیب و غریب بے نیازی برتی گئی۔ یہاں تک کہ لیوس اور رچرڈز کے مکتبِ فکر اور طریقۂ کار کو بھی پورے طور پر ملحوظ نہ رکھا گیا۔

اس سلسلے میں مغرب کے ادبی و تنقیدی تصورات سے کلیم الدین احمد کی بے خبری

حیرت انگیز ہے۔ انگلستان میں ان کی طالب علمی کے دوران ہی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ روایت اور انفرادی لیاقت TRADITIONAL AND INDIVIDUAL TALENT کا معرکہ آرا اور عہد آفریں تصورِ ادب پیش کر چکا تھا۔ خود آئی۔ اے۔ رچرڈز جیسے عملی تنقید کے علمبردار کے حسب ذیل کارنامے ادب کا ایک مرکب نقطۂ نظر پیش کر رہے تھے۔

THE FOUNDATION OF AESTHETICS (1921)

THE MEANING OF MEANING (1924) SCIENCE AND POETRY(1926)

THE PRINCIPLES OF LITERARY CRITICISM (1924)

رچرڈز نے اپنے نقطۂ نظر کی تشریح و توثیق کے لیے انیسویں صدی کے اہم ترین رومانی نقاد کولرج کے افکار و خیالات کا حوالہ بھی دیا۔ امپسن EMPSON کی کتاب SEVEN TYPES OF AMBIGUITY بھی اس زمانے میں شائع ہوئی۔ اس طرح عصر حاضر میں بیسویں صدی کی چوتھائی کے اوائل ہی میں وہ تنقیدی خیالات سامنے آ چکے تھے، جنہوں نے جدید انگریزی تنقید کا عام معیار مرتب کیا۔ کلیم الدین احمد کے استاد ایف۔ آر۔ لیوس کو بھی اس معیار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ متن و عبارت کی تشریح پر زور دینے کے باوجود لیوس کا بھی ایک مثبت و مرکب ذہن تھا جس سے کام لے کر اُس نے متعدد انگریزی ادباء و شعراء کا مطالعہ بہ نظر تحسین کیا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسے مابہ النزاع ناول نگار کی قدر شناسی کی۔ انگریزی شاعری کی نئی جہتوں کا سُراغ لگایا۔

اس انگریزی، مغربی اور عالمی معیار کے بالکل برخلاف کلیم الدین احمد نے اُردو شاعری اور تنقید کا مطالعہ سراسر منفی موقف سے کیا اور ہیئت فن کا ایک خود ساختہ معیار فرض کر کے بہت ہی محدود، جزوی اور ناقص طریقے سے اُردو ادب کے بہترین سرمائے پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب و اقبال جیسے عظیم ترین شعرائے اُردو کا موازنہ انگریزی کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں تک سے کر کے اُردو شعراء کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا اعتراض اُردو غزل پر ہے۔ جسے انہوں نے اس کے منفرد و متفرق اشعار کے سبب نیم وحشی قرار دیا اور شعراء کی برتی ہوئی دوسری اصنافِ سخن کا بھی تجزیہ کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ہر صنفِ سخن میں اُردو کے شعراء احساسات کی اصلیت اور اپنے خیالات کی تنظیم کی ان خوبیوں سے عام طور پر محروم ہیں، جو

اچھی اور بڑی شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ تغزل نے پوری اُردو شاعری کو ریزہ کاری بنا دیا اور بڑے سے بڑا اُردو شاعر تصنع اور قافیہ پیمائی، لفاظی اور مبالغہ آرائی سے کام لینے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں نظم نگاری کا ارتقاء اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں ہوا جو انگریزی یا عالمی ادب میں پایا جاتا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ نیز قطعہ و رباعی کے ساتھ ساتھ مرثیہ جیسی بالیدہ و زرخیز صنفِ سخن کے کمالات کا اقرار بھی کلیم الدین احمد نے نہیں کیا۔ اقبال کی غزل گوئی کی تعریف بھی کی تو اس کے اندر پائی جانے والی نظم کی بعض ان خوبیوں کے پیشِ نظر جنہیں وہ اپنے خیال میں معیار فن تصور کرتے ہیں۔ مثلاً تسلسل، ترتیب، تنظیم، جب کہ انہی خوبیوں کی نمایاں کمی انہوں نے اقبال کی بیشتر نظموں میں دکھائی۔ اور اس کے ساتھ ہی اقبال کے طرزِ سخن پر خطابت کا اعتراض کر کے ان کے افکار کی عظمت سے انکار کیا۔ اس معاملے میں موصوف نے فطری شاعری کا بھی ایک خود ساختہ تحلیل پیش کیا۔ اور اس کے تحت نظیر اکبرآبادی کی جزوی تعریف میں مبالغہ آرائی کی۔ حالانکہ نظیر نہ صرف یہ کہ اُردو شعراء کی دیگر خصوصیات کے حامل ہیں بلکہ ان کا فن عام اُردو شاعری کے معیار سے بھی ناپختہ و ناتراشیدہ ہے اور ان کی حیثیت Burns جیسے چھوٹے سے عوامی شاعر سے زیادہ بلند نہیں۔

اُردو شاعری کا تعاقب کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے سب سے زیادہ مذمت ان جدید شعراء کی، جو عام طور پر ترقی پسند کہلاتے ہیں۔ فن کا اپنا خاص پیمانہ سامنے رکھ کر موصوف نے ترقی پسند شعراء کے افکار و خیالات اور طرزِ سخن کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس سلسلے میں ان کا موقف یہ تھا کہ تنظیم ہیئت کے فقدان کا ورثہ تو ان شعراء نے اپنے کلاسیکی پیش روؤں سے پایا، مگر سیاسی افکار کے انتشار کا اضافہ انہوں نے اپنے نیم پختہ سیاسی و معاشی تصورات کے تحت کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی اُردو شاعری محض خطابت اور تبلیغ بن کر رہ گئی۔ ترقی پسند شعراء پر ضرب لگانے کے لیے کلیم الدین احمد نے اقبال کا عصا پوری شدت کے ساتھ استعمال کیا۔ اسی طرح مقابلتاً اور ضمنی طور پر اقبال کی بعض خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند شاعری کی تمام خامیاں واضح کر دیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس معاملے میں بھی حسبِ معمول کلیم الدین احمد کی تنقیدیں بے جا شدت اور حد سے بڑھ کر غلو و مبالغہ سے بھری ہوئی ہیں، لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ ہے کہ موصوف نے نئی شاعری کی بے راہ روی کا پول کھول کر اصولی تنقید کا بہترین فریضہ موثر ترین طریقے سے انجام دیا۔ چنانچہ اس قسم کی جارحانہ تنقید کے باوجود ترقی پسند شاعری

کے بعض غیر فنی رویوں پر روک لگی اور اس کا فکری ادّعا بھی کم زور پڑ گیا۔ یہ ایک صحت مند عمل جرّاحی تھا، جو کلیم الدین احمد کے تیز نشترِ تنقید نے اُردو ادب کے ایک رجحان کے بعض فاسد مادّوں پر بروقت انجام دے کر فن کے بہتر تقاضوں کی طرف نئی نسل کی رہنمائی کی، لیکن وہ صرف جرّاح ثابت ہوئے اور ان زخموں پر مرہم تک نہ رکھ سکے جن پر نشتر لگانے کا فرض انہوں نے اس چستی کے ساتھ انجام دیا تھا۔ کلیم الدین احمد کی یہ ناکامی ان کی تنقید نگاری کی بنیادی خامی کے سبب ہے۔ وہ جرّاح ہو سکتے تھے، طبیب نہیں اور طبیب حاذق ہونا تو بہت دُور کی بات ہے۔ ان کے پاس ادب کی اصلاح و ترقی کے لیے اپنا سوچا سمجھا ہوا اصلی اور مثبت و موثر کوئی نسخہ کیمیا نہ تھا۔ انہوں نے مغرب سے بعض تنقیدی خیالات مستعار لے لیے تھے۔ اور انہیں سب کچھ سمجھ کر حتیٰ کہ مغرب کے بیشتر و بہتر تنقیدی افکار کو نظر انداز کر کے اُردو ادب کے مشرقی طرزِ اظہار کے خلاف فقط ایک منفی ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ اسی ردِّ عمل کا پورا طیش اور غضب ترقی پسند ادب پر نازل ہوا۔ اس غیر حکیمانہ تنقیدی عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ ترقی پسند ادب سے بیزار ہونے والی اُردو ادب کی نئی نسل کے پاس فکر و فن کے وہ ناقص پیمانے بھی نہیں رہ گئے، جن کی بناء پر ترقی پسند کہلانے والے شعراء نے کم از کم اُردو شاعری کا ایک اوسط معیار قائم رکھا تھا اور بڑی حد تک نظم و غزل دونوں کی ہیئتوں کی کلاسیکی خوبیوں سے کام لے کر قارئین اور فن کاروں کے درمیان وہ رشتۂ ہمدردی قائم رکھا تھا، جس کے بغیر نہ تو کوئی ادب پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے ایک تنقید نگار کی حیثیت سے عصری حسیت کا وہ ثبوت نہیں دیا جس کے بغیر مثبت تنقید نگاری نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے اقبال کے عظیم تجربۂ فن کو اپنی تنقید کا معیار بنا کر جدید شعراء کے سامنے کوئی نمونۂ کمال پیش کرنے کی بجائے اپنی بر خود غلط عجوبہ پسندی میں رد کر دیا اور اس کے بعد ترقی پسند تجربے کو بھی رد کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار ان کے پاس نہیں رہ گیا، جبکہ میرؔ و غالبؔ کے قدیم کلاسیکی تجربے کو وہ پہلے ہی رد کر چکے تھے۔ اس طرح جدید ترین اُردو ادب گویا ایک خلا میں سانس لینے لگا اور اس کی علمبردار ہو کر ایک نئی نسل اٹھی، جس کے سامنے اپنے ادب کا کوئی معیار ہی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے فن کا نام لے کر فن ہی کو تباہ کیا اور اُردو شاعری کی ہیئت، اسلوب اور الفاظ سبھی کا قصہ پاک کر دیا۔ اس فنی تباہی کے عالم میں نظم آزاد، نثری نظم، یہاں تک کہ اب آزاد نظم کے وہ مہمل تماشے ہونے لگے، جس سے اُردو شاعری

سے قارئین کو بالکل بے زار کر دیا۔

ادبی صورتِ حال کے اس تجزیے سے آشکار ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد اپنے ادّعائی انداز کے باوجود اُردو تنقید کے مسیحا ثابت نہیں ہوئے۔ ان کی اس نامرادی ہی کا نمونہ ان کی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" ہے، جس میں انھوں نے اُردو شاعری پر ایک نظر سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اُردو میں تنقید کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے تذکرے کے تبصروں کو غیر تنقیدی قرار دیا۔ حالانکہ ان میں متن و عبارت اور الفاظ و ہیئت کی وہی جانچ پرکھ کی گئی تھی، جو کلیم الدین احمد کا بنیادی موقف ہے اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ جانچ پرکھ قدیم انداز کی ذاتی پسند و ناپسند پر مبنی تھی اور اس کا کوئی اصولی و معروضی معیار نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ جدید انداز کی لفظی جانچ پرکھ کے بارے میں کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بنا بھی ذاتی پسند و ناپسند اور مصنوعی نقطۂ نظر پر نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد کے بیشتر تنقیدی فیصلوں کے متعلق بخوبی واضح کیا جا سکتا اور کیا گیا ہے کہ وہ سب صرف ان کی شخصی جانب داری اور تعصب پر مبنی ہیں۔ بس قدیم مشرقی تذکروں اور جدید مغربی اندازِ تنقید میں حدِ فاصل تفصیل و تجزیہ ہے، جس کا محرک و مقصود دونوں ہی ذاتی پسند و ناپسند ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ رہی الفاظ و محاورات سے بڑھ کر ہیئتِ سخن کی وہ تنقید جسے جدید مغربی انداز کا طرۂ امتیاز سمجھا یا سمجھایا جاتا ہے تو یہ بجائے خود ایک مفروضہ Hypothesis, سے زیادہ کچھ نہیں۔ اوّل تو کلیم الدین احمد کا مغربی تصورِ ہیئت ہی ناقص ہے مصنوعی ہے، جس کا اطلاق مشرقی ادب پر انہوں نے زبردستی اور مغالطہ آمیز طریقے پر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہنا سراسر مبالغہ آرائی ہے کہ تذکروں میں ہیئتِ سخن ہی کو مدِنظر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ الفاظ و اسالیب پر تبصرے بالعموم ہیئتِ سخن ہی کو سامنے رکھ کر کیے گئے ہیں۔ مثلاً غزل، قطعہ، قصیدہ، مثنوی، رباعی کے اشعار پر تبصرے ان ہیئتوں کے تناظر میں ہیں۔ صرف ایک مفروضہ عالمی معیار کی تشریح ظاہر ہے کہ ان تذکروں میں نہیں ہے، وہ بھی جب عالمی مطلب کا فقط انگریزی، یوروپی، اور مغربی تک محدود کر دیا جائے ورنہ اُردو، فارسی اور عربی کے بین الاقوامی معیارات ہمارے قدیم تذکروں کو ورثے میں ملے تھے۔

قدیم تذکروں سے آگے بڑھ کر کلیم الدین احمد نے مغرب سے استفادہ کرنے والے جدید اُردو نقادوں پر بھی تباہ کن حملے کیے اور اپنی اس جارحیت میں اس حد تک چلے گئے کہ حالی کو ہی سب سے بڑا نقاد قرار دے دیا۔ اگرچہ ان کے معیارِ نقد کو بھی خام اور ناقص ثابت کرنے

کے بعد۔ تعجب ہے کہ فن پر زور دینے کے باوجود کلیم الدین احمد نے شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" کی عظیم الشان تنقیدِ فن کو وہ اہمیت نہ دی جو حالی کی فکری تنقید پر مشتمل مقدمہ شعر و شاعری کو۔ اِس صورتِ حال سے کلیم الدین احمد کا وہ ذہنی تضاد بھی آشکار ہوتا ہے، جو ان کی تمام تنقیدوں کو ایک گورکھ دھندا بنا دیتا ہے۔ معروضی اصول کا حوالہ دے کر ذاتی پسند کا اظہار تو ان کے ہاں عام بات ہے۔ ان کے ادبی موقف اور طریقۂ کار کے درمیان مطابقت بھی نہیں۔ اس پراگندہ خیالی کی ایک مثال تو یہی حالی و شبلی کے درمیان ان کی غیر منطقی ترجیح ہے۔ دوسری اور اس سے بدرجہا بدتر مثال ان کی ایک حالیہ کتاب "اقبال۔ ایک مطالعہ" میں سامنے آئی۔ اس مطالعہ میں انہوں نے حسبِ معمول فن پر تنقید کا دعویٰ کیا ہے لیکن صریحاً اس تنقید کی بنا اقبال کے افکار و خیالات پر رکھی ہے اور جا بجا ان سے جارحانہ قسم کی بحث بالکل جذباتی طور پر کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو اقبال کے نظریۂ حیات سے شدید اختلاف ہے اور وہ شاعری میں اس کے اظہار کے روادار نہیں، لیکن چونکہ دعویٰ تنقیدِ فن کا ہے لہٰذا فن کے نام پر اور اس کے حیلے کے تصورات و خیالات پر بالکل ناروا اور نا معقول حملے کرتے ہیں۔ بہر حال حالی کے لیے کلیم الدین احمد کی وجہ ترجیح، پیروی مغربی کی وہ تلقین ہے جو حالی نے اپنے مشرقی ہونے کے باوجود کی تھی۔ یہ تلقین جیسا خود کلیم الدین احمد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے مغرب سے حالی کی واقفیت پر مبنی نہیں۔ بس رواجِ زمانہ کا ایک نشان ہے، جسے ہم بہ آسانی مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور ایک سطحی رویہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہی مرعوبیت اور رویہ حالی اور کلیم الدین احمد کے درمیان مشترک ہے اور کلیم الدین احمد کے تنقیدی موقف کی بنیاد یہ شخصی حادثہ ہی ہے۔ کوئی اصولی موقف نہیں۔ اس معاملے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کلیم الدین احمد اپنے ہم عصر اور ہم چشم اردو نقادوں کی تحقیر کے لیے حالی جیسے جدید تنقیدی معیاروں سے بے خبر ناقد کو بھی ان باخبر ناقدوں سے بہتر قرار دے دیتے ہیں۔ جو جدید اسلوبِ نقد میں کلیم الدین احمد کے حریف ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں آل احمد سرور اور احتشام حسین کی تنقیدیں حالی کی تنقید نگاری سے آگے ہیں اور خود کلیم الدین احمد کا پورا ضخیم و جسیم سرمایۂ تنقید ان دونوں اردو نقادوں سے وصف میں کم تر ہے۔ اس طرح اردو تنقید پر ایک نظر میں تنقیدی حربے زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور کمالات کم دکھائے گئے ہیں۔

بہر حال کلیم الدین احمد نے اردو شاعری اور اردو تنقید پر جو کچھ لکھا اس کے لیے اپنے ادبی تنقید کے اصول واضح نہیں کئے، بلکہ چند مفروضوں کو ذہن میں رکھ کر صرف عملی تنقید کی۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں ایک مقالہ 'کلیم الدین احمد کی ناقدانہ حیثیت' کے عنوان سے "اردو ادب" علی گڑھ میں تحریر کیا اور اس میں موصوف کی اس تنقیدی خامی کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں کلیم الدین احمد کی کتاب 'عملی تنقید' شائع ہوئی اور عرض ناشر کے تحت اعلان کیا گیا کہ ہر ایک حصہ کے ساتھ ایک مقدمہ بھی ہوگا جس میں اس حصے کے متعلق تنقیدی اصولوں سے بحث ہوگی۔ چنانچہ عملی تنقید کے مقدمے میں یہ بحث ہے۔ لیکن یہ پھر وہی غزل والی پرانی بحث ہے جو نظم تک پہنچتی ہے، مگر وہ ادبی اصولِ تنقید نہیں ہیں، جن سے کلیم الدین احمد کے ادبی نقطۂ نظر اور تنقیدی موقف کی وضاحت ہوتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ زندگی اور تہذیب کے لیے ادب سے کیا چاہتے ہیں اور ان کا تنقیدی مطمحِ نظر کیا ہے؟ لہٰذا عملی تنقید صرف کلیم الدین احمد کے عام تنقیدی رویے کا ایک نشان اور اعلان بن کر سامنے آئی اور خود ان کے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ ان کا سرمایۂ نقد فقط عملی تنقید ہے اور وہ نظری تنقید سے بہرہ ور نہیں یا اس کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہیں۔ ہر حال میں یہ کسی ناقد کا بنیادی نقص ہے کہ وہ کسی نقطۂ نظر اور معیارِ فکر کے بغیر تنقید نگاری جیسی ذمہ داری کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرے۔ یہ نقص کلیم الدین احمد کی بہت بڑی کمزوری ہے اور اس کے سبب ان کی تمام تنقیدیں سست بنیاد اور غیر حقیقی ثابت ہوتی ہیں۔ پھر یہی وجہ ان کے ذہن میں تضاد اور پراگندگی کی ہے۔ وہ ادب و شاعری میں مربوط ارتقائے خیال کا نعرہ بلند کرتے ہیں، لیکن زندگی اور ادب کے متعلق خود کوئی مربوط نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ لہٰذا ان کی فکر غیر منظم اور ان کا طریق کار غیر مرتب ہے۔ اسی صورت حال کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہمارے سامنے ہے کہ ۱۹۷۶ء میں کلیم الدین احمد نے خواجہ غلام السیدین میموریل لکچرز کے تحت 'ادبی تنقید کے اصول' پر جو خطبہ دیا اور اس میں مغربی نقادوں کے حوالے سے تنقید کے وہ سارے ضروری اصول بڑی جامعیت گرچہ اختصار کے ساتھ درج کر دیئے، جو ایک مرکب اور مکمل تنقیدی نقطۂ نظر کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ ان اصولوں کا بہت ہی کم تعلق کلیم الدین احمد کے تنقیدی عمل سے ہے۔ جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ کلیم الدین احمد کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں یا ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو کچھ جانتے ہیں اس کا اظہار

تنقید میں کیسے کریں۔ لہٰذا یہ خطبہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جس کے آگے اور پیچھے عمل و اطلاق کی کوئی شہادت نہیں۔ گویا فقط مفروضے Hypothetical منزل میں ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کے پورے تنقیدی کردار کے عین مطابق ہے، جو شروع سے آخر تک مفروضاتی Hypethetical قسم کا ہے ہی۔ یا یہ خطبہ صرف حقائق کا بیان ہے اور کلیم الدین احمد کے اپنے ادبی اصول پر مشتمل نہیں ہ موصوف کی تمام تنقیدی کاوشوں کے پس منظر میں اس سوال کا جواب اثبات میں ہی ہوگا۔ بہر حال خیال مابعد After-thought کے طور پر سہی، اس خطبے میں کلیم الدین احمد نے عالمی ادبی افکار سے اپنی آگاہی کے ساتھ تنقید ادب کے لیے ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اور معاشیات و نفسیات وغیرہ کی ان بھول بھلیوں سے تنقید کو بچانے کی کوشش کی ہے، جس میں زمانۂ حال کی اُردو تنقید کا ایک بڑا حصہ اُلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

میرے خیال میں کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت کا سب سے عمدہ اظہار ان کی کتاب 'فن داستان گوئی' میں ہوا ہے۔ اس میں بڑی حکمت و نفاست کے ساتھ ایک بہت پھیلے ہوتے ادبی مواد کو سمیٹ کر نہایت مربوط و منظم، واضح اور محکم طریقے پر فکر انگیز تنقیدی مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ صحیح معنی میں ادبی احیاء و تجدید کا ایک کارنامہ ہے۔ اگرچہ اس کے مضمرات محدود ہیں۔ داستان گوئی اُردو افسانہ و ناول کی بیش قیمت روایت اور اس کا بنیادی سرمایہ ہے۔ اس کی تکنیک کی قدا ت سے قطع نظر، اس کا قصہ پن، اس کا تجسس، اس کا ماجرا اپنے اندر افسانہ و ناول نگاری کے وہ اسرار و رموز رکھتے ہیں، جو کسی بھی ادب کی متعلقہ اصناف کے لیے رہنما اصول بن سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کی کتاب عملاً اس اصول پر تاکیدی نشان لگاتی ہے۔ یہ نشان عصرِ حاضر کے اُردو افسانہ و ناول نگاری کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے۔ جو فن کار اساطیر و علامت کی تلاش میں قدیم داستانوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں، انہیں اِن داستانوں سے فنِ قصہ گوئی کے چند نقطے بھی سیکھنے چاہئیں۔ ورنہ مجرد علامات لے کر قصے کے پورے ہیولے کو نظر انداز کر دینا اور ماجرا سازی سے بے پروائی برت کر ناقابلِ فہم فلسفہ طرازی اور انشا پردازی میں مبتلا ہونا افسانہ و ناول کی پوری تکنیک کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے جیسا آج کے اُردو افسانے میں نظر آرہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داستان گوئی کے دور سے ترقی پسند تحریک تک اُردو افسانہ و ناول نے جو شاندار ترقی کی ہے، اسے ہمارے

جدید افسانہ نگار بالکل زائل کر کے قدیم داستانوں کے دور سے بھی پیچھے وحشتِ فن کے ایک پُراسرار جنگل میں جا بسیں گے۔

کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت کی دوسری دستاویز ان کے مضامین کا مجموعہ "سخنہائے گفتنی" ہے، جس کے چند مضامین بہت فکر انگیز ہیں اور اُن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے تہذیبی عمل پر کلیم الدین احمد کی نظر وسیع اور گہری تھی۔ یہاں میں خصوصیت کے ساتھ مجموعے کے آخری مضمون "ریڈیو اور کلچر" کا ذکر کروں گا۔ اس میں ناقد نے بتایا ہے کہ کس طرح ریڈیو اپنے سستے تفریحی پروگراموں کے ذریعے فنونِ لطیفہ کی متانت پر ضرب لگا کر کلچر کی تباہی کا سامان کر رہا ہے اور سب سے بڑھ کر گویا تہذیبی سرگرمیوں کا ایک بدل بن کر ذوق و شعور کی تربیت کا دروازہ بند کر رہا ہے۔ اس مضمون میں صورتِ حال کی پوری تشریح بڑی باریکی سے کی گئی ہے اور نہایت دوراندیشی پر مبنی حقیقت پسندانہ تجزیے کیے گئے ہیں اور کئی ادبی گوشے منور ہوتے ہیں۔ یہ اُردو کی ظریفانہ روایت، ہجویہ شاعری اور مزاحیہ اور طنزیہ انشاپردازی کا ایک اچھا جائزہ ہے۔ اس سے ناقد کی وسعتِ نظر اور حسِ لطیف کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تحقیقی مضمون 'دیوانِ جوشش کا ایک قلمی نسخہ' بھی دعوتِ نظر دیتا ہے۔ اس سے ناقد کے ذوقِ تحقیق کا سُراغ ملتا ہے۔ بعد میں اِسی ذوق کا سب سے اہم نمونہ کئی جلدوں میں "کلیاتِ شاد" کی ترتیب سے ہمارے سامنے آیا۔ اس سے عالمانہ تحقیق و ترتیب کے لیے کلیم الدین احمد کی ریاضت کا ثبوت ملتا ہے، لیکن بعض وقت اعداد و شمار کے ہجوم میں تنقیدی نقطۂ نظر غائب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کلیاتِ شاد، تحقیق کا جتنا اچھا نمونہ ہے تنقید کا نہیں۔ یہ چیز شاد کے بعض اشعار کے مختلف متون پر بحث سے بھی آشکارا ہے۔ اس کے علاوہ مقدمۂ کتاب میں 'تثلیثِ غزل' کی جو بات کی گئی ہے اور جس کا ایک رُکن میرؔ و غالبؔ کے ساتھ شادؔ کو قرار دیا گیا ہے۔ وہ چغلی کھاتی ہے کہ نقاد کچھ تو اُردو شاعری پر ایک نظر میں شادؔ کو نظرانداز کرنے کی تلافی چاہتا ہے اور کچھ تحقیق کی اُمنگ نے اُس کی تنقیدی حس کو کند اور فقط شوقِ دریافت کو تیز کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات محققانہ و ناقدانہ توازن کو مجروح کرنے والی ہے اور اس میں حربہ اندازی کا رنگ ہے۔

کلیم الدین احمد نے شاعری بھی کی اور نظموں کے دو مجموعے '۴۲ نظمیں' اور '۲۵ نظمیں'

کے عنوانات سے شائع کرتے۔ انہوں نے اُردو شاعری پر جو اعتراضات کئے تھے۔ ان کے پیشِ نظر جب ان کی اپنی نظموں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سرے سے جذبۂ شاعرانہ ہی مفقود ہے۔ نہ اصلیت ہے نہ واقعیت۔ بس کچھ نیم پخت اور نیم بالغانہ شخصی و رومانی قسم کے احساسات ہیں، جن کی تہہ میں جنسی اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان نظموں کے اندر پُر تکلّف کوشش کے باوجود وہ تخلیقی ارتقائے خیال ربطِ اشعار اور تنظیم ہیئت نہیں ہے، جس کا پوری اُردو شاعری سے مطالبہ کلیم الدین احمد اپنی تنقیدوں میں مسلسل کرتے رہتے تھے اور جس کی اُردو شاعری میں سخت کمی کا شکوہ کر کے انہوں نے بڑے سے بڑے اُردو شاعر کی عظمت سے انکار کر دیا تھا۔ حیرت ہے کہ بہت ہی سطحی جذبات پر مشتمل ایسی ناقص قسم کی نظموں کی اشاعت کلیم الدین احمد نے کس ذوق کے تحت گوارہ کی؟ کیا ان کے بہتیرے تنقیدی بیانات کی طرح ان کے اشعار بھی محض اسٹنٹ ہیں، جن کا مقصد اُردو شاعری سے ایک طرح کا تمسخر اور اُردو ادب کے ساتھ گویا مذاق ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ نظموں کے یہ مجموعے کلیم الدین احمد کی ادبی شخصیت کو بہت مشتبہ بنا دیتے ہیں اور ان کے ذہن و کردار کو نفسیات کا ایک مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

اس مسئلے پر روشنی کلیم الدین احمد کی خود نوشت سوانح عمری 'اپنی تلاش میں' سے پڑتی ہے، جسے پڑھ کر ان کے نفس کی عجیب و غریب گتھیاں ہمارے سامنے آتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں بڑی ہی الجھنیں ہیں۔ سب سے بڑی اُلجھن تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ کلیم الدین احمد اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی تصویر اور اپنے خاندان کا نقشہ پیش کر کے یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ کیچڑ میں کھِلا ہوا ایک کنول ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے اپنے بزرگوں کی جو کردار نگاری اپنی کتاب میں کی ہے اگر کوئی دوسرا کرتا تو انہیں کسی عدالت میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ دائر کرنے کا قانونی حق ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی شخصی صاف بیانی کو دیانت داری اور راست بازی یا حقیقت پسندی وغیرہ کے نام دیئے جائیں۔ جب کہ اس سلسلے میں مغرب کی Cardid کہلانے والی سوانح عمریوں کی مثال موجود ہے۔ مگر زبانِ تنقید ضرور یہ سوال کرے گی کہ اوّل تو جب مشرقی معاشرہ ابھی مغربی معیارِ تہذیب پر نہیں آیا ہے تو اس کے سامنے اپنے آپ کو عریاں اور اپنے بزرگوں کو رسوا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ بھی جنونِ عشق میں گریبان

چاک کرنے کا کوئی متعزلانہ شوق ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی میں ملبوس رہنے کے باوجود ادب میں لباس اُتارنے کا مقصد اور فائدہ کیا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پردہ دری سے نئی نسلوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کے ذہن و کردار کی تربیت اور تعمیر ہوتی ہے یا تخریب و تباہی؟ یقیناً ان سوالات پر بحثیں ہوں گی اور ہوتی رہی ہیں۔ مگر جس نقطۂ نظر سے یہ سوالات اُٹھائے گئے ہیں ادب و تہذیب کے لیے اس کی ایک اہمیت اور وزن ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق، شاعری اور سوانح عمری کے دائروں میں کلیم الدین احمد کی کاوشیں بہت ہی معمولی ہیں اور ان کا جو کچھ ادبی سرمایہ ہے، تنقید ہی ہے۔ یہ تنقید بھی اصلاً اولاً اور عموماً عملی تنقید ہے اور کسی معین تصورِ ادب اور واضح اصولِ تنقید سے خالی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بڑے تنقیدی کارناموں کے بعد جو کچھ اظہارِ خیال کیا ہے اس کا اطلاق ان کے عمل تنقید سے ہوتا ہی نہیں اور وہ الگ سے صرف تصور و اصول کے مستقل موضوع پر ایک بحث معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال کلیم الدین احمد کی عملی تنقید خود تنقید اور شاعری پر ہے۔ یہ ایک پارہ پارہ قسم کی تنقید ہے، جس میں متن و عبارت۔ کے تجزیے جہاں تہاں سے اقتباسات لے کر جزوی طور پر کر دیتے جاتے ہیں۔ اور انہی کی بنا پر سخت قطعی نتیجے نکالے جاتے ہیں۔ یہ کسی زندہ و سالم ادبی وجود کا کلی مطالعہ نہیں۔ کٹے پھٹے چند موجودہ اعضائے تخلیق کی بعد از مرگ تشریح الابدان ہے۔ اور چیر پھاڑ کا یہ عمل جراحی ایک ہسپتال ( ) کی یاد دلاتا ہے۔ چنانچہ قاری کے سامنے موضوع تنقید بالشانہ جراحی کی صرف چند قاشیں آتی ہیں۔ جن سے بس گوشت کی قسم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس جسم و روح کا نہیں، جس کے گوشت سے یہ قاشیں تراشی گئی ہیں۔ یہ اسلوبِ نقد صرف تشریحِ عبارت کے ایک سلیقے پر مبنی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ طریقہ کلیم الدین احمد کو خوب آتا ہے۔ ان کا طرزِ بیان بہت صاف وسلیس واضح اور قطعی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تسلسل و استقلال کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر الفاظ و عبارات کا تجزیہ موشگافی کی حد تک کر سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ تجزیہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ مگر اس کی تیزی و تندی میں ایک حسِ مزاح کچھ چاشنی پیدا کرتی ہے۔ اور طعن و طنز سے ایک گرما گرمی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ ایک ہجویہ Satirical انداز ہے اور اس میں سرکہ جبینی کی کیفیت نمایاں ہے۔ بہر حال اس میں ایک مزاح ہے جس سے سرد تشریح و تجزیہ میں کچھ جان

آتی ہے۔ اور زورِ بیان کے ساتھ ساتھ خوش طبعی کا احساس ہوتا ہے۔ گرچہ متعدد بیانات میں استہزاد و تمسخر اور خندۂ بے جا کی مثالیں کھٹکتی ہیں۔ بجزیے کی متانت میں تبصرے کی ظرافت کا یہ رنگ علمی نثر کی ثقالت کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ثقالت میں ایک فرق پیدا کرتا ہے اور اس سے بعض وقت ناقد کے رویّے کے بارے میں کچھ شبہ ہوتا ہے۔ اس شبہ کو مزید تقویت ادّعا و تحکم کے اس انداز سے ملتی ہے جو کلیم الدین احمد کے اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔ بے شک وہ دو ٹوک فیصلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ مگر اس میں فتوے کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔

یہ عملی تنقید اور اس کا منطقی اسلوب جیسا اور جتنا کچھ بھی ہے اُردو تنقید میں کلیم الدین احمد کا اضافہ ہے اور ایک علمی کارنامے کی حیثیت سے زندہ رہنے والی چیز ہے۔ اس تنقید کا جوہر ہم عصر ادب پر ان تبصروں میں کھلتا ہے، جن کی حیثیت تنبیہ الغافلین کی ہے۔ سہل انگار اور کج فکر ادبا و شعراء کی بے اعتدالیوں اور بے راہ رویوں پر یہ تنبیہ کچھ مفید سبق دیتی ہے، جسے سیکھنے کی کوشش اصلاح و ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کا رول انگریزی ادب میں اٹھارویں صدی کے تنقیدی آمر، ڈاکٹر جانسن کی یاد دلاتا ہے، جو کلاسیکی خوبیوں پر زور دینے کے لیے ضابطے تجویز کرتا تھا، لیکن انگریزی ادب کا وہ دور تنقید کی ابتدا کا تھا اور بن جونسن اور ڈرایئڈن کے بہت معمولی و جزوی نمونوں سے زیادہ کوئی چیز ڈاکٹر جانسن کو اپنے ادبی موقف کی روایت میں نہ ملی تھی، جب کہ اُردو میں شبلیؔ و حالیؔ کی معرکہ آرا تنقیدوں کے علاوہ عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے نمونے کلیم الدین احمد کے سامنے تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جانسن کے دور کے برخلاف بیسویں صدی میں آل احمد سرورؔ، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین جیسے ان ہم عصروں کے ساتھ کام کر رہے تھے جو انہی کی طرح مغربی تنقید اور عالمی ادب کی ترقیات سے واقف تھے اور ایک شغلِ مشترک میں کلیم الدین احمد کے ساتھ تبادلۂ خیال اور تعاون کر سکتے تھے، لیکن ایلیٹ اور لیوس کی فہمائش کے باوجود کلیم الدین احمد Commen pursuit کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے اُردو تنقید کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اور اس عالم انکار میں وحدہٗ لاشریک رہنا پسند کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انیسویں صدی کے بصیرت مند رومانی نقّادکولرج کو چھوڑ کر اسی صدی کے آخر میں وکٹورین نقاد میتھو آرنلڈ کا معلمانہ طرزِ تنقید اختیار کر لیا اور اس کی طرح ایک قسم کے Touch stone Method پر زور دیا۔

انھوں نے عالمی ادب اور آفاقی ذوق کی بات بھی اس طرح کی، جس طرح آرنلڈ اپنے ہم عصر انگریزوں سے انہیں تنگ نظر اور بد ذوق قرار دے کر کیا کرتا تھا، لیکن آرنلڈ نے اعلیٰ و سنجیدہ تنقیدِ حیات کا جو تصور پیش کیا تھا، کلیم الدین احمد اس کی گہرائیوں اور وسعتوں تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے واقعہ یہ ہے کہ آرنلڈ کے بحرِ تنقید کے ساحل سے صرف خذف چینی کر لی۔ اور اسلوبِ نقد میں اصرار و تکرار کا ایک طرزِ بیان اس سے سیکھ لیا۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انگریزی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تو کلیم الدین احمد کو ہوا ہی نہ لگی۔ خود اپنے استاد ایف۔ آر لیوس سے بھی انہوں نے تجزیۂ متن اور تشریحِ عبارت سے آگے بڑھ کر عظمتِ فن کے اقرار و اثبات اور مثبت تعمیری تنقید کے گُر نہ سیکھے۔ ایلیٹ نے شغلِ مشترک کی بات کی تھی اور لیوس نے اپنی ایک کتاب ہی کا نام Common Pursuit رکھ دیا۔ مگر جیسا ابھی بتایا گیا کہ کلیم الدین احمد نے اس تنقید کے خلاف کام کیا۔ آئی۔ اے رچرڈز کی پیروی و نقالی کلیم الدین احمد نے ضرور کی اور اس معاملے میں اس حد تک گئے کہ اس کے استعمال کردہ عنوانات کو اپنا ورثہ سمجھ کر اپنی ایک کتاب 'عملی تنقید' اور ایک خطبے "ادبی تنقید کے اصول" کے نام ہی رچرڈز کی حسبِ ذیل کتابوں کے ناموں سے ترجمے کر لیے: PRACTICAL CRITICISM PRINCIPLES F LITERARY CRITICISM لیکن 'عملی تنقید' کے طرزِ تنقید کے علاوہ رچرڈز کے تصورات کی وسعتوں کا بھی کوئی عکس کلیم الدین احمد پر نہ پڑا۔ اور وہ تنقید میں اپنی تنگیٔ داماں کا علاج نہ کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ کلیم الدین احمد نے ایسے تنقیدی افکار کی اشاعت میں بہت کم حصہ لیا جن کی روشنی میں پرورشِ ذوق اور تربیتِ شعور کی وہ ادبی فضا بنتی ہے۔ جس میں اچھے اور بڑے ادب کی تخلیق بھی ہوتی ہے اور قدر شناسی بھی۔ اس طرح انہوں نے تنقید کا سب سے بڑا فریضہ انجام نہیں دیا۔ ان کا کام صرف ابتدائی اور بنیادی قسم کا ہے۔ جس میں بھی تخریب کا پہلو نمایاں ہے۔ انہوں نے ادب کی تسلیم شدہ مشرقی اقدار کی تردید کی اور اسی جہت سے غزل کو نشانۂ ملامت بنایا۔ حالانکہ اگر وہ سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ تاریخی و عرانی طور پر اگر مغربی ادب کا طرۂ امتیاز تمثیل ہے تو مشرقی ادب کا امتیازی نشان غزل ہے اور یہ بھی تمثیل کی ہی طرح تنظیمِ فن کی ایک صورت ہے، جبکہ مشرقی ادب میں فنی تنظیم کی دوسری چھوٹی بڑی ہیئتیں بھی رباعی و قطعہ اور قصیدہ و مثنوی وغیرہ کی شکلوں میں موجود ہیں۔

محمد حسن

بیدی کا فن

بیدی کا فن رمزیت، تہ داری اور مدھم لب ولہجے کا فن ہے۔ تہ داری اور رمزیت نفسیاتی دروں بینی سے پیدا ہوتی ہے اور نفسیاتی دروں بینی کو دانش عصر کی سب سے بڑی دین کہا گیا ہے جو رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ فکری اعتبار سے انسانی تہذیب کی تاریخ ذہن کے پیکر محسوس سے تجرید وتعمیم کی طرف ارتقا کی داستان ہے۔ اسی لیے عہد عتیق کے افسانوں میں مرئی اور مادی کردار جسمانی اور ظاہری خصوصیات سے متصف اور انداز بیان نمایاں برجستہ اور مرصع ہوتا تھا آج کے عالمی افسانوں میں بنیادی کشمکش مرئی اور مادی نہیں نفسیاتی اور داخلی ہے اور کردار حسن وجمال، عمل اور ماورائی طاقتوں سے متصف ہونے کے بجائے پہلو دار اور پیچیدہ ہیں۔ اردو افسانے میں ہنوز اس قسم کی کہانیوں کا عام طور پر چلن نہیں ہوا اور چند افسانہ نگاروں نے اسے برتا تو وہ نفسیات کی بھول بھلیوں میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ سماجی پس منظر کا احساس کھو بیٹھے۔

بیدی کے افسانے اس جدید افسانوی مزاج سے کافی قریب ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بیدی کے اعصاب پر نہ عورت سوار ہے نہ شاعری، نہ وہ محض رومانی ہیں نہ محض جذباتی۔ مہدی افادی نے محمد حسین آزاد کو اردوے معلی کا ہیرو قرار دیا تھا کہ ان کا انداز بیان نہ سرسید کی طرح معقولات کا دست نگر ہے۔ نہ حالی اور شبلی کی طرح سیرت، علم تاریخ اور علم کلام کا یہی بات اردو افسانے کے ہیرو بیدی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے بیدی ہمارے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن سے اگر رومان اور سیاست چھین لیے جائیں تب بھی ان کا قلم اپنی روانی نہ بھولے گا۔

رومان اور سیاست قابل اعتراض موضوعات نہیں لیکن کسی زبان کے افسانوی ادب کا گنے چنے چند موضوعات میں محدود ہو کر رہ جانا اس ادب کے لیے فال نیک نہیں ہے۔ اس سے فکر کی تازگی مجروح ہوتی ہے اور فکر کی تازگی اور بیان کی ندرت ہی تو فن کے معجزے ہیں۔ رومان اور سیاست میں بڑا نشہ ہوتا ہے۔ دونوں فوری طور پر اعصابی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس فوری تحریک کے جادو کے سہارے نسبتاً خشک اور غیر دلچسپ باتیں بھی برداشت کر لی جاتی ہیں مگر ان دونوں کو براہ راست موضوع نہ بنانا بڑی جرأت رندانہ کا کام ہے۔ ذرات کو حریفوں کے لیے وہی چھوڑ سکتا ہے جو خورشید پر بڑھ کر ہاتھ ڈال سکتا ہو۔ اس کے لیے فکر پر اعتماد اور فن پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بیدی کے افسانوں کا بنیادی موضوع کیا ہے؟ انسان کا بے کل باطن، بے کل اس لیے کہ وہ جلد جلد بدلتے ہوئے ہر دم تغیر پذیر سماج کا جزو ہے اور اس تغیر پذیر سماج، اس کے عوامل اس کے خارجی مظاہر اس کے انسانی رشتوں سے وہ برابر اپنے رابطے کا تعین کرتے رہنے پر مجبور ہے۔ کبھی یہ رابطہ ارتباط کا ہوتا ہے،

کبھی تصادم کا، کبھی زندہ دلی، کبھی بے دلی، کبھی شکست، کبھی تشکیل تو کبھی وہ سماج کے سانچے میں ڈھلتا ہے، کبھی سماج اس کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور ان دونوں طریقہائے کار میں ایک ذرا سا جزو اس کی شخصیت میں ایسا بھی رہ جاتا ہے جو اس سانچے سے نکل بھاگتا ہے اور اپنی فطری توانائی کی دہائی دیتا ہے۔

اس بے کل باطن کے مطالعے کے سلسلے میں دو باتیں اور بھی قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ زیر مطالعہ باطن غیر معمولی یا غیر صحت مند انسانوں کا نہیں ہے۔ البتہ ان انسانوں کو جنھیں ہم ایک مدت سے جانتے اور پہچانتے تھے اچانک ہم انھیں ایک نئے انداز سے دیکھتے ہیں۔ بیدی کو مجرموں اور مریضوں سے شوق نہیں ہے۔ وہ جب ان کا ذکر بھی کرتا ہے تو انھیں انسانی روپ دے کر بڑا بھولا بھالا، بڑا صحت مند بڑا نارمل سا بنا دیتا ہے (زین العابدین ایک چادر میلی سی) وہ عام طور پر اپنے کرداروں کے اس حصے سے متاثر ہوتا ہے جو سماج سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ لیکن اس ہم آہنگی میں ان کی شخصیت کا ایک ریشہ ایک جزو باغیانہ انداز سے الگ ہو کر جبلّی خواہشات کی نشاندہی کرتا رہ جاتا ہے۔ بیدی کو نارمل انسانوں کے انھیں غیر نارمل سے دلچسپی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیدی کے ہاں نفسیات کا لفظ فرائڈ کے ہم معنی نہیں ہے نہ وہ اسے جنسیات کے مترادف سمجھتے ہیں۔ نہ محض خود کلامی یا تحلیل نفسی کے۔ نفسیات کا لفظ غلطی سے ہمارے یہاں کچھ تحلیل نفسی کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نفسیات کے معنی یا تو جنسیات کے ہو کر رہ گئے یا غیر صحت مند شخصیتوں کے مطالعے کے۔ نفسیات فرد کی باطنی کیفیات کے مطالعے کا نام ہے لیکن فرد جہاں فرد واحد ہوتا ہے وہاں اپنے علائق و عوامل کے اعتبار سے سماج کا ایک جز ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ سماجی پس منظر سے بے نیاز ہو کر غیر ممکن ہے۔ اسی لیے نفسیات کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ اس کا مطالعہ سماجی پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کو غیر معمولی سے زیادہ عام انسانی ذہن سے سروکار ہے۔ یہ عام انسانی ذہن نہ جنسیات کے لیے وقف ہے نہ سیاست کے لیے۔ دونوں زندگی کے اہم جزو سہی مگر صرف جز ہی تو ہیں۔ ان سے اعلا افضل اور برتر تو خود زندگی ہے۔ جس کی یکسانیت جس کے روز و شب کی معمولی مصروفیت کے معمولات، چھوٹی چھوٹی شکستیں اور فتوحات سبھی ہزاروں داستانوں کا موضوع بن سکتی ہیں۔

اگر بیدی کے افسانوں کا فکری اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسان کی جبلّی معصومیت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ جبلّی معصومیت حالات کی تبدیلی اور ماحول کی چیرہ دستی کے ہاتھوں کبھی کبھی ستم ظریفی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ حالات پر طنز بن جاتی ہے، کبھی خود ہماری اقدار اور تعصبات پر اور کبھی خود اس معصوم انسان پر جو اپنی معصومیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھولا۔ ہمدوش۔ رحمان کے جوتے۔ پان شاپ۔ کوکھ جلی۔ خط مستقیم۔ توبین بریجیک کے داغ۔ جب میں چھوٹا تھا۔ گالی۔ حتیٰ کہ گرہن۔ غلامی۔ اغوا۔ لاجونتی۔ اپنے دکھ مجھے دے دو جیسی سنگین کہانیوں میں اس معصومیت کا ایک ستم ظریفانہ پہلو نمایاں ہے۔ دوسری قسم کی کہانیوں میں اس معصومیت کے اظہار کی شکل اور بھی زیادہ مشترک اور مماثل ہے۔ ان میں من کی من میں۔ منگل اشٹکا۔ لچھمن اور چھوکری کی لوٹ شامل ہیں۔ ان کا تیسرا ذریعۂ اظہار زین العابدین۔ بیکار خدا اور لاروے میں نظر آتا ہے اور ایک اور موضوعاتی اشتراک اس بھولے پن اور معصومیت کے اظہار کا ٹرمینس۔ مہاجرین۔ ردعمل اور موت کے راز میں جھلکتا ہے۔ ایک اور قسم ان کہانیوں

کی ہے جس میں حیاتیوز۔ ب۔ کوارنٹین۔ تلادان۔ دس منٹ بارش میں شامل ہیں۔

پہلے گروپ کی کہانیوں میں یہ بھولا پن کسی چھوٹے سے نفسیاتی موڑ کی شکل میں نظر آتا ہے جس میں O. HENRY کی کہانیوں کا سا ہلکا پن تو ہے مگر مزاح کے پہلو کے بجائے نہایت سنگین، دل دوز ہونے کی حد تک متین اور کہیں کہیں الم ناک ہے۔ رحمان کے جوتے اور ہمدوش دونوں میں ایک چھوٹا سا وہم یا مروجہ تصور کہانی کا مرکز بن جاتا ہے کہ ایک خاص انداز سے اکڑوں بیٹھنا منحوس ہوتا ہے یا جوتے کا جوتے پر سوار ہونا سفر کی نشانی ہے لیکن کہانی کے کرداروں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ یہ دونوں باتیں اس طرح بے محابا ان کی اپنی زندگی میں بھی پیش آئیں گی۔ "پان شاپ" میں دونوں دوست اپنا افلاس ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو پان شاپ کے آئینے میں پہچانتے ہیں۔ "گالی" اور "کوکھ جلی" میں وہی دونوں باتیں یعنی ڈاکیوں کا ایک دوسرے کو سڑی سڑی گالیاں سنانا اور گھمنڈی کی آتشک جو نہایت معیوب اور ناخوشگوار سمجھی جاتی تھی وہی خلوص کی نشانی اور جوانی کی علامت کی حیثیت سے مبارک گردان لی جاتی ہے۔

بیدی کا دوسرا محبوب موضوع گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں اور دکھ درد کو قرار دیا جا سکتا ہے منگل اشٹیکا اور لجمن دونوں میں شادی کی قدرتی خواہش المیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح "چھوکری کی لوٹ" اور "من کی من میں" کہانیوں میں بھی محبت کا ایک نہایت پاکیزہ تصور ملتا ہے۔ تیسرے گروپ کی کہانیوں میں بعض غیر معمولی اور کسی قدر ٹیڑھے میڑھے کردار آتے ہیں "زین العابدین" اور "بیکار خدا" کے ہیرو تو بھٹکی ہوئی روحیں ہیں جو باپ اور بیٹے پرے ہیں۔ "لاروے" میں مفلس پستی اور غربت نے کرداروں کو پست بنا دیا ہے۔ اتنا پست کہ انھیں صفائی، اچھی آب و ہوا اور زندگی کا حسن راس نہیں آتا۔ ان سبھی کہانیوں میں بیدی کا وہ فلسفۂ حیات بکھرا ہوا ہے جس کا اظہار اور زیادہ کھل کر آخری گروپ کی کہانیوں میں ہوا ہے۔

دراصل بیدی سماجی زندگی کے ADJUSTMENT کو اہمیت دیتے ہیں اور اس عملی نقطۂ نظر کو اپنانے کے لیے اگر اپنی قدیم شخصیت کو تلانجلی بھی دینا پڑے تو اسے ضروری سمجھتے ہیں وہ تلانجلی جو ردعمل میں جلال کے احساس میں جھلکتی ہے یا ٹرمینس میں جسے رام کی جرأت میں نظر آتی ہے اور مہاجرین میں مولوی آتم کو حق میں تبدیل کر دیتی ہے اور "موت کے راز" میں ان الفاظ میں گونج اٹھتی ہے:

"وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔۔۔ یادداشت کی تحلیل۔ کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں؟ اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کر سکتا ہوں؟ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

زندہ رہنے کی خواہش بیدی کے ہر کردار اور کہانی کے موڑ پر نمایاں ہے۔ مگر یہ خواہش رومانی نہیں محض ایک لمحۂ نشاطیہ یا بے پایاں لذت کی تلاش نہیں ہے بلکہ ایک گہرا اور سنگین بجھو ہے ایک ایسا بار گراں ہے جو لاتعداد مطالبے کرتا ہے اور ہر قدم پر نئے توازن چاہتا ہے اور زندگی کی اس کھٹ مٹھی خواہش کے لیے یہ قیمت ہر لمحے ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہی قیمت جو "اک چادر میلی سی" میں رانی نے منگل کو ادا کی جو لاجونتی نے اپنے جسم کو کانچ کا بنا ہوا محسوس کرتے ہوئے ادا کی۔ وہی قیمت جسے بعض لوگ قسمت سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

سارتر نے ایک ڈرامے "کمرے میں" میں جہنم کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جہنم دوسرے لوگوں کا نام

ہے " اگر غیر ذات کو دوزخ قرار دے دیا جائے تو کم سے کم ایسی جہنم ضرور ہے جس سے ہر انسان کو ہر لمحے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ گھر میں، بازار میں، دفتر میں حتیٰ کہ ہمارے خلوت خانوں میں، خیالات اور خوابوں میں بھی ان ہی دوسرے آدمیوں کا عمل دخل ہوتا ہے اور یہ سب کے سب اگر جہنم نہیں تو کم سے کم غیر دریافت شدہ دنیا ئیں ضرور ہیں جن سے ہر قدم پر ہمیں اپنی اندرونی دنیا میں مطابقت اور مناسبت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ سماجی مطابقت کا یہی احساس بیدی کے یہاں نمایاں ہے۔ انسانی زندگی کا اصل انقلاب اس طرز عمل میں مناسب ترتیب و توازن پیدا کرنے کا نام ہے۔ تہذیب کو بعض فلسفیوں نے اندرونی جبلتوں اور خواہشوں کی موزوں ترتیب قرار دیا ہے اور جذبات اور جبلی خواہشات جس قدر حسن و خوبی سے کسی قسم کے ٹکراؤ کے بغیر مرتب اور منظم ہو جائیں گی۔ فرد اسی قدر زیادہ مہذب، شائستہ اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر صحت مند کہا جا سکے گا۔ دنیا کے سارے فکری، جذباتی، معاشرتی اور سیاسی انقلابات کا مرکز ثقل شخصیت کی یہی پر اسرار توازن پیدا کی صلاحیت ہے۔

بیدی ہمارے ان ہی نفسیاتی لمحات کے عکاس ہیں۔ اسی لیے ان کا لہجہ مدھم اور آواز دھیمی ہے۔ ان کی کہانیاں دھماکے پر نہیں لطیف سی کسک پر ختم ہوتی ہیں جو ذہن کے سامنے ایک لکیر سی بناتی گزر جاتی ہے۔ اور چند ایسے احساسات ہمارے چاروں طرف بکھر جاتے ہیں جو سوالات پوچھتے ہیں اور ہمیں اپنے شعور اور اس کی قائم کردہ اقدار کو ایک بار پھر کھنگالنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک تصور کو لیجیے۔ بیدی نے ہندوستانی عورت کے کس روپ کو پیش کیا ہے۔

گرہن۔ چھوکری کی لوٹ۔ بکی۔ گھر میں، بازار میں۔ کوکھ جلی۔ ایک عورت۔ لاجونتی۔ اپنے دُکھ مجھے دے دو۔ ایک چادر میلی سی۔

"اغوا"، "حیاتین ب"، "دس منٹ بارش میں"، "کی رینا اور "گرم کوٹ" کی شمی کا ذکر یہاں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا کہانیوں میں وہ عورت ہے جو مظلوم ہے جو لٹتی ہے اور لٹ جانا کسی قدر پسند بھی کرتی ہے جو لاجونتی کی طرح دیوی بننے پر بھی راضی نہیں۔ اسے تو وہی مار کھانے والی گوشت پوست کی گرہستن پسند ہے جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی " وہ "گھر میں، بازار میں" کی وہ عورت ہے جس میں اور طوائف میں بس وفا کی ایک ہلکی سی لکیر حائل ہے اور جو سارے دکھ لے لینے اور سارے سکھ نچھاور کرنے کو تیار رہے۔ اس کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ مرد اسے ایک طوائف ہی کے روپ میں دیکھتا رہتا ہے۔ اسے اس سے صرف جسمانی نشاط کی توقع ہوتی ہے۔ وہ اس کی روح کے اندر پھوٹتی ہوئی کونپل کو نہیں دیکھتا۔ وہ ان کلیوں کو نہیں دیکھتا جو ایثار اور گھریلو زندگی کی کومل قربانیوں کی فضا میں کھلتی ہیں۔ اپنے دکھ مجھے دے دو میں مدن سب کچھ پا کر بھی جسم اور صرف جسم کا مطالبہ کرتا ہے جب کہ عورت ایک جسم سے کہیں آگے بڑھ کر اپنے سارے وجود کو حتیٰ کہ اپنی جسمانیات کو اپنے گھر اور مدن کے گھر والوں کے وجود میں کھو چکی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ "ایک عورت" کی ہیروئن اپنے لقوہ زدہ رال ٹپکانے والے بچے کے گال پر دیے ہوئے بوسے کو اپنے رخساروں پر محسوس کر کے شرما جاتی ہے۔ اب وہ ماں ہے جس کی مسرتیں محض جسمانی نہیں جس کا وجود تخلیق نو میں سرایت کر گیا ہے۔ اب وہ نئی کلیوں، نئے پھولوں

میں بس کر زندہ ہے لیکن مردوں کی دنیا عورت کو اس شہوانی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے اندر کا کام دیو نہیں بدلتا۔ وہ صرف جسم کی آگ میں جلتا ہے اور روحانی آتش کدوں کی مقدس آگ میں عورت کو تنہا جلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اسے اس کے سکھ چاہئیں روپ چاہیے پھولوں کی سیج اور نشاط کی کلیاں چاہئیں اسی لیے سارے دکھ مول لے لینے پر بھی "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو کو چہرے پر پاؤڈر اور گالوں پر روج لگانے کی ضرورت پڑی اس بہیمانہ جذبے کے ماتحت "گرہن" میں گربھوتی ہولی سے کھتو رام نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا گروہ صرف عورت ہولی کو دیکھتے تھے۔ وہ اس ہولی کو نہیں جانتے تھے جو ماں بننے والی ہے اور دن رات گھر کا کام کاج اور گھر والوں کی خدمت کرنے اور گالیاں جھڑکیاں سننے کے بعد اپنے ماں باپ سے ملنے سارنگ دیو گرام جانا چاہتی تھی۔ اس سب کے باوجود بیدی کے یہاں عورت باغی نہیں ہے۔ شیو کا سروپ ہے جو زہر پی کر بھی سنسار کو امرت دینے پر آمادہ ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ و آہنگ او۔ ہنری اور چیخوف کے درمیان کا ہے۔ او۔ ہنری کی کہانیوں کی طرح ان کی کہانیاں محض طنزیہ یا مزاحیہ موڑ پر ختم نہیں ہوتیں اور چیخوف کی سی فکر آلود اور فکر انگیز فضا اور لطف احساس کے مرغولے ان کی کہانیوں کے اختتام پر قاری کو دیر تک گھیرے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کا فن ہنگامی موضوعات کا ساتھ نہ دے سکا اور اگر ان کی گونج کبھی سنائی دی بھی تو ایک مخصوص انداز میں جس پر ان کی انفرادیت کی مہر ہے۔ یہ انداز احساس کے خلوص اور فکر کی تازگی سے پیدا ہوا ہے۔ بیدی کی کہانیوں میں آراستگی یا جذباتیت کی فراوانی نہیں۔ صنوبر کے سایے میں نہ زلف کی گھنیری چھاؤں میں یہاں انداز بیان سے زیادہ اہمیت ان زاویوں کو حاصل ہے جن سے وہ زندگی کو پیش کرتے ہیں گویا ہر قدم پر کہہ رہے ہوں "زندگی کو ذرا اس زاویے سے دیکھئے" "اس کا نام بھی زندگی ہے" اسی لیے افسانے کو تخلیق نو کہا گیا ہے کیوں زندگی کی یہ تخیلی ترتیب نو اس کو نئی معنویت بخش دیتی ہے۔

یہ نیا زاویہ کون سا ہے؟ اس ضمن میں دو باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ بیدی نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا کس طرح بُنا ہے اور خصوصاً ان کہانیوں کے CLIMAX یا نقطۂ عروج کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ دوسرے بیدی کی کہانیوں میں سمبالزم اور رمزیت کا استعمال کس طرح ہوا؟

جہاں تک نقاط عروج کا سوال ہے بیدی کے یہاں براہ راست نیک اور بدکرداروں کا ٹکراؤ بہت کم ہے "حیاتین ب" اور "گرہن" کے علاوہ شاید ہی کسی کہانی میں ولین کا کردار استعمال ہوا ہو۔ اور گرہن میں بھی وہ بدکردار کھتو رام المیہ کا سبب نہیں ہے۔ اس کا معاون کردار ہے۔ بیدی کی کہانیوں میں بنیادی کش مکش یا تو فرد اور سماج کی ہے جو کبھی کبھی حالات کی شکل میں اور کبھی حالات کی ستم ظریفی کی شکل میں ایک اچانک واقعہ بن کر سامنے آجاتی ہے (مثلاً رحمان کے جوتے۔ ہمدوش وغیرہ میں) یا پھر فرد کی اندرونی کش مکش ہے جو مختلف تغیر پذیر اقدار و تصورات کے ٹکراؤ کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ ابو الاکتش کا ہیرو صاف الفاظ میں کہتا ہے:۔

> "انسان اپنے دل اور کردار کے بارے میں خود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کونسا جذبہ کون سا عمل سب سے اوپر جگہ پائے گا"

بیدی نے بھی بعض افسانوں میں ناگہانی حادثات سے کام لیا ہے جو واقعات اور کرداروں کو اچانک

ایک نیا روپ دے دیتے ہیں اور کہانی کو ایک نیا موڑ بخشتے ہیں لیکن زیادہ تر کہانیوں میں کش مکش تصورات اور اقدار کی ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کی خالص داخلی آویزش نہیں ہے بعض کہانیوں میں تصورات اور اقدار کا یہ موثر اتنا قدرتی، ایسا گتھا ہوا ہے کہ تقریباً غیر محسوس سا ہو گیا ہے۔ بادی النظر میں یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہوتا ہے کہ نقطۂ عروج کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کون سے عناصر و عوامل سے اس کی تشکیل ہوتی ہے مثلاً "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں نقطۂ عروج اس وقت پیدا ہوتا ہے جب پتاجی کی موت کے بعد مدن کا کاروبار چل نکلتا ہے اور اس کا من دوسری عورتوں کے روپ میں لہرانے لگتا ہے اور اچانک اندو کو پتہ چلتا ہے کہ ابھی مدن کو وہ سب کچھ نہیں دے پائی ہے جس کی اسے ضرورت تھی گویا یہاں آویزش مرد اور عورت کے فطری آدرشوں اور نفسیاتی یا جذباتی مطالبات کی ہے۔ یہ محض مدن اور اندو کی کہانی نہیں آفاقی داستان ہے جو آدم اور حوا سے آج تک دہرائی جا رہی ہے۔ لاجونتی میں یہ کش مکش سندر کے دل اور دماغ کی کش مکش ہے۔ دل باعصمت اور پاکدامن عورت کا متجسس ہے جس کے دامن کو راون نے چھوا تک نہ ہو اور یہ تصور ہمارے سماج کی دین ہے۔ تعصبات اور توہمات کا بخشا ہوا ہے۔ دماغ کہتا ہے کہ اگر لاجو مغویہ عورت ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور دل میں بسا دکی تحریک انصاف کی تحریک ہے لیکن دماغ لاجو کو دیوی تو بنا سکا اسے عورت کا روپ واپس نہ دے سکا۔

بیدی کے یہاں زیادہ تر کش مکش جذباتی اور تصوراتی ہے اور اس وجہ سے ان کی کردارنگاری میں تجرید اور تعمیم کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان تصورات اور جذبات کا حالات سے بڑا گہرا تعلق ہے اور حالات کی ایک کروٹ اچانک ایک ہی قدر کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے۔ ذاتی مفاد کی لگاوٹ نے "آلو" کی ہیروئن سنتو کو تلکھی سنگھ کے الفاظ میں "رجعت پسند" بنا دیا تھا یا "غلامی" میں پولھو رام ریٹائرمنٹ کی زندگی سے اکتا کر دفتر کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی یہ نفسیاتی بے چارگی زندگی میں کسی نہ کسی قسم کی معنویت کی یہ تلاش الفاظ کے معنی اور اقدار کا روپ بدل دیتی ہے۔ اس قسم کی کش مکش کی بنیاد پر افسانے لکھنے کے لیے انسانی جذبات کی لطیف ترین تہوں تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے ایک ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر سے آگے قدم بڑھا کر باطنی احساس کی رمزیت کو سمجھ سکے۔

بیدی کے افسانے انسان کے باوقار وجود کے متلاشی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ باطنی وقار جو مادی اسباب وعلل پر بے نیازی کے ساتھ مسکرا سکے جو حالات سے ہم آہنگ تو ہو مگر ان کا غلام نہ ہو۔ جو ہمت اور جرأت کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑا ہو سکے اور اپنی آواز کو پہچان سکے۔ اس کا سب سے زیادہ مثبت اظہار "معاون اور میں" ہوا ہے جس میں پمبر لال اپنی جیب میں کسی کی چابی کا بوجھ برداشت نہ کر سکا یا پھر "من کی من میں" اور اسی سماجی انصاف، مساوات اور عزتِ نفس کی جستجو مختلف انداز سے "جیا تین ب" "دس منٹ بارش میں" "تلادان" "لاروے" اور بعض دوسری کہانیوں میں بکھری ہوئی ہے۔ انسان عزتِ نفس کے لیے بے قرار ہے۔ وہ صرف اپنے لیے نہیں ساری انسانیت کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ "کوارنٹین" کا بھاگو اس کی مثال ہے اس کی روح ساری کائنات میں سما جانے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ہمدردیاں عالمگیر، اس کی دلچسپیاں آفاقی اور اس کے حوصلے بے نہایت ہیں لیکن اس کی اقدار و تصورات۔ وہ اقدار و تصورات جن کے قایم کرنے کا حق ساری مخلوقات میں انسان اور صرف انسان ہی کو تفویض ہوا ہے۔ یہی اقدار و تصورات اس کے

زنداں و محبس ہیں اور اس نا ضمیر قید خانوں میں زنجیریں پہنے چھوٹا سا علم بغاوت بلند کیے ہوئے ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بیدی کا کینوس زیادہ وسیع نہیں۔ البتہ اس کی گہرائی اتھاہ ہے۔ اس پر رنگوں کی دو تہیں ہیں جو پورے کینوس کو آفاقی بنائے دیتی ہیں۔ کردار ہمارے آپ کے متوسط طبقہ کے ہیں۔ نہ کیڈی لاک اور کلب کے چرچے ہیں نہ پریم چند کی چوپالیں اور دھان کے کھیت ہیں لیکن اس متوسط طبقے کو اپنے دور کی ——— کسی قدر طبقاتی رنگ میں ہی سہی ——— نمائندگی کرنے کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔ متوسط طبقے کی کئی تہوں کو اور کئی سطحوں کو بیدی نے پیش کیا ہے۔ یہاں سندر جیسا سوشل ورکر بھی ہے اور مدن جیسا گندہ بیروزے کا بیوپاری بھی۔ رسالہ "کہانی" کے ایڈیٹر بھی اور رند خراباتی جلال بھی۔ سیاسی ورکر لکھی سنگھ بھی ہے۔ بکری کا کاروبار کرنے والے سندر اور سوہن بھی۔ مگر ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ سب زندگی کو یرقانی اور رومانی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، حقیقت نگار کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ زندگی ایک سنگین اور سنجیدہ معاملہ ہے جس میں الجھی ہوئی شاخوں اور کانٹے دار ٹہنیوں کے بیچ سے چاند کرنیں بکھیرتا ہے۔ اس میں غالب رنگ مٹیالا ہے۔ خوشی اور غم دونوں سے الگ مگر مثبت اور صبر آزما حد تک مثبت۔ اگر بیدی کے کھینچے ہوئے مناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو ان پر پکاسو کی الجھی ہوئی سنگین اور سخت کسی حد تک کھردری سطح کی تصویروں ہی کا گمان ہوگا۔ ان میں رومینس یا ریفائل کی رنگینی نظر نہ آئے گی۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں مدن کی بے راہ روی کا بیان ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگے جہاں روشنی اور سایے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کہ اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہرا کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا یا کسی کوٹ نے دیکھنے والے کا منھ پوری طرح ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا جبھی روشنی کی چوکور لہرا ایک چوکھٹا سا بن گئی اور اس میں ایک عورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آر پار چلا گیا جیسے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا اور طبلے نے اس کی آواز ڈبو دی۔

بیدی کی زبان کے بارے میں اکثر مختلف شبہات کا اظہار کیا گیا ہے بیدی کا انداز بیاں رواں اور شستہ نہیں ہوتا کبھی کبھی ان کی زبان میں ناہمواری بھی آجاتی ہے اور یہ الزامات بہت کچھ صحیح بھی ہیں لیکن پنجاب کی زندگی کی اس قدر بے محابا تصویر کشی دو ایک افسانہ نگاروں کے علاوہ شاید ہی کسی نے کی ہے اور بیدی کی عکاسی فوٹو گرافی کی نہیں بلکہ پنجاب کی تہذیبی روح کی عکاسی ہے۔ بیدی کی نثر سے کوئی شعریت کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ بیدی نثر کو آراستگی کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کی کہانیوں کے بیچ میں سے کسی جملے کی تعریف کرنا یا کسی بیان پر سر دھننا مشکل ہے کیونکہ کہانی کا ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ، کردار، واقعہ، نقطہ اور پیچ و خم ایک مکمل اکائی کا جز ہوتا ہے جو ہر لمحہ سننے اور پڑھنے والے کے ذہن، احساس اور نگاہ کو پوری یکسوئی کے ساتھ ایک مرکزی نقطے پر مرکوز کرتے ہیں اس لیے ان کے ہاں الگ الگ ایسے منفرد اور ممتاز جملے بہت کم ہوتے ہیں، جو باقی عبارت میں سے ابھر کر

خراج تحسین وصول کرسکیں۔ زبان و بیان کا رنگین نہ ہونا عیب نہیں۔ ہاں اس میں بیدی ذرا احتیاط کی مدد سے زیادہ روانی پیدا کرسکتے تھے۔ زیادہ شستگی اور صفائی لاسکتے تھے۔ اس انداز بیان اور زبان میں حقیقتوں کی سنگینی اور توانائی ہے۔ یہ مصوری کی نہیں سنگ تراشی اور خارا شگافی کی زبان ہے جس میں پتھر کی صلابت ہے۔

بیدی کے فن کے بارے میں سب سے اہم اور نمایاں بات یہ ہے کہ اس کا دروبست ( ) فن تعمیر کا سا ہے۔ اس کا مزاج علامتی ہے اور اسی علامت و رمزیت کے سہارے سے وہ اپنے فن کی پوری کائنات خشت بخشت چنتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جسے بیدی سے پہلے اور بیدی سے لے کر اب تک کسی دوسرے فنکار نے اردو افسانے میں استعمال نہیں کیا۔ علامتوں سے فن کبھی یکسر خالی نہیں رہا۔ رمزیت سے بھی ہماری شناسائی خاصی پرانی ہے لیکن بیدی نے جس طرح رمزیت اور علامتوں کو مختلف سطحوں پر استعمال کیا ہے۔ وہ خاصے کی چیز ہے اس کی چند مثالیں "دس منٹ بارش میں" "لاجونتی" اور "اک چادر میلی سی" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جب کبھی بیدی کہانی لکھتے ہیں تو وہ محض ایک ہیرو یا ایک ہیروئن کی جذباتی یا نفسیاتی روداد نہیں ہوتی بلکہ اس مرکزی جذبے سے پوری فضا رنگ جاتی ہے۔ مرکزی تصور، پیڑ پودوں، پورب کی ہوا، لہراتی ہوئی شاہراہ، چرند پرند، چاند سورج حتیٰ کہ فطرت کے ہر منظر کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور افسانہ پڑھنے والے کی توجہ بنیادی تصور کے رنگ و آہنگ کی طرف کھینچ لیتا ہے گویا ان کی ہر کہانی بیک وقت ایک اندرونی اور خارجی مطابقت PARALLELISM سے معمور ہوتی ہے۔ ہر مرکزی خیال ایسا مسلم ہوتا ہے جس کی مثال افسانے کی دنیا کی فضا کا ذرہ ذرہ دیتا ہے اور کہانی کا ہر خط جس کے متوازی کھینچا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بیدی سے زیادہ محتاط آرٹسٹ ہمارے یہاں کوئی نہیں ہے۔ "اک چادر میلی سی" کے ابتدائی حصے پر غور کیجیے منظر ہی ایسا ہے جو کہانی کے پہلے حصے کی فضا کو خاموش رمزیت کی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔

"آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی۔ . . . . آج آسمان کے کوٹھے میں کسی بے گناہ کا قتل ہوگیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے ڈبو منہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا۔"

ان ابتدائی جملوں میں ہی بولتے ہوئے سمبل استعمال کیے گئے ہیں۔ سورج کی ٹکیہ کی سرخی ہی بتا رہی ہے کہ تلوکے کا قتل ہونا ہے اور اس کے خون کے چھینٹے جس طرح بکائن پر پڑے ہیں اسی طرح رانی پر پڑیں گے اور رانی پر ہی کیوں گھر بھر پر۔ بہنوں پر بھی منگل پر بھی۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار بھی سمبل ہی ہے جو رانی کی زندگی کا مظہر بن گئی ہے۔ جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے اس کے بعد کتے ڈبو کا رونا بھی اسی قتل کی طرف اشارہ کرتا ہے غرض کہ پوری فضا سمبالک ہے اور اس کا کلیدی واقعہ بن جاتا ہے تلوکے کا قتل۔

کبھی کبھی وہ ایک واقعے کے پس منظر کو ابھارنے اور سمبالک فضا پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں گرہن میں راہو اور کیتو کا چاند پر حملہ آور ہونا پھر گرہن کے موقعے پر لوگوں کا اشنان کرنا، دان دینا اور دان لینے والے بھکاریوں کی "چھوڑ دو چھوڑ دو دان کا وقت ہے" کی آوازیں یہ سب کچھ ہولی کی بپتا کے متوازی استعمال ہوا ہے اور اس کی مظلومیت کو اور زیادہ دردناک بنا دیتا ہے۔

اس خاموش سمبالزم اور ان متوازی خطوط کی اہمیت کیا ہے ؟ یوں تو بنیادی طور پر یہ سوال تکنیک کا ہے لیکن اب جمالیات کا یہ ایک عام اور مسلمہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ لذت احساس حقیقت سے زیادہ تخیل میں ہے۔ اور پڑھنے یا دیکھنے والوں کو لطیف اشاروں کی مدد سے اپنے تخیل سے کام لے کر داستان کے کچھ گوشے خود مکمل کرنے پڑیں تو لذت کا احساس کہیں زیادہ ہو جاتا ہے کیوں کہ داستان کی تشکیل میں پڑھنے والے کا تخیل بھی کسی قدر شامل ہو جاتا ہے اسی لیے بعض فنکاروں نے ابہام کو بڑی چابک دستی سے برتا ہے۔ بیدی کے یہاں ابہام نہیں۔ ہر بات واضح اور ہر موڑ نمایاں ہے مگر پڑھنے والے کے ذہن کو مماثلتیں اور متوازی خطوط کی تلاش میں ایک گونہ لذت ملتی ہے اور کہانی کا جمالیاتی تاثر دو چند ہو جاتا ہے اور اسے بیدی نے فن کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

آخر میں اس ناگزیر سوال پر غور کرنا ضروری ہے کہ بیدی کا اردو افسانہ نگاروں میں کیا مقام ہے ؟

فکر کے اعتبار سے بیدی کے افسانے انسانی شخصیت کے لطیف ترین گوشوں کے نازک مطالعے ہیں۔ اس آئینہ خانے میں انسان اپنے سچے روپ میں نظر آتا ہے اور بیدی اس کے طمع کی تہوں کو ہٹا کر اس کے کمزور لمحوں میں اسے بے نقاب ہوتے دیکھ لیتے ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیدی کے افسانے محض نفسیاتی مطالعے یا تحلیل نفسی کی کیس ہسٹری (CASE HISTORY) نہیں بلکہ جذبات کی رو اور گداز سے معمور بصیرت کی تابانی سے روشن ایسے فن پارے ہیں جن سے فرد کی شخصیت کے لطیف گوشے ہی سامنے نہیں آ جاتے بلکہ فرد اور سماج کے پر پیچ رشتے اور انسان کی شخصیت کے دلچسپ اور پر اسرار تانے بانے پر روشنی پڑتی ہے زندگی کی زیادہ بامعنی، زیادہ بلیغ، زیادہ خیال انگیز اور فکر خیز تشکیل سامنے آتی ہے۔ جس میں احساس کا گداز بھی شامل ہوتا ہے اور فکر کا تجسس اور تجزیہ بھی۔

تکنیک کے اعتبار سے متوازی رمزیت اور تہہ داری کا استعمال جس طرح بیدی نے کیا ہے اس نے اردو افسانے کو ایک نئی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ ابھی تک اردو افسانے کو اتنا محتاط آرٹسٹ نہیں ملا تھا۔ لفظ کا رنگ اور نغمہ سمجھنے والے تو بہت سے تھے اور اب بھی ہیں لیکن لفظ کو لفظ سمجھنے والے معدودے چندی فنکار ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی کبھی کبھی نمائشی آب و رنگ (WINDOW DRESSING) کے لالچ میں پھنس جاتا ہے اور غیر ضروری طور پر اپنے فن پارے کو یا انداز بیان کی خوبصورتی یا کسی قسم کی سستی لذت یا آرائش سے سجا کر اس میں دلکشی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ منٹو جیسا بات کا کھرا اور قلم کا سچا فن کار بھی کبھی کبھی جنسی جذبے کو افسانوں میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ بیدی کے یہاں یہ کمزوری بہت کم ملتی ہے۔ بیدی نے "مذاق عام" کے پست پہلوؤں سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ان کے یہاں نمائشی پہلو ہمارے تمام افسانہ نگاروں میں سب سے کم ہے۔ وہ نہ اپنی ذات میں اسیر ہوتے ہیں نہ مذاق عام اور قبول عام کے لالچ میں زندگی کی اپنی بے کم و کاست عکاسی جو رومان کی رنگ آمیزی اور قنوطیت یا دل دوز ظلمت پرستی دونوں سے مغلوب نہ ہو بیدی ہی کا حصہ ہے اور اس سلسلہ میں بیدی کے افسانے منٹو سے بھی زیادہ دو ٹوک قطعی اور حقیقی ہیں۔

بیدی کے کرداروں میں کامیاب کردار بہت سے ہیں لیکن ابھی تک ان کے قلم نے کوئی ناجی، کوئی امراؤ جان، کوئی لیلیٰ پیدا نہیں کی ہے۔ گو لاجونتی، اندو اور رانی اس منزل کی طرف کئی قدم آگے بڑھ گئی ہیں۔ یہ ایک

عجیب اور پُر لطف بات ہے کہ بیدی کے نسوانی کردار دوسرے تمام کرداروں سے زیادہ توانا اور فنی اعتبار سے بالیدہ ہیں لیکن ہمارے دور میں وہ ایسے دو تین افسانہ نگاروں میں سرِ فہرست ہیں جن کے قلم سے کسی عظیم فانی کردار کی تخلیق کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان کے پاس بصیرت بھی ہے اور سماجی پس منظر کا احساس بھی۔ بیان کی قدرت بھی ہے اور کردار نگاری اور اس کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی۔ اس لیے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی عظیم کردار ان کی تخلیق ہوگا۔

بلاشبہ بیدی ہمارے دور کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں شمار کیے جائیں گے اور ان کے مدھم لب و لہجہ، ان کی تہہ داری، رمزیت، ان کی طرحداری اور خلوص کی کھنک ایک زمانے تک اردو دنیا کے کانوں میں گونجتی رہے گی اور اردو افسانے کو راہ دکھاتی رہے گی۔ (عصری آگہی دہلی ۸۳)



محمد صفدر میر

فیض کا نظریہ سخن

ہمارے عہد کا ادبی شعور اپنی ایک مخصوص ہیجانی کیفیت رکھتا ہے جو ہمارے روایتی ادب کی ذہنی فضا سے بہت مختلف ہے، اور کئی پہلوؤں سے متضاد۔ جدید اور قدیم ادب کی بحث ایک عرصے سے جاری ہے اس کا تعلق اصناف سخن اور ہیئتی سانچوں سے نہیں جتنا دو ادوار کی ذہنی فضاؤں کے اختلاف سے ہے۔

انیسویں صدی سے پہلے کا معاشرہ ہماری تمام زبانوں اور کلاسیکی اور روایتی ادب کا پس منظر ہے، اس معاشرے کے عناصر میں سب سے زیادہ اہمیت اس خود کفیل، محدود اور غیر متغیر معاشی سیاسی نظام کو ہے جسے فیوڈل یا جاگیرداری نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معاشی، سیاسی نظام کی بنیادوں پر استوار معاشرتی ماحول اپنے مخصوص ادارے رکھتا ہے، اور ان سے ہم آہنگ فکری، اخلاقی مذہبی عقائد، اقدار اور مسلمات کا مربوط شیرازہ منسلک ہے۔ یہی عقائد، اقدار، مسلمات اس دور کی ذہنی فضا کو متعین کرتے ہیں اور معاشرے کے ہر فرد اور ہر گروہ کے طریق عمل کی کسوٹی کا کام دیتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل اور محکم فکری کائنات ہے۔ اس کائنات کے اندر رہنے والوں کے لیے اس کے باہر نہ کوئی کائنات ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

سترہویں اٹھارویں صدی کے مغل ہندوستان کی خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں، متواتر قتل و غارت، معاشی اور سیاسی بحرانوں کی وجہ سے معاشرہ ایک ہمہ گیر شکست و ریخت سے دوچار ہوا لیکن اس کی مخصوص ذہنی فضا اپنی جگہ قائم رہی۔

اسی عالمگیر تباہی کے زمانے میں اردو کا بیشتر کلاسیکی ادب پیدا ہوا، اور اپنے نقطۂ عروج تک پہنچا اور اسی بات سے ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔

اپنی مخصوص بے صبری سے کام لیتے ہوئے کبھی ہم اپنے نئے سیکھے ہوئے معیاروں کے مطابق

اپنے کلاسیکی ادب کو جانچتے ہیں اور فتوے لگاتے ہیں کہ اس زمانے کے شاعر اپنے ماحول سے بے خبر تھے اور اپنی ہی تخیلی دُنیا میں رہا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی بھی بند رکھا کرتے تھے۔ پھر ہم کبھی اُن کے کلام کی ایسی سیاسی توجیہیں کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے زمانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے اثرات غزل کے سیدھے سادے اشعار میں سے برآمد کر ڈالتے ہیں۔ جیسے وہ شاعر نہ ہوں وقائع نویس ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے شاعروں کی تخلیقات میں اُن کے بکھرے ہوئے معاشرتی نظام کے زوال کا احساس بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے اُن کو اپنے ماحول میں ہونے والی کسی بڑی تبدیلی کا احساس تک نہ ہو، جیسے اُن کے لیے اپنے شیرازہ بند، نظامِ حیات و کائنات کے قائم و دائم رہنے کے بارے میں شک و شبے کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ اُن کی ذہنی فضا میں ویسا ہی ٹھہراؤ، توازن، سکون اور یک جہتی نظر آتی ہے جو ازمنہ وسطیٰ کے عروج کے زمانے کے اُن پیشرو فارسی شعرا کے یہاں ملتی ہے اگر کہیں آشوبِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار کی شکایت بھی ہے تو اپنے روایتی فکری اور معاشرتی ماحول کے تناظر میں اور اس کے محدود دائرے کے اندر ہی۔ اسی قائم و دائم معاشرتی سانچے کے مطابق جس کے علاوہ اور کوئی معاشرتی سانچہ ان کی نظر میں ممکن ہی نہ تھا۔

اس محدود اور معاشرتی ماحول اور اس کے محدود ممکنات کے دائرے میں انسان کی زندگی ازل سے ایک لامتناہی گردش میں سفر کرتی رہی ہے اور ابد تک اسی طرح گردش کرتی رہے گی۔ اس کے نشیب و فراز، اس کے بہار و خزاں، اس کے اندرونی تضادات کے بارے میں مختلف شاعروں کا رویہ متنوع ہو سکتا ہے۔ کوئی اُسے نور و ظلمت کی کشمکش سے عبارت کرے، یا کفر و اسلام کے تضاد سے، یا ان دونوں سے ماورا اپنے جہان کی محکم بنیاد خالی از خلل محبت پر رکھے۔ جہاں معنی سب کا ایک ہی ہے۔ امیر خسرو، عرفی، نظیری، محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر، سودا، وارث شاہ، شاہ لطیف، رحمٰن بابا، سب ایک ہی دنیا کے باشندے ہیں اس کے باہر، اس کے علاوہ یا اس کے برعکس کوئی اور دُنیا ممکن ہی نہیں۔ اس مکمل اور محدود، بے تغیر تصورِ کائنات پر ایمان ہمارے کلاسیکی ادب کی ذہنی فضا کا خاصا ہے جو ہمارے اپنے زمانے کے ادبی شعور کی مضطرب ہیجانی، ہر دم متغیر اور لامحدود امکانات کی حامل کیفیت سے نوعی طور پر مختلف ہے۔

غالب کی شاعری شاید پہلی بار اپنے کسی کلاسیکل شاعر کے یہاں اپنے معاشرے کے روایتی تصورِ حیات و کائنات اور اس کے بنیادی مسلّمات کے بارے میں تشکیک کا اتنا گہرا اثر ملتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس کی ذہنی فضا اپنے پیشروؤں سے کچھ مختلف ہو۔ اس کے معتقدات، اس کا نقطۂ نظر، اس کے جہانِ معنی کے مسلّمات بالکل وہی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے یہاں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ ان کا اس زندگی کے حقیقی ماحول سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ غالب فیوڈل ہندوستان کی پرانی دنیا اور نوآبادیاتی سرمایہ داری نظام کی نئی دنیا کے سنگم پر کھڑا ہے اور اپنے شعری شعور میں اس فکری اور اخلاقی بحران کا اظہار کرتا ہے جو مختلف معاشرتی دنیاؤں کے تخالف اور ٹکراؤ سے پیدا ہوا۔ اس میں ایک نئی دنیا کی تخلیق اور اس کے لیے موزوں تصوراتی پیکروں کی تشکیل کے بارے میں بھی کچھ اشارے ملتے ہیں اور ممکنات کی ایک نئی کائنات کا خیال بھی۔ لیکن اس کی روایتی ذہنی فضا کے دائرے میں اس خیال کی کسی واضح صورت کی نقش گری ممکن نہ تھی۔ اس کام کے لیے کسی ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو دونوں ٹکراتی ہوئی دنیاؤں کی مادی، معاشرتی اور فکری بنیادوں سے واقف ہوتا۔ اور ان کے سارے تضادات کو اپنے نفس میں جذب کرکے، اپنے تخیل کو متصادم قوتوں کے پُرہول جدل کا میدان بنا کر اُن کے اجزا سے ایک نئی ترکیبِ معنوی اور ایک نئے جہانِ تمنا کی تخلیق کر سکتا ہے۔

یہ کام اقبال کے لیے ممکن ہوا۔ اور فکر و عمل کی اسی بلند سطح پر جہاں سے غالب نے اس کے امکان کی جھلک سی دیکھی تھی۔ اقبال کا طرزِ احساس غالب سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب ہی کی روح نے اقبال کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہو تاکہ اس کے لیے اپنی تشنۂ تکمیل خواہش کو پورا کر سکے۔

یہ محض شعری روایات کی ہم آہنگی کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم مشرب شاعرانہ شخصیتوں اور ان کے عزائم کی مماثلت کا بھی۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی قوم کی روح کے زمانی تسلسل کا۔ کیونکہ جس طرح اقبال میں غالب کی معنوی صورت کی جھلک نظر آتی ہے اسی طرح غالب میں عرفی اور نظیری کے پیکروں کی جھلک ملتی ہے۔ معاشرتی ماحول کے فرق اور زمانے کے بعد کے باوصف ان مختلف زمانوں کے شاعروں کے درمیان طرزِ احساس کی یہ عبرتناک مماثلت اور فکری اسلوب کا یہ تسلسل، اتفاقی امر نہیں ہے۔ شاید یہ بھی اس پُر اسرار حقیقت کا ایک مظہر

ہے جسے قومی شخصیت کہتے ہیں جو کسی قوم کی زندگی کے مختلف ادوار پر حاوی ہوتی ہے اور جو صدیوں تک عہد با عہد ہر زمانے میں روحِ عصر کے ساتھ متصل اور متحد ہو کر از سرِ نو جوان اور تازہ دم ہوتی ہے۔

قومی شخصیت اور روحِ عصر کا یہی نقطۂ اتصال کسی عہد کے منفرد اور نمائندہ شاعروں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہی مختلف ادوار کے شاعروں کو ان کے مخصوص و منفرد شعری تجربوں اور شدید خود مرکزیت کے باوجود ایک دوسرے کا آئینہ بناتا ہے اور سب کو ایک ہی رشتے میں پروتا چلا جاتا ہے۔

اقبال کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ہمارے زمانے کے مواد، اس کی ساخت ہماری قوم کے ظاہر و باطن، اس کے عزائم و مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اگر غالب فیوڈل عہد کے انجام اور نوآبادیاتی سرمایہ داری آغاز کے سنگم پر کھڑا تھا تو اقبال ایک ایسے زمانے میں منصۂ شہود پر رونما ہوتے جب یہ نوآبادیاتی سرمایہ داری عہد اپنے انتہائے کمال تک پہنچ کر زوال آمادہ ہو چکا تھا اور تاریخ انسانیت میں اجتماعیت کے نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ اپنے زمانے کے انہی عظیم معاشرتی انقلابات کی تفسیر ہے۔

غالب اور اقبال کی شاعری کا موازنہ کرتے وقت بعض اصحاب ان دو مثالی شاعروں کے کلام اور شخصیت میں تفریق و تخصیص اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ایک میں داخلیت ہے اور دوسرے میں خارجیت، یا ایک میں احساسات اور جذبات کا ارتکاز ہے اور دوسرے میں منطقیت اور استدلال کی فراوانی، ایک دروں بینی اور خود نمائی میں محو ہے اور دوسرا دنیا اور کائنات کے رموز کو آشکار کرنے میں مصروف ہے ایک کا شعر خود اپنا مقصد آپ ہے اور دوسرے کا شعر اپنے آپ سے الگ اور ماورا ایک اخلاقی اور معاشرتی مقصد کا ذریعہ ہے۔

ان دو حیرتناک حد مماثل شاعروں میں اتنی واضح اور دو ٹوک تفریق و تخصیص کی نشاندہی ایک نصابی اور مدرسانہ ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن سخن کی اس روایت کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کر سکتی جس کا یہ دونوں حصہ ہیں۔ اور وہ روایت ہے فکری شاعری کی جس کا اول و آخر حیات و کائنات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے اس روایت میں داخلیت اور خارجیت کی کیفیات متضاد ہونے کے باوجود باہم پیوستہ یک آہنگ اور متحد ہوتی ہیں اور رہی ہیں، تمام شاعروں میں ان کے اجزا مختلف مقداروں میں بقدر حوصلہ وظرف بیک وقت پائے جاتے

ہیں انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے شعر میں جو ایک اندوہ گیں ٹھہراؤ ایک سُلگ سُلگ کر راکھ ہو جانے کی کیفیت ہے، وہ محض شخصی، یا ذاتی یا اندرونی نہیں ہے، بلکہ اس کے زمانے، اس کے گرد و پیش کی ٹھہری ہوئی معاشرتی صورتِ حال کا عکس ہے، اتنا ہی خارجی جتنا کہ داخلی، اقبال کے یہاں اس کے برعکس ایک پُر امید حرکت اور شعلہ، جو الہ کی کیفیت اس کے اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کی سچائی ہے اور یہاں بھی داخلیت اور خارجیت باہم پیوست ہیں متحد ہیں۔ اقبال اور غالب دونوں کے یہاں جزو میں کل اور کل میں جزو دیکھنے اور دکھانے کی بات ہے جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے اور اُسے غایت سخن بنایا ہے۔ اسی مقدر مشترک ہے دونوں کے کلام کی ہم رنگی، دونوں کے خیال، جذبے اور احساس کی ہم آہنگی، دونوں کے شعری تجربے کی شدت اور ارتکاز جنم لیتے ہیں، اور ان کو ہمارے شعر کی اس روایت کا حصہ بناتے ہیں جس کا تعلق اصلاً فکر سے ہے۔ محض ذاتی اور لمحاتی غموں اور خوشیوں سے نہیں ہے۔

ہمارے زمانے میں اس روایت کا سب سے مکمل اظہار فیضؔ کی شاعری میں ملتا ہے۔ یوں تو ترقی پسند ادب کی ساری تحریک ہی اس روایت کے نصب العین کو اپنانے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن فیضؔ میں جس طرح ایک مسلسل اور صبر آزما فنی ریاضت اور شدید ذاتی مجاہدے کے ساتھ اس روایت سے منسلک رہنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے، وہ کہیں اور مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔

فیضؔ غالبؔ اور اقبالؔ کے سلسلے کا شاعر ہے، یہ تو سبھی جانتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں اس کی کلاسیکیت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے اور اس کو بہت حد تک اس کے روایتی استعارتی انداز، اس کے لُغت کے چناؤ اور اس کے ظاہری اسلوب سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ معاملہ اس سے ذرا گہرا ہے، معاملہ یہ ہے کہ فیض کا بطور شاعر کے بنیادی مسئلہ، اس کی زندگی کا محور اس کے لیے جزا۔ و سزا کا پیمانہ، یہ رہا ہے، کہ اُردو کی شاعرانہ روایت میں داخل ہونے والا جدید عہد کا شاعر کیا اور کس طرح کا ہونا چاہیے اور وہ خود مثالی کردار کو کس طرح ادا کرتے ہیں یہ ایک بہت ہی مشکل معیار ہے جو اُس نے اپنے لیے، اور اپنے عہد کے لیے قائم کیا تھا اور اس پر قائم رہنے کے لیے محض غزل کی تکنیک سے واقفیت اور اپنے عہد کے واقعات پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت ہی کافی نہیں اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔

دستِ صبا کے دیباچے میں فیض نے خود اس "بہت کچھ" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس

سے عہدہ برآ ہوتے رہنے کی اُس نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی ہے۔ اور جس نے اس کی نسبتاً قلیل متاعِ سخن کے ایک ایک لفظ میں جادو بھر دیا ہے اور اس کے مصرعوں اور ترکیبوں کو اپنے زمانے، اپنی قوم اور دُنیا بھر کے اُردو دانوں کے لیے ضرب المثل کی حیثیت دے دی ہے اور خود اس کو ہمارے جدید زمانے کے شاعر کا استعارہ اور "آرک ٹائپ" بنا دیا ہے۔ فیض کی عالمگیر مقبولیت اور اس کے کلام کی پُراسرار کیفیت اسی "بہت کچھ" سے ہے۔

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فیض نے اس فن کو دل لگی یا بیکار کا کام سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے "فنِ سخن یا کوئی اور فن، بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اور یہ محض سنجیدگی یا خلوصِ نیت کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعین کرنا ہے کہ نیت کس عمل کی باندھی جا رہی ہے۔" فنِ سخن بچوں کا کھیل نہیں ہے۔" اس کے لیے تو غالب کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں ہے کہ شاعر والے کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں بلکہ دکھانا بھی ہوتا ہے۔"

تو اصل مسئلہ قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کا ہے اور یہیں سے فیض کا فن اس کا طریقہ کار مختلف اور منفرد ہو جاتا ہے۔ دجلہ سے فیض کی کیا مراد ہے وہ اسی دیباچے میں درج ہے۔

"دور دراز او جھل دشوار گزار پہاڑیوں پر برفیں پگھلتی ہیں، چشمے اُبلتے ہیں۔" ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کٹتا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے جس "دیدۂ بینا" نے انسانی تاریخ میں لمبی زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا۔ پھر شاعری کی نگاہ ان گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی، لیکن اُن کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاوری نہ کی، یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جاں جہد و طلب پر راضی نہ ہوتے، تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں تو دجلہ دراصل انسانی زندگی کی کلّیت اور اس کی تاریخ کا استعارہ ہے۔ یہ اور سوال ہے کہ غالب نے اس سے کیا مراد لی تھی۔ لیکن فیض کی اپنی لغت میں اس سے انسانی تاریخ ہی عبارت ہے ایک اور جگہ استعارے کی مدد لیے بغیر اس نے اس آدرش کو یوں پیش کیا ہے۔

"صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات، اپنی قوم، اپنے عہد کے ماضی حال اور مستقبل کو معلوم و محسوس کرے اور اس کے بعد اپنے علم و

احساس کی قدر و قیمت معین کرے اور اس کی تفسیر و تشہیر کرلے۔"

یہ آدرش شاعر کے کام کو بیک وقت ایک مورخ، ایک سیاسی، اور ایک فلسفی کی سطح پر بلند کر دیتا ہے اور اس کام کو ان سب کے مجموعی کام سے زیادہ زہرہ گداز اور جگر آزما بنا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ محض خیال کو کسی نہ کسی طرح شعر کا قالب دینے کا نام نہیں بلکہ اس سارے تجربے کو بھٹی میں تپا گلا کر، صاف کر کے، چھان پھٹک کے، مقطر کر کے، تصوری اور معنوی پیکر دینے کا نام ہے۔ اور پھر اتنا بھی کافی نہیں۔ کہا ہے۔

"اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی دجلہ کا ایک قطرہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رُخ اس کے بہاؤ اس کی ہئیت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔ یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے اُسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔"

فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے شاعرانہ آدرش کی تمام تفاصیل سے آگاہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن فیض کی شخصیت کی پہچان اور اس کے لفظ لفظ کے پُراسرار جادو کی سمجھ کے لیے ان باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے جدید ادب اور اس میں ترقی پسند ادب بھی شامل ہے، کے اُتھلے پن، سطحیت اور ناپائیداری کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہ اقبال کے شاعروں میں سے خود فیض کو چھوڑ کر اور کوئی بھی کلاسیکل کے مرتبے پر کیوں نہ پہنچ سکا۔

جدید ادب کے ابھار کا زمانہ تیسری اور چوتھی دہائی کا وہ زمانہ ہے جو عالمگیر سرمایہ داری کے ایک شدید ترین بحران، اس نظام کو بچانے کے لیے فاشزم کی تخلیق اور پھیلاؤ، اور فاشزم کے وسیلے سے سوشلسٹ نظام اور سوشلزم کو جنگ کے ذریعے نیست و نابود کرنے کی کوشش سے عبارت ہے یہ معاشرتی نظاموں کے مہیب ٹکراؤ، اور ایک عالمگیر نئی معاشرتی قلب ماہیت سے پیدا ہونے والے اخلاقی اور روحانی تضادات کے فروغ کا زمانہ ہے۔

شاعر کی حیثیت سے اس کے آدرش کو متعین کرنے کے بعد ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ

فیض اس نئی معاشرتی قلب ماہیت کے عمل سے کس طرح ہم آہنگ ہوا۔ دوسرے اکثر شاعر اس زمانے میں اپنی کاوشیں اور وقت ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربوں پر صرف کر رہے تھے اس طرح انھوں نے اُردو شعراء کے اسلوب میں ایک انقلاب کی بنیادیں رکھیں۔ فیض نے بھی اس کام میں تھوڑا بہت حصّہ لیا لیکن اُس کی اصل جدو جہد کا میدان اور تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پورے طور پر اس عظیم معاشرتی انقلابی عمل سے پیدا ہونے والی اخلاقی اور روحانی کشمکش اور کیفیات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے وقف کر دیا جو ساری دُنیا میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

ایسا نہیں کہ دوسرے جدید شاعروں کے یہاں اس عالمگیر معاشرتی صورتِ حال کا شعور ہی نہیں تھا۔ فرق یہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں یہ شعور بالواسطہ، فروعی اور ہنگامی ہے، فیض کے یہاں یہ براہِ راست، نفس الامری اور اندرونی ہے۔ یہی اس کے شعری تجربے کا ست ہے۔ اور اس کا حقیقی موضوعِ سخن۔ وہ ان کیفیات اور واردات کی نقش گری کرتا ہے جو ایک معاشرتی انقلاب کے طوفان کے دوران انسانوں پر گزرتی ہے۔

(امنگ کراچی، فروری ۱۹۸۵ء)

فیض احمد فیض کی آخری

غزل

بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانہ بھی ویراں نہیں کرنے دیتے
ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے
دل میں جو آگ فروزاں ہے عدو اس کا بیاں
کوئی مضموں کسی عنواں نہیں کرنے دیتے
دل کو صد لخت کیا سینے کو صد چاک کیا
اور ہمیں چاک گریباں نہیں کرنے دیتے



بیسویں صدی نئی دہلی فروری ۱۹۸۵

ادبی خبرنامہ

(یکم جنوری ۱۹۸۳ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵)

۴ جنوری :- نشور واحدی کا کانپور میں انتقال۔

۶ جنوری :- شب ۹ بجے مشہور شاعر حرمت الاکرام کی اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے مرزاپور (اتر پردیش) میں وفات ہو گئی۔

۱۴ جنوری :- وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے ہندوستان کے آئین کے اُردو ترجمہ کا اجراء کیا۔

۱۶ جنوری :- احسن رضوی کا بمبئی کے نانا وتی ہسپتال میں انتقال۔

۲۰ جنوری :- مولانا عبدالحمید نعمانی کا ۹۰ سال کی عمر میں مالیگاؤں میں انتقال۔

۲۱ جنوری :- بزرگ شاعر اور جانشین داغ حضرت باغ سنبھلی کے شاگرد اکبر علی خاں اکبر سنبھلی کا سنبھل (ضلع مرادآباد) میں انتقال۔

۲۹ جنوری :- فاروق احمد پیامی عظیم آبادی کی پٹنہ میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات۔ بعد نماز جمعہ قبرستان ملک شاہ اسمٰعیل میں دفنایا گیا۔

۲ فروری :- بہار کے بزرگ شاعر پروفیسر عبدالمجید شمس عظیم آبادی کا پٹنہ میں انتقال۔

۸ فروری :- اسلام آباد (پاکستان) میں فیاض حسن زیدی کی وفات۔

۱۴ فروری :- صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ۲۴ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی نئی عمارت کا افتتاح کیا۔

۱۶ فروری :- وارانسی میں بزرگ شاعر ڈاکٹر عبدالحق کا ۸۴ برس کی عمر میں انتقال۔

۱۹ فروری :- رنگون (برما) میں غالب اکیڈمی نے "غالب ہزار رنگ" کے موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا۔

۱۳ مارچ :۔ کل ہند انجمن ترقی اُردو ہند کے نئے صدر جناب مالک رام کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت اندر کمار گجرال نے کی۔

۲۱ مارچ :۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ہند و پاک میر تقی میر سیمینار کا انعقاد۔

۱۳ مارچ :۔ پروفیسر محمود الہٰی کی دہلی یونیورسٹی میں اُردو تحقیق سمت و رفتار کے موضوع پر تقریر۔

۱۳ مارچ :۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی طرف سے لکھنؤ میں اکاڈمی کے ہال میں منشی دیا نرائن نگم کے فکر و فن پر سیمینار۔

۱ مارچ :۔ بزرگ صحافی اور شاعر فتح چند نسیم کی وفات۔

۱ اپریل :۔ صبح تین بجے بعارضہ قلب مشہور شاعر حفیظ جالندھری کے شاگرد و دار کا داس شعلہ کا دہلی میں انتقال۔

۱۰-۱۷ اپریل :۔ انجمن ترقی اُردو بہار کی دو روزہ صوبائی کانفرنس کا مظفر پور میں انعقاد۔

۱۱ اپریل :۔ راجستھان اُردو اکیڈمی کی جانب سے شب افسانہ کا اہتمام۔ انتظار حسین نے افسانہ "کشتی" اور ایک مقالہ نئے افسانہ نگاروں کے نام پڑھا۔

۲۱-۲۳ اپریل :۔ مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کی جانب سے کلکتہ میں تقسیم انعامات، کتاب کا اجراء، سیمینار، ڈرامے اور مشاعرہ کا انعقاد۔

۲۱ اپریل :۔ علی گڑھ میں شیخ الجامعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں خلیل الرحمٰن اعظمی پر ایک روزہ سیمینار جس میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وحید اختر، وقار حسین اور ابو الکلام قاسمی نے مقالے پڑھے۔

۷-۸ مئی :۔ حلقہ ادب بہار کے زیر اہتمام یوم سیماب کی دو روزہ تقریبات کا اہتمام۔

۱۴ مئی :۔ رات پٹنہ میڈیکل کالج میں نوجوان صحافی قمر اعجازی کا انتقال۔

۱۶ مئی :۔ اُردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجد کی اورنگ آباد میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات۔

۲۶ مئی :۔ اُردو گھر نئی دہلی میں پاکستان کے شاعر و ادیب شان الحق حقی کو استقبالیہ۔

۱۳ جون :۔ حبیب اللہ قمر اعظمی کی مئو ناتھ بھنجن میں ۸۰ برس کی عمر میں وفات۔

۱۸ جون :۔ اُتر پردیش ریاستی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا قیصر باغ لکھنؤ میں انعقاد۔

۳۰ جون :۔ لکھنؤ میں بزرگ صحافی اور شاعر آتش سلونوی کا انتقال۔

〃 〃 لیوان میں بیج ناتھ خرد لیوانی کی وفات۔

۷ جولائی :۔ بزرگ صحافی شاعر اور ادیب گوپی ناتھ امن لکھنوی کی دہلی میں وفات۔

۲۸ جولائی :۔ مجلس یادگار خواجہ حسن نظامی کے زیر اہتمام بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں امیر خسرو

کے عہد اور فن" پر مجلس مذاکرہ کا انعقاد۔

۱۱ اگست:۔ بچوں کے ادیب مولوی حفیظ الدین کا کامٹی ضلع ناگپور میں ۸۰ سال کی عمر میں انتقال۔

۱۳ اگست:۔ اورنگ آباد میں اوج یعقوبی کی وفات۔ مرحوم حیدرآباد سے ایک مشاعرے کے سلسلے میں اورنگ آباد آئے ہوئے تھے۔

۱۲-۱۳ اگست:۔ انجمن ترقی اردو ہند کا اجلاس اردو گھر نئی دہلی میں منعقد ہوا۔

۳۱ اگست:۔ ادیب، ناقد اور شاعر ڈاکٹر سلیم احمد کا کراچی میں انتقال۔

۶-۷ ستمبر:۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی کے ایوان غالب میں آل انڈیا اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس فورم برائے قومی یک جہتی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی کل ہند اردو کانفرنس برائے قومی یک جہتی کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر نامور ادیب و صحافی خواجہ احمد عباس کو قومی یک جہتی کو فروغ دینے والے بہترین ادیب کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔

۲۷ ستمبر:۔ ممتاز دانشور پروفیسر عالم خوندمیری کی مہاویر ہسپتال حیدرآباد میں وفات۔

یکم اکتوبر:۔ کیفی اعظمی کو ایفرو ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن کی جانب سے تاشقند میں منعقد اجلاس کے اختتام پر لوٹس پرائز دینے کا اعلان۔

۱۲-۱۳ اکتوبر:۔ کٹک میں اردو کانفرنس کا انعقاد۔ افتتاح گورنر اڑیسہ شری بشمبر پانڈے نے کیا۔

۱۹ نومبر:۔ نامور ادیبہ آمنہ خاتون کا انتقال۔

۲۰ نومبر:۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ایک سڑک حادثہ میں کراچی میں وفات پا گئے۔

۲۱ نومبر:۔ ماہنامہ "نیا دور" کے سابق مدیر سید خورشید احمد کی لکھنؤ میں وفات۔

۲۳ نومبر:۔ مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ایم اسلم کی لاہور میں وفات۔

۱۸ دسمبر:۔ انجمن ترقی اردو بہار کی مجلس عاملہ کا اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر عبدالمغنی منعقد ہوا۔

۲۱ دسمبر:۔ غالب ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیر اہتمام بزرگ شاعر حضرت ساغر نظامی کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔

۲۲ دسمبر:۔ کلیم الدین احمد کا پٹنہ میں انتقال۔

۲۴ دسمبر:۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے غالب سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار جس کا افتتاح بیگم عابدہ احمد ممبر پارلیمنٹ نے کیا۔

۲۵-۲۶ دسمبر:۔ بین الاقوامی غالب سیمینار کے اجلاس جن میں متعدد اسکالروں نے مقالے پڑھے۔

یکم جنوری ۸۴:۔ سید علی ہاشمی کا سندیلہ میں انتقال۔

۴ جنوری:۔ اے بی ولسن فکسن کا پنڈسی کی وفات۔

۶ جنوری :۔ شاداں بدایونی کے شاگرد وحید شادانی ضلع چپارن میں وفات پا گئے۔

۳ جنوری :۔ روزنامہ رہنمائے دکن کے منیجنگ ایڈیٹر سید لطیف الدین قادری کا انتقال۔

۲۵ جنوری :۔ قاضی عبدالودود کی پٹنہ کے ہسپتال میں دوپہر دو بجے وفات۔

۱۱ فروری :۔ اختر امروہوی کا کراچی میں انتقال۔

۱۳ فروری :۔ ڈبلیو اے صمد خاں تحرم صبح زیبائی کی وفات۔

۱۸ فروری :۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی لاہور میں انتقال کر گئے۔

۲۷ فروری :۔ ساغر نظامی کی نئی دہلی میں وفات۔

۲۸ فروری :۔ ساغر نظامی کو دوپہر گیارہ بجے بستی نظام الدین میں غالب اکیڈمی کے عقب میں دفنایا گیا۔

۷ مارچ :۔ خزاں چند نسیم حیرتی نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

۴ مارچ :۔ شنکر لال مرلی دھر میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام نئی دہلی میں انڈو پاک مشاعرہ کا انعقاد۔

۱۱ مارچ :۔ اطہر پرویز کی علی گڑھ میں دورۂ قلب کے سبب وفات۔

۳۰ مارچ :۔ ساتویں کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی افتتاحی تقریر۔ کانفرنس ۸ر اپریل ۱۹۸۴ء تک جاری رہی۔ ملک بھر میں یوم اردو منایا گیا اس موقع پر جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔ اور تجویزیں پاس کی گئیں۔

۹ اپریل :۔ دگمبر پرشاد گوہر دہلوی کی دہلی میں وفات۔

۱۰ اپریل :۔ نازش پرتاپ گڈھی لکھنؤ کے بلرام پور ہسپتال میں طویل علالت کے بعد چل بسے۔

۲۶ اپریل :۔ خواجہ عبدالغفور، سکریٹری مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی بمبئی اور لوناوالا کے درمیان ٹرین میں سفر کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے وفات۔

۱۲ مئی :۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا نئی دہلی میں انتقال۔

۲۰ مئی :۔ دربھنگہ میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی ریاستی شاخ کا اجلاس جس میں وزیر اعلیٰ بہار چندر شیکھر سنگھ نے اردو اداروں کے ایک کمپلیکس کی تعمیر کا اعلان کیا۔

۲۵ مئی :۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی وفات۔

۲۷ مئی :۔ سیوان (بہار) میں سارن اردو علاقائی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس جس میں وزیر اعلیٰ بہار نے بھی شرکت کی۔

۳۰ مئی :۔ پٹنہ میں اردو ایڈیٹرز کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس جس کا افتتاح وزیر اعلیٰ بہار چندر شیکھر سنگھ نے کیا اس موقع پر اردو صحافت پر قومی سیمینار ہوا۔

۲ جون :۔ افسانہ نگار رتن رسال پوری بٹالہ (پنجاب) میں بم کے حادثے میں ہلاک۔

۳ جون :- ڈرامہ نویس قادر علی بیگ کا حیدرآباد میں انتقال۔

۵ جون :- ساراشگفتہ کی ریل حادثہ میں وفات۔

۱۲ جون :- ہندوستان ٹائمز کی جانب سے نئی دہلی میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد جس کی صدارت علی سردار جعفری نے اور افتتاح وزیر اطلاعات ونشریات شری ایچ کے ایل بھگت نے کیا۔

۱۷ جون :- پروفیسر محمد صادق کی لاہور میں وفات۔

۲۳ جون :- طویل علالت کے بعد ظفر ادیب کی نئی دہلی کے لوک نائک جے پرکاش نرائن ہسپتال میں وفات۔

۲۵ جون :- کالم نویس اور صحافی چرنجی لال بیپال نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

۳ جولائی :- مولانا شعیب عمر کی بنگلور میں وفات۔ مرحوم مولانا آزاد پر اتھارٹی تھے۔

۴ جولائی :- صبا عظیم آبادی کا بلرام پور ہسپتال (لکھنؤ) میں انتقال۔

۶ جولائی :- وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ایوان غالب نئی دہلی میں منعقد ایک تقریب میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے غالب ایوارڈز تقسیم کئے۔ یہ انعامات قرۃ العین حیدر، خلیق احمد نظامی، ریوتی سرن شرما، عابد علی خاں، محمد خلیق ٹونکی، مجتبیٰ حسین اور (مرحوم) ساغر نظامی کو دیئے گئے۔

۶ جولائی :- ڈمراؤں راج ہسپتال بھوجپور میں عبدالغفور خان بیباک بھوجپوری کی وفات۔

۹ جولائی :- سہ بہر کو شاعر و صحافی بی۔ ڈی۔ مائل ملیح آبادی ذاکر نگر نئی دہلی میں چل بسے۔

۱۰-۱۱ جولائی :- فیض کلچرل اکیڈمی اور لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے اشتراک سے لندن یونیورسٹی میں فیض احمد فیض پر دو روزہ سیمینار جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مجاہد ترمذی، ڈاکٹر محمد حسن، جارج عشر، زہرہ نگاہ، ڈاکٹر ایوب مرزا، افتخار عارف، ساقی فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب وغیرہ نے حصہ لیا۔

۱۵ جولائی :- وزیر اعلیٰ بہار شری چندر شیکھر سنگھ نے پٹنہ میں اردو بھون کا سنگ بنیاد رکھا۔

۱۷ جولائی :- مفکر و شاعر مظفر حسین کا پٹنہ میں انتقال۔

۲۱ جولائی :- فکی آڈیٹوریم نئی دہلی میں اردو اکادمی کا جلسہ تقسیم اسناد۔

۲۵ جولائی :- ترقی پسند شاعر مظفر شاہجہاں پوری کا بمبئی میں انتقال۔

۲۶ جولائی :- رام پور میں مولوی سید فریدالدین عرف اچھے میاں کا انتقال۔ مرحوم عرصہ تک رام پور سے تہذیب الاخلاق شائع کرتے رہے اور شہر کے بزرگ وکیل تھے۔

۲۹ جولائی :- سادھو سنگھ ہمدرد ایڈیٹر روزنامہ "اجیت" کی جالندھر (پنجاب) میں وفات۔

۸ اگست :- الٰہ آباد سے روزنامہ "سفیر نو" کا اجراء۔

۱۵ اگست:۔ نظام آباد کے بزرگ شاعر قاضی غوث صدیقی کا نظام آباد (حیدرآباد) میں دل کے عارضے سے انتقال۔

۱۸ اگست:۔ شاعر و ادیب سید افسر رضا کی کانپور میں دن کے ڈیڑھ بجے وفات۔

۱۹ اگست:۔ ادیب اسلام بیگ چنگیزی کی رحلت۔

۲۵ اگست:۔ ادریس سہارنپوری ایڈیٹر ماہنامہ "سہیل" کا انتقال۔

۴ ستمبر:۔ مرزا ظفر الحسن کی کراچی میں وفات۔

۱۸ ستمبر:۔ نظام آباد کے بزرگ شاعر مفتی صدیقی چل بسے۔

۲۰۔۲۲ ستمبر:۔ کراچی میں حلقہ نیاز و نگار کے تحت علامہ نیاز فتحپوری پر سیمینار کا انعقاد۔

۲۶ ستمبر:۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد کی ناگپور میں بعارضہ قلب رحلت۔

۲۹ ستمبر:۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کی علی گڑھ میں وفات۔

۳۰ ستمبر، یکم اکتوبر:۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی کانفرنس کا دسواں اجلاس ملاپور میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد حسن اور افتتاح کالی کٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر این چندرن نے کیا۔

۱۰ اکتوبر:۔ لندن میں مس بے نظیر بھٹو نے پیپلز پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "عمل" کا افتتاح کیا۔

۱۸ اکتوبر:۔ دہلی یونیورسٹی میں علی سردار جعفری نے نظام خطبات بعنوان اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے پچاس سال پیش کئے۔

۲۰ اکتوبر:۔ حافظ رحمت لکھنوی کی لکھنؤ میں وفات

۹ نومبر:۔ رات کو نو بہار صابر کی پٹیالہ (پنجاب) میں وفات۔

۱۱ نومبر:۔ راجندر سنگھ بیدی کا بمبئی میں اپنی قیام گاہ پر انتقال۔

۱۷ نومبر:۔ مولانا طہٰ کمال ندوی پٹنہ میں چل بسے۔

۲۰ نومبر:۔ لاہور میں فیض احمد فیض کا بعارضہ قلب انتقال۔

۱ دسمبر:۔ بھگوان داس نقش صحرائی کی نئی دہلی میں وفات۔ مرحوم روزنامہ تیج سے بحیثیت نیوز ایڈیٹر وابستہ تھے۔

۲ دسمبر:۔ عزیز ربانی عزیز مدیر اعلیٰ "نئی دنیا" جون پور کا انتقال۔

۹ دسمبر:۔ پنجابی ساہتیہ سنگم کا جلسہ تقسیم اسناد جس کی صدارت سابق وزیر اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال نے کی

۱۴ دسمبر:۔ رام کرشن مضطر ککروڑوی کی نئی دہلی میں وفات۔

۲۵ دسمبر:۔ ضمیر الدین قریشی کا علی گڑھ میں انتقال۔

۲۰ جنوری ۸۵ء:۔ پروفیسر محمد مجیب سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جامعہ نگر نئی دہلی میں انتقال۔

۲۴ جنوری :- سمن سرحدی کی گنگارام ہسپتال نئی دہلی میں وفات۔

۲۶ جنوری :- اُتر پردیش اُردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے یومِ اُردو کے سلسلے میں رام پور میں خصوصی تقریب۔

۲۹ جنوری :- شبنم زیدی کا لکھنؤ میڈیکل کالج میں مختصر علالت کے بعد انتقال۔

۳ فروری :- لکھنؤ میں مرزا یگانہ چنگیزی کے صد سالہ یومِ ولادت کے سلسلے میں یگانہ چنگیزی سمینار کا انعقاد۔

۱۲ فروری :- ایوانِ غالب نئی دہلی میں مومن خاں مومن پر سہ روزہ سمینار۔

۱۷ فروری :- نسیم قریشی کی میڈیکل کالج علی گڑھ میں وفات۔

۱۰-۹ مارچ :- انجمن ترقی اُردو ہند کے زیرِ اہتمام دہلی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صد سالہ تقریبات۔
افتتاح گورنر ہریانہ جناب مظفر حسین برنی نے کیا۔ اس موقع پر دو روزہ سیمینار ہوا۔

۱۹ مارچ :- قیصر اندوری کی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات۔

مارچ :- خاتونِ مشرق کے بانی ایڈیٹر اور کہنہ مشق صحافی عبداللہ فاروقی کی دہلی میں رحلت۔

۱۰ اپریل :- حیدرآباد کے شاعر محمد شمس الدین تاباں کا طویل علالت کے بعد وفات۔ تدفین ۱۱ اپریل کو ہوئی۔

۱۲ مئی :- روزنامہ "اندنوں" پٹنہ کے مدیر ادریس احمد کی پٹنہ میں کینسر کے مرض سے وفات۔

۲۲ مئی :- روشن علی خاں روشن بنارسی کی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات۔

۲۴ مئی :- ماہنامہ "شمع" نئی دہلی کے مدیرِ اعلیٰ حافظ یوسف دہلوی کی وفات۔

مئی :- سعید احمد اکبرآبادی کا کراچی میں انتقال۔

۲۶ مئی :- مختار الدین آسی کی فتح گڑھ میں رحلت۔

۳ جون :- شہباز امروہوی کی وفات۔

۱۵ جون :- قدوس صہبائی کا کراچی میں انتقال۔

۱۸ جون :- قومی آواز کے سینئر سب ایڈیٹر اور شاعر افضل عظیم آبادی کی پٹنہ میں وفات۔

۲۱ جون :- بیگم آصف محیب کا جامعہ نگر نئی دہلی میں انتقال۔

۲۷ جون :- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے چیئرمین پروفیسر قاضی رضوان اللہ کی علی گڑھ میں وفات۔

۲۷ جولائی :- سید شاہ محمد قاسم رضوی قتیل دانا پوری کا انتقال۔

۱۳ اگست :- مولانا انور صابری کی دیوبند میں رحلت۔

۱۴ اگست :- زیب غوری کی کراچی میں وفات

۱۷ اگست :- شاذ تمکنت کا حیدرآباد میں انتقال۔

۱۹ اگست :- اختر انصاری اکبرآبادی کی بہاولپور میں رحلت

۲۴ اگست :۔ مزاحیہ شاعر ناظم انصاری کی جھانسی ریلوے اسٹیشن پر دل کا دورہ پڑنے سے رحلت۔

اگست :۔ متین الرحمٰن کی رحلت۔

اکتوبر :۔ مولانا یونس خالدی کی طویل علالت کے بعد لکھنؤ میں وفات۔

۲۴ اکتوبر :۔ لاہور میں ادیب و صحافی مقبول جہانگیر کی وفات۔

۳ نومبر :۔ سید علی افسر کی حیدرآباد میں رحلت۔

۴ نومبر :۔ مہذب لکھنوی کی لکھنؤ میں رحلت۔

۱۵ نومبر :۔ دھرم گپتا وفا ایڈیٹر روزنامہ تیج نئی دہلی کی وفات۔

۱۶ نومبر :۔ مشہور ناول نگار گلشن نندہ کا بمبئی کے بیچ کینڈی ہسپتال میں انتقال۔

— نومبر :۔ صحافی ازہر شاہ قیصر کی دیوبند (اترپردیش) میں رحلت۔ واصف القادری کی وفات۔

۲ دسمبر :۔ صدر جمہوریۂ ہند گیانی ذیل سنگھ نے ایوان غالب نئی دہلی میں غالب انعامات تقسیم کئے۔

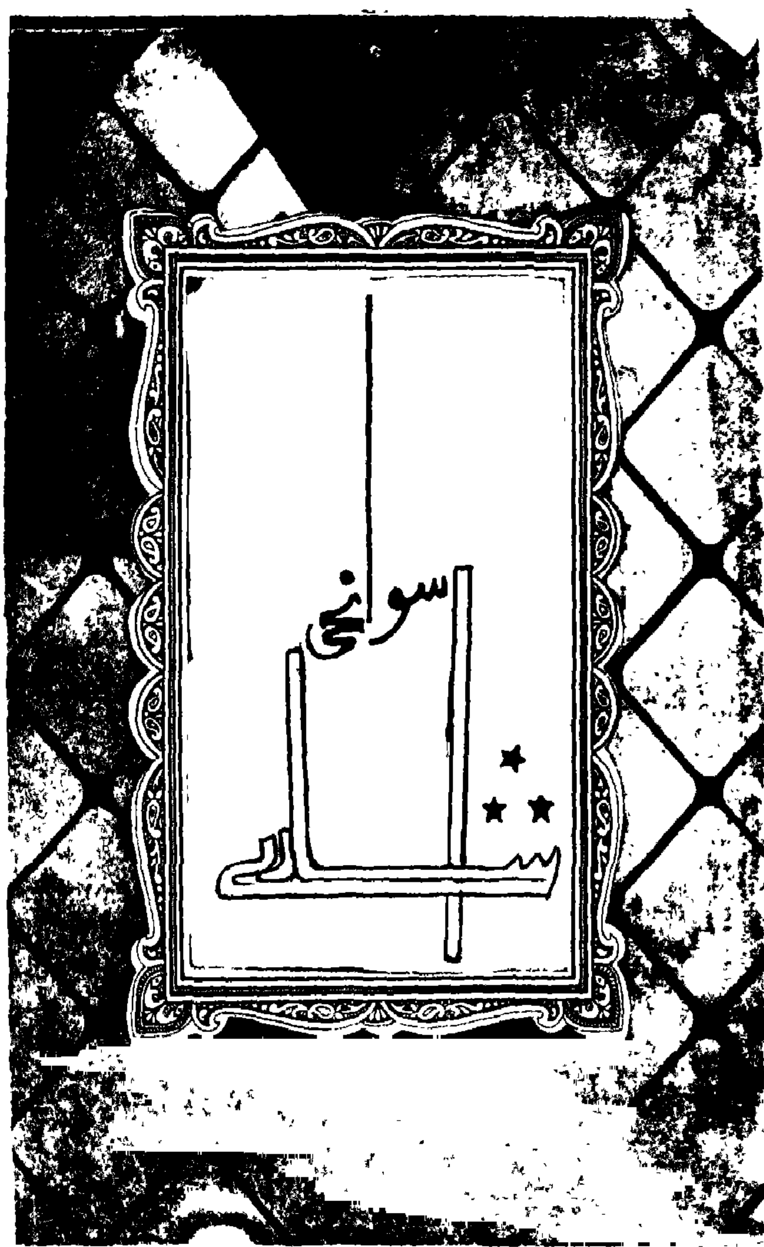
۸ دسمبر :۔ ثاقب کانپوری کا کانپور میں انتقال۔

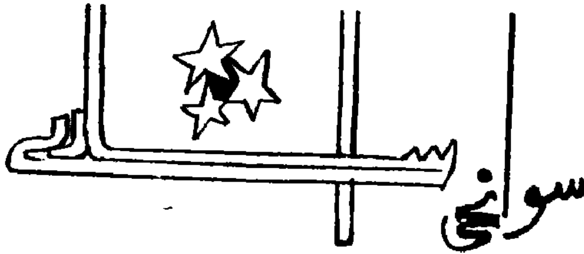
۱۳ دسمبر :۔ ظفر تہذیبی کی سہارنپور میں وفات۔

بقیہ اردو ادب میں کلیم الدین احمد کا مقام

خواہ ان میں تمثیل کا رنگ ہو یا نہ ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیم الدین احمد نے عالمی ادب کو فقط مغربی ادب تصور کر لیا اور آفاقی سرمایۂ ادب سے مشرق کے شاندار کارنامے کو خارج کر دیا حالانکہ مشرقی شاعری کی عظیم الشان روایات کے سامنے مغربی شاعری طفل مکتب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایک فارسی شاعری کے فنی کمالات کا کوئی جواب پوری قدیم اور جدید مغربی شاعری میں نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد کے برخلاف عصر حاضر میں عبدالحق، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، اختر اورینوی، وقار عظیم اور احتشام حسین کی تنقیدیں پرورش ذوق اور تربیت شعور کی ایک مثبت تعمیری فضا بناتی ہیں، جبکہ شبلی و حالی کے پیش رو نمونے پہلے سے موجود ہیں۔ لہٰذا اردو ادب کی تاریخ میں کلیم الدین احمد کو ایک منفرد و ممتاز مقام دینے کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ نہ تو اردو ادب کے سب سے بڑے نقاد ہیں اور نہ تنقید کے مسیحا، بلکہ مجموعی طور پر ان سے بہتر تنقید نگاری عصر حاضر میں آل احمد سرور اور احتشام حسین نے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید کی نئی نسل پر کلیم الدین احمد کا کوئی خاص اثر نہیں ہے اور ایک احسن فاروقی کو چھوڑ کر کسی قابل ذکر تنقید نگار نے ان کی پیروی نہیں کی ہے، جبکہ آل احمد سرور اور احتشام حسین کے رنگ میں لکھنے والے تنقید نگاروں کی صف در صف مرتب ہو چکی ہے۔

(آج کل، نئی دہلی مئی ۱۹۸۴ء)


سوانح شبلی



احمد ندیم قاسمی

نام: احمد شاہ

پیدائش: ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء انگہ۔ ضلع شاہ پور (پاکستان)

تعلیم: بی اے (۱۹۳۵ء)



ایڈیٹر فنون۔ لاہور

مطبوعات: چوپال (افسانے) شعلۂ گل۔ جلال و جمال (شعری مجموعہ)

پتہ: ۳۷ انارکلی۔ لاہور (پاکستان)

اختر الایمان

پیدائش: ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء قلعہ پتھر گڑھ نجیب آباد ضلع بجنور (یوپی)

تعلیم: ایم اے



میرٹھ میں ایشیائی ادارت کے سلسلے میں مقیم رہے۔ محکمہ سول سپلائز اور آل انڈیا ریڈیو میں بھی ملازمت کی۔ ۱۹۴۴ء میں شالیمار پکچرز سے وابستہ ہوئے۔ تب سے فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔ شعری مجموعہ "یادیں" پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔

مطبوعات: گرداب، سب رنگ، تاریک سیارہ، بنتِ لمحات، نیا آہنگ، اِک لڑکا، آب جو، اور یادیں۔

پتہ: بینڈ اسٹینڈ بلڈنگ کینز روڈ۔ بمبئی ۵۰

اختر انصاری

پیدائش : ۳۰ ستمبر ۱۹۰۹ء - بدایوں۔
تعلیم : بی اے آنرز (دہلی یونیورسٹی ۱۹۳۰ء) بی ٹی (۱۹۳۴ء علی گڑھ یونیورسٹی)
ایم اے اردو ۴۷-۱۹۴۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹی کالج میں ٹیچر اور ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں شعبۂ تعلیمات میں منتقل ہو گئے۔



مطبوعات : شعری مجموعے۔ شعلۂ جام
بر بطِ دل، دہانِ زخم، نغمۂ روح (۱۹۳۲ء)
خوناب (قطعات کا مجموعہ) آبگینے ۱۹۴۱ء
(رومانی نظمیں) خندۂ سحر، اردو عمرِ وقت کی باہنوں میں۔
افسانوں کے مجموعے : اندھی دنیا، نازو اور خونی، تنقید : افادی ادب ۱۹۴۱ء
ایک ادبی ڈائری، غزل اور درس غزل، غزل کی سرگزشت، تعلیم سماج اور کلچر، غزل اور غزل کی تعلیم، حالی اور نیا تنقیدی شعور۔
پتہ : شہر زاد
جامعہ اردو روڈ - علی گڑھ (اتر پردیش)

اشک - پریم پال

نام : پریم پال۔
پیدائش : ۵ جون ۱۹۳۲ء جالندھر پنجاب
تعلیم : ایم اے اردو (دہلی یونیورسٹی، ۱۹۵۰)
پیشہ : سرکاری ملازمت (سب ایڈیٹر سینک سماچار



مطبوعات : یاترا (منظوم ۱۹۵۶ء)
راماین (منظوم ۱۹۶۱) شکنتلا (منظوم ۱۹۶۳)
سرشار ایک مطالعہ (تحقیق و تنقید ۱۹۶۴)
سرشار۔ بشن نرائن درد کی نظر میں (تحقیق و ترجمہ ۱۹۶۶) روزمرہ محاورہ غالب (۷۹)
کام شوتر (ترجمہ ۱۷) فلمیں کیسے بنتی ہیں (ترجمہ ۷۹) ہماری فلمیں ہمارا سماج (۱۹۸۰) رتن ناتھ سرشار (۱۹۸۲ء)

پتہ : ۶۳ - ایم بنگلہ صاحب روڈ نئی دہلی

آل احمد سرور

پیدائش : ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء بدایوں
تعلیم : بی ۔ ایس ۔ سی، ایم اے انگریزی و اردو (آگرہ اور علی گڑھ یونیورسٹی)
صدر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی رہے ۷۴-۱۹۵۶ء کل ہند انجمن ترقی

اسعد (ہند) کے جنرل سکریٹری۔ آسدو سے متعلق کئی کمیٹیوں کے رکن رہ چکے ہیں۔ آج کل کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

مطبوعات: سلسبیل ۱۹۳۵ء (شاعری) تنقیدی اشارے ۱۹۴۲ء نئے اور پرانے چراغ ۱۹۴۶ء تنقید کیا ہے ۱۹۴۷ء ادب اور نظریہ ۱۹۵۴ء ذوق جنون ۱۹۵۵ء مسرت سے بصیرت تک، نظر اور نظریے۔

پتہ: دودھ پور۔ علی گڑھ (یوپی)

امیر قزلباش

نام: امیر آغا

پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۹۴۵ء



مطبوعات: "شکایتیں میری"، "بازگشت"، "انکار"، "رجز" (شعری مجموعے)

پتہ: اے-۱۱ نظام الدین ایسٹ نئی دہلی ۱۳

اندرجیت لال

نام: اندرجیت

پیدائش: ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کوہ مری ضلع راولپنڈی (پاکستان)

تعلیم: ایم اے (انگریزی) ڈپلومہ ان جرنلزم، اردو آنرز۔

پیشہ: سرکاری ملازمت
مطبوعات: نیا ہندوستان، سائنس اور ہندوستان، آج کی سائنس، بیر شیر کی کہانی، سوامی رام تیرتھ کی کہانی، اناجوں کا بادشاہ گیہوں، ایٹم کی کہانی، ہم اور ہمارے بچے، ہمارے قومی ہیرو، قلم اور آواز۔ نغمہ روح ۱۹۸۲ء (روحانی غزلوں کا انتخاب)
پتہ: ڈی ۱۳ گل مہر پارک نئی دہلی

اندر سروپ نادان

نام: اندر سروپ دت
پیدائش: ۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء ٹھی دتاں ضلع اٹک۔

تعلیم: بی اے
پیشہ: ڈپٹی سکریٹری وزارت داخلہ
مطبوعات: غبار رنگ (شعری مجموعہ) ۱۹۷۰ء
پتہ: ۳/۲۶۹ بی پشچم وہار نئی دہلی ۶۳

انصاری، حیات اللہ

پیدائش: یکم جنوری ۱۹۱۱ء لکھنؤ

تعلیم: بی اے۔
قومی آواز کے مدیر رہے۔ ان دنوں راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔
مطبوعات: بھرے بازار میں ۱۹۴۵ء (افسانے) ن۔م راشد پر ۴۵ (تنقید) شکستہ کنگورے ۱۹۵۶ (افسانے) لہو کے پھول (ناول چار حصے) مدار۔

پتہ: ریور بنک کالونی۔ لکھنؤ

آنند نرائن ملا

پیدائش: اکتوبر ۱۹۰۱ء
تعلیم: ایم اے ایل ایل بی (لکھنؤ) ۱۹۲۶ء میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۵۴ء الہ آباد ہائی کورٹ کے جج۔ لوک سبھا کے ممبر اور جیل میں اصلاحات سے متعلق کمیشن کے چیرمین رہے۔
مطبوعات: جوئے شیر ۵۰ (شاعری) کرب آگہی۔ سیاہی کی ایک بوند۔ کچھ

ذرے کچھ تارے (غالب انعام) میری مدیث عمر گریزاں (ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ۱۹۶۹ء) مضامین نہرو۔ یادِ جگبست۔ جادۂ ملا (شعری مجموعہ)

پتہ: بی۔آر۔ مہتہ لین۔ نی دہلی۔

باقر مہدی

پیدائش: ۱۱ر فروری ۱۹۲۷ء ردولی۔



تعلیم:۔ ایم۔اے (اقتصادیات)

پیشہ: فری لانسر

مطبوعات: شہرِ آرزو ۵۸۔ کالے کاغذ کی نظمیں ۶۷۔ ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں ۲ (شعری مجموعے) آگہی و بیباکی ۶۵ تنقیدی کشمکش ۷۹ء (تنقید)

پتہ: ۸-۱۰ موتی شاہ لین مژگاؤں بمبئی ۱۰

باوا کرشن گوپال مغموم

نام: کرشن گوپال۔ تخلص مغموم

پیدائش: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۶ دومیل ضلع اٹک (پاکستان)

تعلیم: بی اے (دیال سنگھ کالج۔ لاہور ۱۹۳۸ء)

مطبوعات: آرزوؤں کے خواب، بیداریٔ وطن، بزمِ ماتم، آرزوؤں کے جزیرے، نقوشِ حسن، رباعیاتِ مغموم، درگاہ ہائے سرور جہان آبادی۔

پتہ:۔ ۸ گلفشن روڈ فرفیلڈ این جے ۶ (یو۔ایس۔اے)

بشیر بدر

پیدائش: ۱۵ر فروری ۱۹۳۵ء کانپور۔

تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی

پیشہ: درس و تدریس۔



مطبوعات: اکائی، امیج، آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ۔

پتہ: ۲۰۶ شاستری نگر میرٹھ (یوپی)

بلراج کومل

پیدائش : ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء سیالکوٹ
تعلیم : ایم اے انگریزی



مطبوعات : میری نظمیں (۱۹۵۴ء) رشتۂ دل (۱۹۶۳ء) سفر مدام سفر (۱۹۶۵ء) شرارِ سنگ، آنکھیں اور پاؤں۔ ہندی میں ناریل کا ایک درخت (شعری انتخاب) روٹی کا ایک ٹکڑا (ناولٹ)

پتہ : ۱۲۹۔E کالکاجی نئی دہلی ۱۹۔۱۱۰۰

بلونت سنگھ

پیدائش : ۱۹۲۶ گوجرانوالہ (پاکستان)
تعلیم : بی اے الہ آباد یونیورسٹی
پیشہ : تجارت۔
مطبوعات : جگا ۱۹۴۴ء (افسانے) تاریو پود ۱۹۴۴ء (افسانے) ہندی کتابیں : رات چور اور چاند ۱۹۵۰ء (ناول) پنجاب کی کہانیاں ۱۹۵۴ء میں مزدور سدوؤں گی ۱۹۵۵ (افسانے)
پتہ : اپریل ہوٹل چوک الہ آباد یوپی

بیکل اتساہی

نام : محمد شفیع خاں
پیدائش : ۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء
مقام ولادت : گودر موان پور تحصیل اترولہ، ضلع گونڈہ
تعلیم : انٹرمیڈیٹ۔ ادیب ماہر کامل وشیش یوگتا۔ وشارد
پیشہ : کاشت کار رکن راجیہ سبھا
مطبوعات : پروائیاں (غزلوں کا مجموعہ) کومل مکھڑے (گیت) اپنی دھرتی چاند کا درپن۔ لہکے بگیا مہکے گیت، جام گل



موج تسنیم، نور یزداں، مرور جاں (نعتیں) دھرتی سدا سہاگن، رنگ ہزاروں خوشبو ایک، غزل سانوری۔
پتہ : گیتا نج۔ بلرام پور ضلع گونڈہ ۲۷۱۲۰۱

پروانہ ردولوی

نام : سید مثیم تمار
پیدائش : ۱۱ نومبر ۱۹۲۳
تعلیم : بی اے

چیف ایڈیٹر روزانہ سیاست بولاہور۔ ایڈیٹر انچارج روزانہ نئی دنیا دہلی۔ نیوز ایڈیٹر روزانہ دعوت دہلی نیوز ایڈیٹر روزانہ ملک مت دہلی ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزانہ قائد لکھنؤ



مطبوعات: آزمائش (ناول) ویرانی نہیں جاتی (ناول) کربلا سے کوفہ تک (تاریخ) شاہنامہ کربلا (منظوم تاریخ)
پتہ: حوض رانی ۱۶۵۔ مالویہ نگر نئی دہلی

جاوید وششٹ

نام: شیو پرشاد وششٹ تخلص جاوید
پیدائش: ۲۶ ستمبر ۱۹۲۰ء موضع فتح پور بلوچ ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی (موضوع اسداللہ وجہی حیات و ادبی کارنامے ۱۹۷۹)
ذاکر حسین کالج میں اردو کے استاد رہے ہیں اور اب ملازمت سے سبکدوش ہیں۔

مطبوعات: شعلۂ تشنگی ۶۳ (شعری مجموعہ) ایک جسم ایک نظر (شعری مجموعہ) ملا وجہی کے انشائیے۔ روپ رس۔ سب رس کا قصۂ حسن و دل۔
پتہ: موضع فتح پور بلوچ۔ ضلع گوڑگاؤں۔ ہریانہ

جذبی

نام: معین احسن تخلص جذبی
پیدائش: ۲۱ اگست ۱۹۱۲ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (اترپردیش)
تعلیم: ایم اے (۱۹۴۲) پی ایچ ڈی (۱۹۵۶۔ موضوع حالی کا سیاسی شعور)
۱۹۲۹ میں شاعری شروع کی ۴۵۔۱۹۴۳ میں آج کل کے نائب مدیر رہے بعد ازاں ۱۹۴۵ میں علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔



مطبوعات: فروزاں (شعری مجموعہ) حالی کا سیاسی شعور (تنقید)
پتہ: ذکاء اللہ روڈ۔ علی گڑھ (یوپی)

جگن ناتھ آزاد

نام جگن ناتھ تخلص آزاد
پیدائش: ۵ دسمبر ۱۹۱۸ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی۔
تعلیم: ایم اے آنرز اِن فارسی (پنجاب یونیورسٹی)
تقسیم ملک کے بعد آج کل اور لیبار عالم کے مدیر معاون رہے۔ جون ۱۹۵۵ میں وزارت اطلاعات و نشریات میں

انفارمیشن افسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ میں
یوروپ کا سفر کیا۔ ۱۹۶۶ میں بارڈر
سیکورٹی فورس میں پبلک ریلیشنز افسر۔
۶۸ میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر
اور ۷۴ء میں سری نگر میں ڈائرکٹر پبلک
ریلیشنز کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۷
میں سبکدوشی کے بعد جموں یونیورسٹی کے
شعبہ اُردو میں پروفیسر مقرر ہوئے۔



مطبوعات: بیکراں، ستاروں سے ذروں
تک۔ نواسے پریشان (شعری مجموعے)
اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال اور اس
کا عہد، نشانِ منزل، علامہ اقبال کی ایک
ادبی سوانح، آنکھیں ترستیاں ہیں۔
پتہ: صدر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں

جمیل الدین عالی

تعلیم: بی اے ایل ایل بی
پیدائش: ۱۹۲۶ء دہلی
پیشہ: ایگزیکٹو پریذیڈنٹ نیشنل بنک
آف پاکستان۔
مطبوعات: غزلیں، دوہے، گیت،
لاحاصل، جیوے پاکستان (قومی نظم)

دنیا میرے آگے۔ تماشہ میرے آگے،
آتس لینڈ۔
پتہ: نیشنل بنک آف پاکستان (کراچی)

جوگندر پال

پیدائش: ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء سیالکوٹ
تعلیم: ایم اے
مطبوعات: ایک بوند لہو کی۔ سلوٹیں،
رسائی۔ مٹی کا ادراک۔ بے ارادہ۔ لیکن،



آمد و رفت (افسانوں کے مجموعے) نادید
۱۹۸۳ (ناول) بیانات (ناولٹ) پریم
چند کی کہانیاں۔
پتہ: ۳۲۔ اے۔ ایس ایف ایس
الک نندہ۔ کالکاجی نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

جیلانی بانو

پیدائش: ۱۴ر جولائی ۱۹۳۶ بدایوں یوپی
تعلیم: ایم اے اُردو (جامعہ ملیہ)
مطبوعات: روشنی کے مینار ۵۸۔ نروان
۱۹۶۴ (افسانوں کے مجموعے) جگنو اور
ستارے ۱۹۶۴ (ناولٹ) جیتی جاگتی کہانیاں
۱۹۶۵ (بچوں کی کہانیاں) ایوانِ غزل



۱۹۷۶ (ناول)

پتہ: ۱۱/۱۰۸ معظم پورہ حیدر آباد

حامدی کاشمیری

پیدائش: ۲۹ر جنوری ۱۹۳۲ء بہوری کدل سری نگر (جموں کشمیر)

تعلیم: ایم اے انگریزی (۱۹۵۴ء) ایم اے اُردو (۱۹۵۰ء) پی ایچ ڈی (۱۹۶۶ء)



۱۹۵۴ء میں سری پرتاپ کالج سری نگر میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں ریاستی اکاڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجز میں اسسٹنٹ سکریٹری ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرار اور ۱۹۷۴ء میں ریڈر۔

مطبوعات: عروسِ تمنا، لاحرفِ نایافت (شعری مجموعے) وادی کے پھول، سراب، برف میں آگ (افسانوں کے مجموعے) بہاروں میں شعلے، پگھلتے خواب، بلندیوں کے خواب (ناول) جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات، غالب کے تخلیقی سرچشمے، نئی حسیت اور عصری اُردو شاعری (تنقید و تحقیق)

پتہ: ۳۹۶ جواہر نگر سری نگر

حسن نعیم

نام: شاہ سید حسن۔

پیدائش: ۶ر جنوری ۱۹۲۷ء پٹنہ

تعلیم: بی ایس سی (۱۹۴۸ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹۴۹ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ اور ۱۹۵۲ء میں کلکتہ کے اسکول



میں ٹیچر رہے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر سید محمود کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ سید محمود کے وزارت خارجہ میں وزیر بننے پر اُن کے پرسنل سکریٹری، امریکہ میں ہندوستانی سفارت خانے میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ یکم ستمبر ۱۹۷۰ کو ملازمت ترک کی یکم جولائی ۱۹۷۳ تک ایوان غالب نئی دہلی میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ آج کل فری لانسر ہیں۔

مطبوعات: اشعار ۱۹۷۱ (شعری مجموعہ) غزل نامہ (ہندی میں)

پتہ: شالیمار سی۔ ۲۹ تیسری منزل نوینگ نگر وی پی روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۶۵

حکیم منظور

نام: محمد منظور

پیدائش: ۱۷ جنوری ۱۹۳۷ء سری نگر

تعلیم: ایف۔ ایس۔ سی

شغل: سکریٹری جموں ڈویلپمنٹ اتھارٹی۔



مطبوعات: ناتمام دسمبر ۱۹۸۲۔ ہولس چنار دسمبر ۱۹۸۲ء (شعری مجموعے)

پتہ: ۱۶ برک کا ٹیج کوچہ سمندر خان جموں توی (جموں کشمیر)

حمیدہ سلطان مخفی

نام: حمیدہ سلطان تخلص مخفی

پیدائش: ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء دہلی

مطبوعات: بھابی کے نام خط ۱۹۲۹ بسنت رُت ۱۹۳۲۔ پھول والوں کی سیر ۱۹۳۴ء ثروت آرا بیگم ۱۹۴۲ (ناول دو حصے) رنگ محل (ناول) کاروانِ ادب (مضامین)



خاندان لوہارو کے شعراء۔

پتہ: علی منزل کوچہ پنڈت دہلی

خلیق احمد نظامی

پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء امروہہ ضلع مرادآباد (یوپی)

تعلیم: ایم اے ایل ایل بی۔ علی گڑھ اور آگرہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔

مطبوعات: تاریخ مشائخ چشت ۱۹۵۳ء (تاریخ) حیات شیخ عبدالحق ۵۳ (سوانح) سرسید ایک تعارف۔ انگریزی میں لائف اینڈ ٹائمز آف شیخ فریدگنج شکرؒ۔

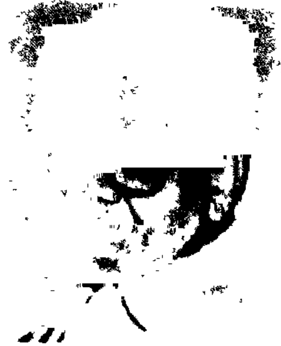
پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خلیق انجم

نام: خلیق احمد خان

پیدائش: ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء دہلی
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی۔ لائبریری سائنس میں ڈپلومہ ۱۹۵۹ء۔

کئی برس تک کروڑی مل کالج دہلی میں اردو کے لیکچرر رہے۔ تین سال تک سیکولر ڈیموکریسی کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اب ہفت روزہ ہماری زبان کے مدیر اور کل ہند انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ہیں۔



مطبوعات: معراج العاشقین ۱۹۶۰ مرزا سودا ۶۵ غالب اور شاہان تیموریہ ۴، ۶۷ غالب کی نادر تحریریں ۱۹۶۱ء متنی تنقید، ۶۷ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، ضبط شدہ نظمیں
پتہ: انجم لاج بنگالی مل دہلی ۶-۱۱۰۰

خمار بارہ بنکوی

نام: محمد حیدر خاں
پیدائش: ۱۹۱۹ بارہ بنکی
مطبوعات: حدیث دیگراں (ڈرامے)
پتہ: بارہ بنکی۔ (اتر پردیش)

خواجہ احمد عباس

نام: احمد عباس



پیدائش: ۱۴ر جون ۱۹۱۴ء۔ پانی پت۔
تعلیم: بی اے (۳۲) ایل ایل بی (۱۹۳۵ء
پیشہ: صحافت

بمبئی کرانیکل میں سب ایڈیٹر اب بلٹز بمبئی سے وابستہ ہیں۔ متعدد فلموں کی کہانیاں لکھیں اور دھرتی کے لال، آج اور کل، انہونی، پردیسی، اور ایک بوند پانی، فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ فلم شہر اور سپنا پر بہترین فلم کا ایوارڈ عطا ہوا۔

مطبوعات: شیشے کی دیواریں (ناول) ایک لڑکی (افسانے) محمد علی (۱۹۳۶ء زعفران کے پھول (۱۹۴۸ء) اندھیرا اجالا کہتے ہیں جس کو عشق (افسانوں کے مجموعے زبیدہ، یہ امرت ہے، چودہ گولیاں، ماں کی ڈائری، نیلی ساری ۱۹۸۲ (افسانے
پتہ: فلومینا لاج۔ چرچ روڈ جوہو بمبئی

خواجہ احمد فاروقی

پیدائش: ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۰ء بچھراؤں ضلع مراد آباد (یوپی)

تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی۔

(آگرہ اور دہلی یونیورسٹی)
دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو
رہے۔
مطبوعات: مرزا شوق ۱۹۵۰ء۔ کلاسیکی ادب ۱۹۵۳ء۔ میر تقی میر حیات اور شاعری ۱۹۵۴ء (ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا ۵۷) مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا ذوق و جستجو، تحریک آزادی اور اردو ادب، خدنگ غدر کربل کتھا ۶۶، یادِ یارِ مہرباں ۵۷، اردو میں دہلی ادب، تذکرہ سرور، دہلی میں اردو اخبار۔ مرزا شوق ۵۰، میر تقی میر ۵۴۔
پتہ: دہلی یونیورسٹی کیوری لین دہلی،

دور آفریدی

نام: نفیس علی خاں
پیدائش: ۱۱ر جولائی ۱۹۳۰ء رام پور (یوپی)
مطبوعات: شخصیتیں (اسکیچ) ویرانیاں (شعری مجموعہ) نذرِ وطن (قومی نظموں غزلوں کا انتخاب) آدبی اقدار (تحقیق و تنقید) نہرو نامہ۔
پتہ: گھیر عثمان خاں۔ رام پور (یوپی)

دیویندر اِسر

نام: دیویندر ناتھ۔
پیدائش: ۱۴ر اگست ۱۹۲۸ء۔ کیمبل پور حال اٹک (پاکستان)
تعلیم: ایم اے معاشیات۔ ایم پی ایس کمیونی کیشن (آرٹس)
پیشہ: صحافت۔



مطبوعات: گیت اور انگارے ۱۹۵۲ (افسانے) شیشوں کا مسیحا ۵۴ (افسانے) فکر اور ادب، ادب اور نفسیات، ادب اور جدید ذہن (تنقید) کینوس کا صحرا ۸۳ (افسانے) متعدد ہندی کتابیں۔

پتہ: ۳/۱۵۴ بی جنک پوری۔ نئی دہلی

دیویندر ستیارتھی

نام: دیواندر بتا
پیدائش: ۲۸ مئی ۱۹۰۸ء بھدوڑ ضلع سنگرور (پنجاب)



۱۹۲۸ء پروف ریڈر ویکلی خبرالیہ،
اجمیر۔ مئی ۱۹۴۶ء سے فروری ۱۹۴۸ء تک
نائب مدیر انڈین فارمنگ۔ ۱۹۴۸ء سے
۱۹۵۶ء تک مدیر آج کل ہندی۔ دہلی۔
۱۹۳۱ء میں لکھنا شروع کیا۔ پہلی اردو
کہانی "اور بانسری بجتی رہی"۔ ۱۹۴۰ میں
ادب لطیف لاہور میں شائع ہوئی۔
مطبوعات: نئے دیوتا، اور بانسری
بجتی رہی (افسانے) ہیں ہوں خانہ بدوش
اور گاتا جائے بنجارا (لوک گیتوں سے
متعلق کتابیں) اس کے علاوہ ہندی
اور پنجابی میں کئی کتابیں شائع ہو چکی
ہیں۔
پتہ: ۵/۴۶ سی نیو رہتک روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

راج نرائن راز

نام: راج نرائن۔ تخلص راز



پیدائش: ۲۷ راکتوبر ۱۹۳۰ء لورالائی،
بلوچستان (پاکستان)
تعلیم: ایم اے اردو (فرسٹ کلاس فرسٹ)

ایڈیٹر "آج کل" نئی دہلی
مطبوعات: (شعری مجموعے) چاندنی اساڑھ
کی (۱۹۶۷ء) لذت لفظوں کی (۱۹۷۷ء)
فٹ بال کی کہانی (نثر بچوں کے لیے ۱۹۷۷ء)
تراجم: عزم جواں (۱۹۵۷ء) لہروں
کی آواز ۱۹۷۴۔ ایٹم کی کہانی (۱۹۷۷ء)
تالیفات: ۱۹۶۷ کی منتخب شاعری (۶۸)
۱۹۶۸ء کی منتخب شاعری ۶۹ (کمار پاشی
کے اشتراک سے)
پتہ: ۲۹/۳۰ ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۸

رام آسرا راز

نام: رام آسرا چھبجی
پیدائش: یکم مارچ ۱۹۳۲ء چک نمبر ۱۱۵
تحصیل جڑاں والہ ضلع فیصل آباد (پاکستان)
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی (اردو)
اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ترقی اردو
بیورو وزارت تعلیم۔
مطبوعات: اردو اور ہندی کا
لسانیاتی رشتہ ۷۵۔ اردو شاعری میں
قومی یک جہتی کی روایت قصہ پنجاب
(ترجمہ)
پتہ: ۲۹۳/۱ صادق نگر، نئی دہلی

رام لعل

پیدائش: ۳ مارچ ۱۹۲۳ء
تعلیم: میٹرک ۱۹۳۸ء
۱۹۳۸ء میں ریلوے میں ملازم ہوئے
اور مارچ ۱۹۸۱ء میں ناردرن ریلوے ہیڈ

کوارٹر لکھنؤ سے کلیم انسپکٹر کے عہدے سے
سبکدوش ہوئے۔ پہلی کہانی "شکوک" مارچ
۱۹۴۱ء میں لاہور کے ہفتہ وار خیام میں
شائع ہوئی۔
مطبوعات: افسانوں کے مجموعے: آئینے ۴۵

انقلاب آنے تک ۴۹ وہ مسکرائے گی ۶۰ نئی
دھرتی پرانے گیت ۵۸ گلی گلی ۶۲ آواز تو
پہچانو ۶۳ چراغوں کا سفر ۶۶ انتظار
کے قیدی ۶۰، کل کی باتیں ۶۷ اکھڑے
ہوئے لوگ ۲، گزرتے لمحوں کی چاپ ۵،
معصوم آنکھوں کا بھرم ۷، ناول: کہرا
اور مسکراہٹ ۲، مٹھی بھر دھوپ ۲،
نیل دھارا ۸۱ سفرنامے: زرد پتوں کی
بہار (سفرنامہ پاکستان ۱۹۸۲) خواب خواب
(سفرنامہ یورپ) ۱۹۸۳۔ ہندی اور دیگر
کئی زبانوں میں بھی کتابیں چھپ چکی ہیں۔
پتہ: شانتی نکیتن ڈی ۲۲۹۰ اندرا نگر
فیض آباد روڈ۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

رام لعل نابھوی

پیدائش: ۱۶ ستمبر ۱۹۱۸ء نابھہ (پنجاب)
تعلیم: میٹرک
سرکاری ملازمت سے سبکدوش



مطبوعات: تبسم ۱۹۷۹ء (طنزیہ خاکے)
آم کے آم (انشائیے)
پتہ: محلہ دیوان۔ نابھہ (پنجاب)

رانا گنوری

نام: رانا پرتاپ سنگھ
پیدائش: ۳ جون ۱۹۲۸ء جہاں پور۔
تحصیل علی پور۔ ضلع مظفر گڑھ (پاکستان)
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی (ہندی)
مطبوعات: نرگس (مجموعۂ کلام)
پیشہ: لیکچرر۔



فانوس (مجموعۂ کلام) رعنائی خیال۔ میگھ
دوت (سنسکرت سے منظوم ترجمہ) تذکرہ
شعرائے ہریانہ، کرانتی دوت مہارشی

مہانند (منظوم سوانح حیات ہندی)
رشمیاں (ہندی کلام)
۵۔ پروفیسر کالونی۔ کیتھل۔ ہریانہ

راھی شہابی

نام: نفاست علی
پیدائش:۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء
تعلیم: بی اے
مطبوعات: میرا وطن (مجموعہ کلام)
پتہ: پریس اٹیچی چیف منسٹر راجستھان
جے پور

رشید حسن خاں

پیدائش: ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء شاہجہاں پور
درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم اور
لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کی سند
۴۷۔ ۱۹۴۱ میں ٹریڈ یونین سے وابستہ
رہے ۱۹۵۹ میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ
اُردو سے منسلک ہوتے۔



مطبوعات: اُردو املا۔ ادبی تحقیق مسائل
اور تجزیہ، اُردو کیسے سیکھیں۔ زبان اور
قواعد، انتخاب دیوان ناسخ (مقدمہ)
انتخاب دیوان سودا۔ موازنہ انیس ودبیر

دیوان درد۔
پتہ: گواتر ہال، دہلی یونیورسٹی کیمپس دہلی

رشی پٹیالوی

نام: بام دیو رشی
پیدائش: ۲۶ر جنوری ۱۹۱۷ء ایسی کلاں
ہوشیار پور
مطبوعات: جائزے (شاعری) ریگ رواں
افسانہ نگار (نثر) نغمۂ آتش (تذکرہ
شعراء) ہندی میں: جگیاسا (نثر)
تریم کشن (نظم)
پتہ: آنند نکیتن نئی دہلی

رفعت سروش

نام: شوکت علی
پیدائش: ۲ر جنوری ۱۹۲۶ء نگینہ
ضلع بجنور۔ (اتر پردیش)
۱۹۴۵ء میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے
وابستگی ۱۹۶۴ء میں اُردو مجلس دہلی کے
پروڈیوسر ۱۹۷۳ء میں ماسکو میں
ہندوسوویت ثقافتی تعلقات کے موضوع
پر سیمینار میں حصہ لیا۔ سوویت لینڈ ایوارڈ
اور کئی دیگر اکاڈمیوں سے انعامات فی الحال



غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر۔
مطبوعات: وادیٔ گل، عروج آدم، ذکر اس پری وش کا۔ نقش صدا (شعری مجموعے) جہاں آرا (اوپیرا) وادیٔ غزل نقوش رفتہ (یعنی بی بزم آرا نباں)
پتہ: ڈی ۲ اے، ڈی ڈی اے فلیٹس منیرکا دہلی ۶۷

زاہدہ زیدی

پیدائش: ۴ جنوری ۱۹۳۰ء میرٹھ
تعلیم: ایم اے انگریزی (علی گڑھ یونیورسٹی ۵۲ اور کیمبرج یونیورسٹی ۵۸ء)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی ریڈر رہیں۔
مطبوعات: زہر حیات ۷۰، (شعری مجموعہ) دھرتی کا لمس ۵، (شعری مجموعہ) بی یانڈ ورڈز ۹، بروکن مرر ۱۹۷۹ء
پتہ: ۲۲ ذاکر باغ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (اترپردیش)

زبیر رضوی

پیدائش: ۱۹۳۵ء امروہہ
تعلیم: ایم اے دہلی یونیورسٹی



آل انڈیا ریڈیو رام پور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر مامور ہیں۔
مطبوعات: لہر لہر ندیا گہری ۱۹۶۴ خشت دیوار ۱۹۷۰ (شعری مجموعے)
پتہ: ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی

ساجدہ زیدی

پیدائش: ۱۸ مئی ۱۹۲۷ء میرٹھ
تعلیم: بی اے ایم ایڈ (علی گڑھ



یونیورسٹی) ایم فل (لندن یونیورسٹی)
پروفیسر آف ایجوکیشن علی گڑھ یونیورسٹی۔
مطبوعات: جوئے نغمہ ۶۲ آتش سیال ۷۲، سیل وجود ۸۰ (شعری مجموعے)
پتہ: گلمرگ، دودھ پور۔ علی گڑھ

ساحر ہوشیارپوری

نام: رام پرکاش
پیدائش: ۵ مارچ ۱۹۱۳ء ہوشیارپور
تعلیم: ایم اے (فارسی ادبیات)



تقسیم ملک کے بعد کانپور سے
ماہنامہ 'چندن' جاری کیا۔
مطبوعات: شعری مجموعے۔ سحر غزل
سحر نغمہ، سحر حرف ۱۹۸۲ء
پتہ: سیکٹر ۲۸ مکان نمبر ۲۲۶۹ فرید آباد

ساغر اعظمی

نام: امتیاز احمد
پیدائش: ۱۴ر مارچ ۱۹۴۴ء شیخو پور
اعظم گڑھ (یوپی)
تعلیم: انٹرمیڈیٹ، ادیب کامل ایف
ایم بی ایس (لکھنؤ)
مطبوعات: کاغذ کا شہر
پتہ: فیض آباد روڈ۔ بارہ بنکی (یوپی)

سلام بن رزاق

پیدائش: ۱۵ر نومبر
۱۹۴۱ کڈپہ (آندھرا)



تعلیم: میٹرک ۶۰ء وٹھوبا ہائی اسکول نیولی
مطبوعات: ننگی دوپہر کا سپاہی
۱۹۰۵ء (افسانے)
پتہ: بی ۳۸/۴ نریش نگر، کرلا، بمبئی

سعادت نظیر

نام: نظیر پاشا
پیدائش: ۲۰ر مارچ ۱۹۱۶ حیدرآباد
تعلیم: ایم اے بی ایڈ
مطبوعات: آب و تاب، پھول کلیاں،
نو بہ گل، تصویریں، پھول مالا، آثار،
اور آب و رنگ (شعری مجموعہ) اردو میں
علم ہجا، لوازمہ سرمدی اور شعر و شاعری (نثر)
پتہ: بلاک ۱۔ فلیٹ ۵ چندولال بیلا کالونی
حیدرآباد (آندھرا پردیش)

شباب للت

نام: بھگوان داس



پیدائش: ۳ر اگست ۱۹۳۳ء خان پور
ضلع مظفر گڑھ (پاکستان)

تعلیم: ایم اے تاریخ (۱۹۵۶ء)
ایم اے اردو (۱۹۶۴)
پیشہ: فیلڈ پبلسٹی آفیسر
مطبوعات: مضراب، منزل منزل، پتوار، پروائی، زرد موسموں کے درد، صحرا کی پیاس، اُڑان، دائروں کا سفر۔ ل

پتہ: ۲۲/۲۳ ریلوے بورڈ بلڈنگ شملہ

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

پیدائش: ۲۴ ستمبر ۱۹۳۰ء موضع شورہ ضلع فرید پور۔ (بنگلہ دیش)
۱۹۶۵ء سے محکمۂ اطلاعات و ثقافتی امور سے وابستہ ہیں۔
مطبوعات: راہ کا کانٹا (افسانوں کا مجموعہ) شاعر کی شادی (طویل افسانہ) پختونستان کا مطالبہ، بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، اردو اور بنگالی، مختصر تاریخ بنگلہ ادب (دو حصے) آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو، بنگال میں اردو زبان و ادب، غالب اور بنگال، اقبال ٹیگور اور نذرل تین شاعر ایک مطالعہ۔ اور کئی کتابوں کے اردو اور بنگلہ میں تراجم
پتہ: آنند اپلی، ڈاکخانہ پورا تپیاری ضلع چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال)

شجاع خاور

نام: شجاع الدین
پیدائش: ۶ر ستمبر ۱۹۴۸ء نئی دہلی
تعلیم: ایم اے انگریزی (دہلی یونیورسٹی)
مطبوعات: اردو شاعری میں تاج محل ۶۶۸
دوسرا شجر ۸۰ء وادین ۸۲ء
پتہ: محلہ رودگراں۔ لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶
دہلی ۱۱۰۰۵۴

شرر فتح پوری

نام: رام سنگھ
پیدائش: ۶ ارمئی ۱۹۲۸ء فتح پور ضلع کوروکشیتر (ہریانہ)
تعلیم: بی اے (جامعہ ملیہ ۱۹۵۱) بی ایڈ (۱۹۵۳) علی گڑھ سے ایم ایڈ



(۱۹۵۵) اور ایم اے (۱۹۵۹)
۱۹۵۵ء میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۵۶ میں گوڑگاؤں میں ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر ۱۹۷۵ سے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ہریانہ کے مختلف اسکولوں میں تعینات رہے۔
مطبوعات: ہم جنگ نہ ہونے دیں گے (طویل نظم ۵۰) سازِ جمہور (مثنوی ۵۲) ہمالیہ جاگ اُٹھا (نظمیں ۶۳) کاروانِ سحر (مسدس ۶۷) پدمنی (مثنوی ۸۱) نئی دنیا نیا آدم (مثنویاں ۷۶) فرار (شعری مجموعہ ۸۳)
پتہ: فتح پور۔ ضلع کوروکشیتر (ہریانہ)

شرون کمار ورما

پیدائش : ۳۰ ر دسمبر ۱۹۳۰ء لکھنؤ
تعلیم : بی اے ایل ایل بی
پیشہ : وکالت
مطبوعات : نیم کے پتے ۔ (اردو افسانے)
گرتے ہوئے درخت (اردو افسانے)
دیوار (ناول، اردو، ہندی اور پنجابی)
پرندے (ناول ہندی)
پتہ : ۱۱/۱۸۰ کوچہ لبیاں ۔ امرت سر ۱۴۳۰۰۶

شکیل الرحمٰن

پیدائش : ۱۰ فروری ۱۹۳۱ موتی ہاری ضلع
چمپارن (بہار)
تعلیم : ایم اے پی ایچ ڈی
پیشہ : درس و تدریس
مطبوعات : ادب اور نفسیات ، ادبی
ڈائری ، ۵ شعور اور تنقیدی شعور ۵۸
زبان اور کلچر ۵۸ نغمہ میرے سفر کا ۔
پتہ : صدر شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر

شمس الرحمٰن فاروقی

پیدائش : ۳۰ ر ستمبر ۱۹۳۵ پرتاپ گڑھ (یوپی)
تعلیم : ایم اے انگریزی (الہ آباد
یونیورسٹی ۵۵)
پیشہ : سرکاری ملازمت
مطبوعات : نئے نام (جدید شاعری کا
انتخاب) گنج سوختہ ۶۹ سبز اندر سبز ۷۴
چار سمت کا دریا ۷۷ (شعری مجموعہ)
لفظ و معانی (تنقید ۶۸) فاروقی کے
تبصرے (تنقید ۶۸) شعر غیر شعر اور نثر
(تنقید) عروض آہنگ اور بیان ۷۸



پتہ : ۸۵/II ڈی کاکا نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

شمیم حنفی

پیدائش : ۱۷ ر مئی ۱۹۳۹
تعلیم : ایم اے (تاریخ اور اردو
ادبیات) پی ایچ ڈی (علی گڑھ یونیورسٹی)
مقالہ محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے ۔
پیشہ : معلمی
مطبوعات : نئی شعری روایت (تنقید)
جدیدیت کے فلسفیانہ اساس (تنقید)
مٹی کا بلاوا (ڈرامے) فراق، شخص و شاعر
بھوتوں کا جہاز (بچوں کے لیے)
پتہ : گل مہر ایونیو جامعہ نگر نئی دہلی

شوکت حیات

نام : شوکت حیات
پیدائش : یکم ر دسمبر ۱۹۵۰
تعلیم : بی ایس سی
شغل : افسانہ نگاری، صحافت،
ملازمت، ٹریڈ یونین سرگرمی ۔
مطبوعات : سیاہ چادریں (افسانے)



پتہ :- ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

شہباز حسین

پیدائش: ۱۰ر جنوری ۱۹۳۱ء حبوبت پٹنہ (بہار)
تعلیم: ایم اے (۵۱) بی ایل (۵۲)
۱۹۵۱ء میں روزنامہ "ساتھی" پٹنہ سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۳ میں روزنامہ



"سنگم" پٹنہ سے۔ ۱۹۵۵ میں بی ایس کالج دانا پور میں اردو لیکچرر۔ اگست ۱۹۵۸ء میں اسسٹنٹ ایڈیٹر، پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات، نئی دہلی، نومبر ۱۹۶۷ء میں ایڈیٹر آج کل نئی دہلی

اپریل ۱۹۷۲ سے نومبر ۱۹۷۵ اور فروری ۱۹۸۱ سے فروری ۱۹۸۴ تک پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر، ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم، مارچ ۱۹۸۴ سے جوائنٹ ڈائرکٹر ریسرچ اینڈ ریفرنس ڈویژن

مطبوعات: روشنی کے مینار، آج کل کی کہانیاں، جدید ہندوستان میں ذات پات (ترجمہ) "پہیلیاں" اور "رنگ برنگے پھول" (آخر الذکر دو کتابیں نند کشور وکرم کے اشتراک سے)

پتہ: ۲۷ سیکٹر ۱۲ آر کے پورم نئی دہلی

شہریار

نام: کنور محمد اخلاق خاں
پیدائش: ۱۶ جون ۱۹۳۶
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی
پیشہ: درس وتدریس
مطبوعات: اسم اعظم ساتواں در اور ہجر کے موسم (شعری مجموعے)



پتہ: سی ۱۲ میڈیکل کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

صادق

نام: سید صادق علی
پیدائش: ۱۰ اپریل ۱۹۴۳ اُجین (ایم پی)
تعلیم: بی اے (وکرم یونیورسٹی) ایم اے
اور مشواڑہ یونیورسٹی) پی ایچ ڈی
کچھ عرصہ ترقی اُردو بیورو سے وابستہ رہے۔
آج کل دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔
مطبوعات: ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ
نئی مراٹھی شاعری، سلسلہ (شعری مجموعہ)
پتہ: ۸/۱۰۴ راجوری گارڈن نئی دہلی

صالحہ عابد حسین

نام: مصداق فاطمہ
پیدائش: ۱۸ اگست ۱۹۱۳ پانی پت (ہریانہ)
تعلیم: ادیب فاضل
مطبوعات: عذرا، آتشِ خاموش، قطرے
سے گہر تک، راہِ عمل، یادوں کے چراغ،
اپنی اپنی صلیب، اُلجھی ڈور (ناول) نقشِ



اول، سازِ ہستی، نراس میں آس، گونگے
دہ مدد رماں۔ (افسانوی مجموعے) زندگی
کا کھیل، امتحان، محنت (ڈرامے) یادگارِ
حالی، ذکرِ جمیل، خواتینِ کربلا، انیس سے
تعارف، انتخاب مراثی انیس، بات چیت، الطاف
حسین حالی، سفرِ زندگی کے لیے سوزِ ساز
پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی

صباح الدین عبدالرحمٰن

پیدائش: ۱۹۱۲ دسنہ ضلع پٹنہ
تعلیم: ایم اے
پیشہ: ایڈیٹر معارف
مطبوعات: بزمِ تیموریہ ۱۹۴۸ (تاریخ)
بزمِ صوفیہ ۵۰۔ بزمِ مملوکیہ ۵۴۔ دیوانِ
فغاں ۴۹ (مرتبہ) بزمِ رفتگاں وغیرہ۔
پتہ: دارالمصنفین اعظم گڑھ

صغیر احمد صوفی

پیدائش: ۱۹۲۳ چندولی ضلع بنارس۔
ریلوے سے ریٹائر۔
پیشہ: ایڈووکیٹ دہلی ہائی کورٹ
مطبوعات: رقصِ دوام، گرمیٔ اندیشہ
(شعری مجموعے)
پتہ: سی بی/۴ سی مینر کا فیس III نئی دہلی ۶۷

صلاح الدین پرویز

پیدائش: ۱۹۵۰ء علی گڑھ

پیشہ: تجارت۔
مطبوعات: ژاژ، نیگوٹ، جنگل، دھوپ
سایہ سمندر (شاعری) نمرتا (ناول)
پتہ: پوسٹ بکس ۵۵۱۴۴ الریاض
(سعودی عرب)

ضیا فتح آبادی

نام: مہر لال[1]



پیدائش: ۹ر اپریل ۱۹۱۳

تعلیم: ۱۹۳۳ میں کرسچن کالج امرتسر سے بی اے (فارسی آنرز) اور ۱۹۳۵ء میں ایم اے (انگریزی) کی ڈگری۔

۱۹۳۶ میں ریزرو بنک نئی دہلی میں ملازم۔ ۱۹۵۳ میں بحیثیت بنکنگ آفیسر مدراس تبادلہ، ۱۹۵۶ میں دوبارہ دہلی میں تعینات۔ ۱۹۷۱ میں سبکدوش۔

مطبوعات: طلوع (۴۲) نور مشرق ۲، ضیاء کے سو شعر (اکتوبر ۴۸) نئی صبح (۵۲) گردِ راہ (دہلی ۶۳) حسن غزل ۶۶ دھوپ اور چاند (۶۷)، رنگ و نور۔ زاویہ ہائے نگاہ (۱۹۸۳ء)

پتہ: جے ۲۱/۵ راجوری گارڈن نئی دہلی

طالب چکوالی

نام: منوہر لال

پیدائش: ۱۳ر مئی ۱۹۰۰ چکوال۔ ضلع جہلم (پاکستان)

تعلیم: گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۱ء میں بی اے آنرز اور ۱۹۲۳ میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔



۱۹۲۴-۳۶ میں چکوال میں وکالت شروع کی۔ پھر راولپنڈی میں ہول سیل پتھری کوئلہ کا کام شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔

مطبوعات: انوار حقیقت ۴۹، برگ سبز ۶۵، برگ زرد ۸۰ (شعری مجموعے) فوجی کی محبوبہ ۱۹۳۸ء۔ مالک اور نوکر (ناول) مور پنکھ (انشائیہ)

پتہ: منوہر نواس جے ۲۲ لاجپت نگر ۳ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

ظ۔ انصاری

پیدائش: ۶ر فروری ۱۹۲۵ سہارنپور

پیشہ: درس و تدریس



مطبوعات: ورق ورق ۱۹۵۲ کمیونزم اور مذہب ۱۹۵۷ زبان و بیان ۱۹۵۸ خسرو کا ذہنی سفر، نذر غالب، غالب شناسی۔ کتاب شناسی، مثنویات غالب اور کئی دیگر کتب۔

پتہ ۳۲ ٹیمرس ۳۱ کولابا روڈ بمبئی

عابد مناوری

نام: گوری نندن بالی

پیدائش: ۲۷ مئی ۱۹۲۸ء جموں

پیشہ: سرکاری ملازمت

مطبوعات: بہار غزل، شمیم گل (شعری مجموعے)

پتہ: ۱۲۱/۱، گاندھی نگر۔ جموں ۱۸۰۰۰۴

عارف نقشبندی

نام: محمد عثمان

پیدائش: ۱۹۲۸ء بیکانیر (راجستھان)

تعلیم: ایم اے۔ ایل ایل بی

گورنر اتر پردیش



مطبوعات: عقیدت کے پھول، نذر وطن، قلم کی کاشت، نور سحر، ذکر محبوب وغیرہ۔

پتہ: راج بھون۔ لکھنؤ (اتر پردیش)

عبدالسلام قدوائی

پیدائش: ۷ مارچ ۱۹۰۷ تھولینڈی رائے بریلی (یوپی)

تعلیم: فاضل (دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ)

۱۹۷۵ سے ایڈیٹر ماہنامہ معارف

۱۹۳۴-۳۵ سب ایڈیٹر روزنامہ خلافت

۱۹۳۷-۴۱ ندوۃ لکھنؤ کے مدرس

۱۹۴۹-۵۲ ایڈیٹر پندرہ روزہ تعمیر

مطبوعات: ہماری بادشاہی ۳۷ عربی کے درس سبق ۴۳ مثالی حکمران ۴۶ دنیا اسلام سے پہلے، اسلام کے بعد ۳، قرآن کی پہلی دوسری تیسری کتاب ۱۹۷۵ تعلیمات قرآن ۱۹۶۴ء

پتہ: شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)

عبداللطیف اعظمی

پیدائش: یکم مارچ ۱۹۱۷ء باندی کلاں اعظم گڑھ (یوپی)

تعلیم: ایم اے (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) عالم۔ عربی (ندوۃ العلما لکھنؤ)

۱۹۶۰ء سے مدیر معاون ماہنامہ جامعہ



لتی دہلی۔ ۵۰-۱۹۴۵ ایڈیٹر ہفتہ وار نئی
روشنی ۵۵-۱۹۵۰ ایڈیٹر ہمدرد جامعہ
۷۵-۱۹۶۶ ایڈیٹر سہ ماہی صبح۔
مطبوعات: شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں
۴۵ (تنقید) بابائے اُردو مولوی عبدالحق
۱۹۶ ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت
۱۹۶۷۔ جواہر لال نہرو ایک مطالعہ
۱۹۶۸ء گاندھی جی اور ان کے
خیالات ۱۹۷۰ مشاہیر کے خطوط اور
اُن کے مختصر حالات ۷۵۔ مولانا محمد علی۔
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی

عرفان صدیقی

پیدائش: ۸ر جنوری ۱۹۳۹ء بدایوں
تعلیم: یونیورسٹی سطح تک خصوصی مطالعہ
سماجیات۔
پیشہ: سرکاری ملازمت۔ مرکزی اطلاعات
سروس سے وابستہ۔
مطبوعات: کینوس (شعری مجموعہ)
رُت سنگھار (کالی داس کی نظم رتو سنگھار
کا منظوم اُردو ترجمہ) مالویکا اگنی متر



(کالی داس کے ڈرامے کا اُردو روپ) اد

رابطہ عامہ ۱۹۷۶ء
پتہ: نیوز ایڈیٹر دور درشن نئی دہلی

عروج زیدی

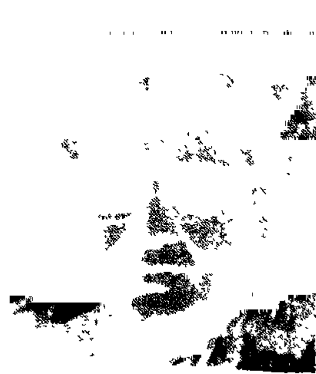
نام: سید فیاض علی
پیدائش: ۲۵ر ستمبر ۱۹۱۲ء میرٹھ



تعلیم: ادیب ماہر انٹرمیڈیٹ
پیشہ: اُتر پردیش سرکار کے مختلف محکموں میں
ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۶۹ میں سبکدوشی۔
مطبوعات: عروج کے سو شعر (۱۹۴۴)
جھلکیاں (۵۲) دل لخت لخت (۶۶)
(شعری مجموعے) شمع فروزاں (قطعات ۶۷)
محاورات ناسخ
پتہ: محلہ کٹ کوئیاں۔ رام پور ۲۴۴۹۰۱

عصمت چغتائی

پیدائش: ۱۹۱۵ء
تعلیم: بی اے بی ٹی علی گڑھ
پہلا افسانہ منادی ۱۹۳۹ء میں شائع
ہوا۔ ۱۹۴۲ میں شاہد لطیف سے شادی
کی۔ کچھ دن پونا قیام کرنے کے بعد بمبئی
میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔



مطبوعات: کلیاں، چوٹیں، ایک بات (افسانوں کے مجموعے) ضدی، بڑھی لکیر (ناول) تین اناڑی، ایک قطرہ خون۔
پتہ: انڈس کورٹ اے روڈ چرچ گیٹ بمبئی ۲۰۰۰۱

عقیل شاداب

نام: عقیل احمد خاں
پیدائش: ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء کوٹہ (راجستھان)
پیشہ: کاشت کاری
مطبوعات: سرابوں کے سفر (شعری مجموعہ)
پتہ: برت راج پورہ۔ کوٹہ۔ راجستھان

علقمہ شبلی

نام: ابوعلقمہ محمد شبلی نعمانی
پیدائش: یکم نومبر ۱۹۳۰ء میر غیاث چک ضلع نالندہ (بہار)
تعلیم: بی کام، ایم اے، بی ٹی
مشغلہ: درس و تدریس مدرسہ عالیہ کلکتہ
مطبوعات: حرف و صوت ۱۹۷۴ء بے چہرہ



لمحے ۱۹۷۵ء (شعری مجموعے) تارے زمین کے ۱۹۷۶ء پھول آنگن کے ۱۹۸۰ء (بچوں کی نظموں کا مجموعہ)
پتہ: ۸۹/۵ رپن اسٹریٹ، پہلی منزل کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

علی جوّاد زیدی

پیدائش: ۹ رجولائی ۱۹۲۰ء محمود آباد ضلع اعظم گڑھ (یوپی)
تعلیم: بی اے ایل ایل بی (لکھنؤ)
شروع میں صابر تخلص کرتے تھے بعد میں ترک کر دیا۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۲ء میں قید فرنگ کاٹی۔ ۱۹۴۶ء سے حکومت اُتر پردیش سے وابستہ رہے۔ حکومت جموں و کشمیر سے بھی منسلک رہے۔ بعد میں حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات و نشریات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ تہران میں حکومت کی جانب سے ریڈیو کے نامہ نگار بھی رہے۔ ۱۹۷۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے صدر رہے۔



مطبوعات: (شعری مجموعے) رگِ سنگ
دیارِ سحر، میری غزلیں، دو ادبی اسکول،
نسیم دشتِ آرزو، قصیدہ نگارانِ
اُتر پردیش۔ اردو میں قومی شاعری
کے سو سال، تعمیری ادب، آپ سے
ملئے، پیامِ آزادی، انوار ابو الکلام،
فکر و ریاض، انتخاب رند۔
پتہ: ۶/۳ دلباغ کالونی۔ لکھنؤ (یوپی)

علی سردار جعفری

نام: علی سردار جعفری
پیدائش: ۲۹ رنومبر ۱۹۱۳ء بلرام پور
ضلع گونڈہ (یوپی)
تعلیم: گریجویٹ (اینگلو عربک کالج
دہلی) ایم اے (لکھنؤ یونیورسٹی)
ترقی پسند تحریک سے وابستہ 'نیا
ادب' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔
'گفتگو' کے مدیر رہے۔ کئی فلموں کے گیت
اور مکالمے لکھے۔ 'دھرتی کے لال'، 'زلزلہ'
'فٹ پاتھ'، 'دھوبی ڈاکٹر'، وغیرہ کے



گیت لکھے۔ میلہ اور سازش کے مکالمے
نیز حبہ خاتون کی کہانی لکھی۔ ۱۹۶۵ء میں
"ایک خواب اور" پر سوویت لینڈ نہرو
ایوارڈ ۱۹۶۷ء میں پدم شری ۱۹۶۸ء میں
جواہر لال نہرو فیلو شپ۔
مطبوعات: نئی دنیا کو سلام، پرواز، پتھر
کی دیوار، ایک خواب اور، امن کا ستارہ،
اقبال شناسی، ایشیا جاگ اٹھا، پیراہنِ
شرر، لہو پکارے گا، ترقی پسند تحریک کی
نصف صدی ۸۷ء وغیرہ
پتہ: سیتا محل، بومن جی پیٹٹ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶

علیم صبا نویدی

نام: سید علیم الدین تخلص صبا نویدی
پیدائش: ۲۸ر فروری ۱۹۴۲ء امور
شمالی ارکاٹ
مطبوعات: روشنی کے بھنور (افسانوں
کا مجموعہ) طرح نو (شعری مجموعہ)
پتہ: ۵۔ امیر النسا بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ
روڈ۔ مدراس۔

عمیق حنفی

نام: محمد عبدالعزیز
پیدائش: ۳ رنومبر ۱۹۲۹ مہو چھاؤنی
تعلیم: ایم اے سیاسیات (۱۹۵۲ء) اور ایم اے تاریخ (۱۹۵۴ء)

۱۹۵۶ میں آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے وابستہ۔ ۱۹۶۹ میں دہلی میں بحیثیت پروگرام ایگزیکٹو مامور، ۱۹۷۰ء میں ترقی پاکر اسسٹنٹ ڈائریکٹر دہلی میں اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں
مطبوعات: سانسوں کا سیت ۵۵ (ہندی کلام) سنگ پیرہن ۵۸ (شعری مجموعہ) شجر صدا (انتخاب ۶۴ء) سند باد ۱۹۶۲ (طویل نظم) شب گشت (شعری مجموعہ) صلصلۃ الجرس (طویل نظم ۷۱)

عنوان چشتی

نام: افتخار الحسن



پیدائش: ۵ رفروری ۱۹۲۷ قصبہ منگلور ضلع سہارنپور۔ (یوپی)
تعلیم: ایم اے جغرافیہ (۶۱) ایم اے اردو (۶۳) پی ایچ ڈی (۷۳)
پیشہ: صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
مطبوعات: اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے۔ تنقید سے تحقیق تک۔ تنقیدی پیرائے۔ عکس و شخص، معنویت کی تلاش (تحقیق و تنقید) نیم باز ۶۸۔ ذوق جمال ۷۶ (شعری مجموعے) مکاتیب احسن (اردو حصے)
پتہ: اردو سماج، جامعہ نگر نئی دہلی

غلام ربانی تاباں

پیدائش: ۱۵ رفروری ۱۹۱۴۔ قائم گنج فرخ آباد (یوپی)
تعلیم: بی اے ایل ایل بی (آگرہ)
دس برس فرخ آباد میں وکالت کی ۱۹۴۷ء میں کسان تحریک کے سلسلے میں اور





۱۹۴۹ میں کیمونسٹ ہونے کے جرم میں پکڑے گئے۔ ۱۹۴۹ میں وکالت چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ اور مکتبہ جامعہ میں ملازم ہو گئے۔
۷۰ میں جنرل منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اسی سال انہیں پدم شری سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یوپی اردو اکاڈمی کا ایوارڈ ملا۔
مطبوعات: سازِ لرزاں۔ حدیثِ دل۔ ذوقِ سفر۔ نوائے آواز۔
پتہ: ۲۲۰ ذاکر نگر، جامعہ نگر نئی دہلی

فاروق ارگلی

نام: کنور محمد فاروق خاں
پیدائش: ۳ر جنوری ۱۹۳۸ موضع مستی ضلع فتح پور (اتر پردیش)
دہلی کے پندرہ روزہ تیز گام، ماہنامہ گلفام اور ماہنامہ قانونی دنیا کے مدیر رہے۔ اور اب ماہنامہ گلستان اور ہفت روزہ مومن انڈیا کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔
مطبوعات: تاریخ اسلام، تذکرہ اولیائے



ہند و پاک اور لاتعداد ناول۔
پتہ: ۲۴/۱۵ گنیش پارک، رشید مارکیٹ دہلی ۱۱۰۰۵۱

فضا ابن فیضی

نام: فیض الحسن
پیدائش: ۱۹۲۳۔ مئو ناتھ بھنجن اعظم گڑھ
پیشہ: تجارت



مطبوعات: سفینۂ زرگل۔ شعلۂ نیم سوز ۸۷ (شعری مجموعے)
پتہ: مئو ناتھ بھنجن۔ ضلع اعظم گڑھ یوپی

فکر تونسوی

پیدائش: ۷ر اکتوبر ۱۹۱۸ء۔ تونسہ ضلع ڈیرہ غازی خاں۔ پاکستان۔
تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر کے جالندھر آ گئے اور بعد ازاں ملاپ نئی دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ اب ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
مطبوعات: ہیولے ۴۷ (شاعری)، ڈپٹ راجہ ۱۰ (ناول) چھٹا دریا ۴۰ ساتواں شاستر ۵۲ پیانے کے چھلکے



٦١ فکر نامہ ٦٨ بات بیں گھات۔ آدھا آدمی، فکر ات۔
پتہ : ڈی ٥٠ گل مہر پارک نئی دہلی

فہمیدہ ریاض

پیدائش : ۱۸ جولائی ۱۹۴۵ء میرٹھ
تعلیم : بی اے (سندھ یونیورسٹی)
آواز، پاکستان کی مدیر رہیں۔



مطبوعات : بدن دریدہ ، دھوپ ، پتھر کی زبان۔
پتہ :- ۱/۴۸ بی ڈی اے فلیٹس نرائنہ وہار نئی دہلی

قاضی سلیم

پیدائش : ۲۷ نومبر ۱۹۲۶ء
تعلیم : بی اے ایل ایل بی (علی گڑھ)



مہاراشٹر اسمبلی کے نامزد رکن کے علاوہ لوک سبھا کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔
مطبوعات : نجات سے پہلے (شعری مجموعہ)
پتہ : سلیم منزل
منظور پورہ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

قتیل شفائیؒ

نام : اورنگ زیب خاں

پیدائش : دسمبر ۱۹۱۹ء ہری پور ضلع ہزارہ (پاکستان)



پیشہ: شاعری
مطبوعات: گفتگو، آموختہ، پیرہن
پتہ: ۱۹ غالب کالونی
سمن آباد۔ لاہور (پاکستان)

قرۃ العین حیدر

پیدائش: ۲۰ رجنوری ۱۹۲۶ علی گڑھ
تعلیم: دہرہ دون کانونٹ، ازابلا تھوبرن کالج لکھنؤ۔ گورنمنٹ اسکول آف آرٹ لکھنؤ اور ہیدرلیز اسکول آف آرٹ لندن میں تعلیم پائی۔
۱۹۵۰ میں وزارت اطلاعات ونشریات



کراچی میں ملازم ہوئیں۔ لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اتاشی رہیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کراچی میں انفارمیشن آفیسر، اور وزارت اطلاعات نشریات میں ڈاکومنٹری فلموں کی پروڈیوسر رائٹر کے علاوہ پاکستان کوارٹرلی کی ایکٹنگ ایڈیٹر بھی رہیں۔ اس کے بعد پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان چلی آئیں۔ امپرنٹ کی ایڈیٹر بھی رہیں۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا، سنٹرل بورڈ آف فلم سنسر سے بھی وابستہ رہیں۔ ۱۹۶۸-۷۷ کے دوران ساہتیہ اکاڈمی جنرل کونسل کی اردو ایڈوائزری بورڈ کی رکن رہیں۔ ۱۹۶۷ میں پت جھڑ کی آواز، افسانوی مجموعے پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ اور ۱۹۶۹ میں تراجم پر سوویت نہرو ایوارڈ ملا۔
مطبوعات: (افسانوں کے مجموعے) ستاروں سے آگے (۱۹۴۷) شیشے کے گھر (مکتبہ جدید لاہور ۵۲) پت جھڑ کی آواز (مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۷) ناول: میرے بھی صنم خانے ہیں (۱۹۴۹) سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، ناولٹ: سیتا ہرن، ہاؤسنگ سوسائٹی، چائے کے باغ، دلربا، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو، رپورتاژ: ستمبر کا چاند (نقوش لاہور) در چمن ہر ورقے، دفتر حال دگر ست، کوہ دماوند۔
پتہ: فلیٹ ۸ ٹاور اے ذاکر باغ
نئی دہلی

قمر رئیس

نام: مصاحب علی خاں
پیدائش: ۱۲ جولائی ۱۹۳۲ء شاہجہان پور
تعلیم: ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، (علیگ)
پیشہ: درس وتدریس
مطبوعات: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، مضامین پریم چند، اردو ڈرامہ، تلاش و توازن، ترجمہ کا فن اور روایت۔ تنقیدی تناظر۔



اقبال کا شعور و فن، پریم چند فکر و فن،
رتن ناتھ سرشار ۱۹۸۲
پتہ: سی ۱۶۶ وویک وہار دہلی ۳۲

کالی داس گپتا رضا

پیدائش: ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء مکندپور
ضلع جالندھر (پنجاب)
پیشہ: بنکنگ (ساہوکارہ)
جون ۱۹۴۹-۱۹۷۰ مشرقی افریقہ میں



قیام رہا۔ اب مستقل بمبئی میں قیام ہے۔
مطبوعات: شعلۂ خاموش، شاخ گل،
سوزش پنہاں، اجالے، شعور غم، شعاع
جاوید (شعری مجموعے) سہو و سراغ،
دعائے صباح، متعلقات غالب، انتخاب
آتش و غالب اور چکبست، باقیات چکبست،
کلیات چکبست، (تحقیق و تالیف)
ہندوستانی مشرقی افریقہ میں، منشورات
جوش، وغیرہ۔
پتہ: ۴۳ اے جے دریشن، چوتھی منزل
نیپین سی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۳۶

کاوش بدری

نام: عبدالرزاق پاشا تخلص کاوش
پیدائش: ۱۹۲۹ امور شمالی ارکاٹ
مشغلہ: ۱۹۴۸-۵۲ "فنکار" کی ادارت
کی۔ بعد ازاں منزل کے مدیر رہے۔
مطبوعات: کاویم (طویل نظم)
پتہ: ۲۰ طاہر صاحب اسٹریٹ مونٹ روڈ مدراس ۲

کرامت علی کرامت

پیدائش: ستمبر ۱۹۳۶ء کٹک (اڑیسہ)
تعلیم: ایم اے ریاضیات ۱۹۵۸
پیشہ: درس و تدریس
سندرگڑھ کالج میں شعبہ ریاضیات
کے صدر ہیں۔
مطبوعات: شعاعوں کی صلیب
پتہ: گورنمنٹ کالج، سندرگڑھ (اڑیسہ)

کرشن مراری

نام: کرشن مراری سہگل
پیدائش: ۲ جولائی ۱۹۲۰ جہلم (پاکستان)
تعلیم: ایم اے ریاضیات (دیال سنگھ
کالج۔ لاہور)
۱۹۴۶-۵۴ء آل انڈیا ریڈیو سے

وابستہ رہنے کے بعد انڈین ریونیو سروس کے رکن بن گئے۔ ۱۹۷۸ میں انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

مطبوعات: سازِ رگِ جاں ۱۹۷۸ء شعلہ احساس ۸۳ (شعری مجموعے)

پتہ: کوارٹر ۱۲-۱۰۱ سیکٹر ۵ آر کے پورم نئی دہلی

کرشن موہن

نام: کرشن لال تخلص موہن

پیدائش: ۲۸ر نومبر ۱۹۲۲ء سیالکوٹ (پاکستان)

تعلیم: بی اے آنرز (سیالکوٹ) ایم اے ادبیات (گورنمنٹ کالج لاہور)

تقسیم ملک کے بعد کرنال میں ویلفیئر آفیسر رہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اور دہلی سے وابستہ رہے۔ آواز کے سب ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ پریس انفارمیشن بیورو میں جرنلسٹ رہے۔ ۱۹۵۴ء میں انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اور دسمبر ۱۹۸۰ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

مطبوعات: (شعری مجموعے) شبنم شبنم دلِ نادان، تماشائی، غزل، نگاہِ ناز، آہنگِ وطن، کونپل کونپل، بیراگی بھنورہ، شیرازہ، مژگاں، ہرجائی، تیری خوشبو، گیان مارگ کی نظمیں، کوئے ملامت، من کے منکے، کفرستان، اداسی کے پانچ روپ، (ہندی میں) روپ رس، دھوپ میری کامنا کی، اور پیاس میری کلپنا کی، کمل کامنا کے۔

پتہ: ۱۵۸ پشپانجلی - دہلی ۱۱۰۰۹۲

کشمیری لال ذاکر

پیدائش: ۷ر اپریل ۱۹۱۹ء ضلع گجرات (پاکستان)

تعلیم: ایم اے انگریزی

پیشہ:

مطبوعات: جب کشمیر جلا۔ باتھا، میرا گاؤں میری زندگی، سیندور کی راکھ، کرماں والی، ذاکر کی تین کہانیاں، ہمسایہ، دھرتی سدا سہاگن، لمحوں میں بکھری زندگی، جاتی ہوئی رات، بیریوں والا فقیر، اداس شام کے آخری لمحے، تین چہرے ایک سوال۔

پتہ: ۴۱۶ بی، حکیم پورہ گوڑگاؤں۔ ہریانہ

کلام حیدری

نام: کلام الحق
پیدائش: ۲ر اپریل ۱۹۳۰ء رنگیر (بہار)
ہفتہ وار مورچہ اور ماہنامہ "آہنگ"
کے مدیر اعلیٰ اور کلچرل اکاڈمی کے چیئرمین۔
مطبوعات: بے نام گلیاں ۵۵ (افسانے)
تفہیمات۔
پتہ ایڈیٹر آہنگ، رینہ ہاؤس
جگ جیون رام روڈ۔ گیا (بہار)

کمار پاشی

نام: شنکر دت
پیدائش: ۴ر جولائی ۱۹۳۵ء بہاول پور
(پاکستان)



مطبوعات: پرانے موسموں کی آواز ۱۹۶۶
خواب کی شام ۱۹۸۰۔ انتظار کی رات ۱۹۷۱
روبرو ۱۹۷۶ اک موسم میرے دل
کے اندر ۱۹۷۱ (شاعری) ملاسں یاترا
۱۹۷۴ (طویل نظم) پہلے آسمان کا زوال
۱۹۷۲ (افسانے) جلوں کی بنیاد (ڈرامے)
اندھیرے کے قیدی (ڈرامے) محمد علوی
ایک مطالعہ، میراجی شخصیت اور فن۔
پتہ: ۲۳/۱۷۔ دہلی گیٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کمال احمد صدیقی

پیدائش: ۱۷ر فروری ۱۹۲۶ء
۱۹۴۸ء میں لکھنؤ سے ہمارا ادب،
رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۵۰ میں مکتبہ جامعہ
سے۔ اور ۱۹۵۲ میں ریڈیو سے وابستہ
ہوئے۔
مطبوعات: بادبان (۴۹) اور ہمالیہ
کے بنجارے۔
پتہ: ۲۰۷ راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

نام: مہندر سنگھ تخلص سحر
پیدائش: ۹ر مارچ ۱۹۰۹ء ساہی وال
منٹگمری (پاکستان)
تعلیم: بی اے



سرکاری ملازمت میں کئی اہم عہدوں
پر فائز رہے۔ دہلی اردو اکاڈمی کے
چیئرمین۔ ترقی اردو بیورو کے وائس چیئرمین
مطبوعات: طلوع سحر، یادوں
جشن (شعری مجموعے)
پتہ: ڈبلیو ۵۷ گریٹر کیلاش۔ نئی دہلی

کیف بھوپالی

نام: خواجہ محمد ادریس
پیدائش: ۱۹۱۲ء
مطبوعات: شعلۂ حرف، کوئے بتاں، حنا حنا، حکومت نامہ، مفہوم القرآن۔
پتہ: شاہجہان آباد۔ بھوپال

کوثر چاندپوری

نام: سید علی
پیدائش: ۱۴/اگست ۱۹۰۸
پیشہ: طبابت و افسانہ نگاری
مطبوعات: مہکتی بہاریں، دُنیا کی حور، جام جم ۴۱۔ سب کی بیوی ۵۲ (ناول) چوہوں کی بستی، راکھ اور کلیاں، دانش و بینش (تنقید) آوازوں کی صلیب، کارواں



ہمارے دیدۂ بینا۔ جہان غالب (تنقید) ناشر کانپوری۔
پتہ: ۳۱۷۔ اوکھلا۔ جامعہ نگر نئی دہلی

کیفی اعظمی

نام: اطہر حسین رضوی
پیدائش: ۱۴/جنوری ۱۹۱۴۔ اعظم گڑھ

۱۹۴۳ء میں قومی جنگ کے لیے لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ ۶۹-۱۹۶۸ میں انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کی از سر نو تنظیم۔ ۱۹۷۱ میں اس ادارے کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں قومی گیت لکھنے پر حکومت نے قومی ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۴ میں پدم شری کا اعزاز ملا۔
مطبوعات: جھنکار، آخری شب، آوارہ سجدے (ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ)
پتہ: جانکی کٹیر جوہو روڈ۔ بمبئی ۵۴

کے کے کھلر

نام: کلدیپ کرشن کھلر
پیدائش: ۲۸/اپریل ۱۹۳۱ء منڈی بہاؤالدین (گجرات)
تعلیم: ایم اے تاریخ۔ ایم اے انگریزی (پنجاب یونیورسٹی)
۵۴-۱۹۵۱ گورنمنٹ کالج گورداسپور اور گورنمنٹ کالج فرید کوٹ میں تاریخ کے لیکچرر۔ ان دنوں وزارت تعلیم میں ڈپٹی

سیکریٹری ہیں۔

مطبوعات: اُردو کا آخری نقاد ۸۲ء اُردو ناول کا نگارخانہ، امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر (تنقید و تحقیق) مہاراجہ رنجیت سنگھ ۸۰ء (انگریزی) شہید بھگت سنگھ ۸۲ء (ہندی) شہید بھگت سنگھ ۸۱ء (انگریزی)

پتہ: ۱۱۲ء ۶ بی۔ راجوری گارڈن نئی دہلی

گوپال متل

پیدائش: ۹ر جون ۱۹۰۹ء مالیر کوٹلہ (پنجاب)

تعلیم: بی اے (۱۹۳۲ء لاہور)

لدھیانہ سے ماہنامہ "صبح امید" کا



اجرا کیا جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ لاہور آنے کے بعد بالترتیب ادب لطیف اور شاہکار کی ادارت کی۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی آ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ تحریک جاری کیا۔

مطبوعات: دور اہا، صحرا میں اذان، (شعری مجموعے) ادب میں ترقی پسندی۔ لاہور کا جو ذکر کیا۔

پتہ: ایف ۲۷، نیو راجندر نگر۔ نئی دہلی

گوپی چند نارنگ

پیدائش: ۱۱ر فروری ۱۹۳۱ء ڈکی بلوچستان (پاکستان)

تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی ۱۹۵۸ء (دہلی یونیورسٹی)

۶۱ میں لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ۔ ۱۹۶۴ء میں انڈیانا یونیورسٹی سے سمعیات اور صوتیات میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کورس کی تکمیل کی۔

۱۹۵۷ء میں سینٹ اسٹیفن کالج نئی دہلی میں اردو لیکچرر۔ ۱۹۶۱-۱۹۷۴ء ریڈر اردو دہلی یونیورسٹی۔

۱۹۶۴ء میں وسکانسن یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ۱۹۶۹ء میں دوبارہ اسی یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر کی حیثیت سے مدعو۔ ۱۹۷۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شعبہ اُردو کے پروفیسر اور صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں جامعہ کے ڈین بنائے گئے۔

۱۹۶۴ء میں غالب انعام اور ۱۹۷۳ء میں اُردو اکادمی ایوارڈ۔ ۱۹۷۸ء میں اقبال پر صدر پاکستان کا طلائی تمغہ۔



۱۹۶۴ء میں غالب انعام اور ۱۹۷۲ء میں
اُردو اکاڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۷۸ء میں اقبال
پر صدر پاکستان کا طلائی تمغہ۔
مطبوعات: معراج العاشقین ۱۹۵۷ء
انیس شناسی، پرانوں کی کہانیاں ۱۹۷۴
اُردو مثنویاں ۱۹۶۲۔ املا نامہ ۷۴، ارمغان
مالک رام ۱۹۷۲ (مرتبہ) اقبال جامعہ کے
مصنفین کی نظر میں ۱۹۷۸۔ سفر آشنا ۱۹۸۲
اُردو افسانہ روایت اور مسائل ۸۱ اقبال
کا فن۔
پتہ: ڈی ۲۵۲ سروودے انکلیو نئی دہلی

گیان چند

پیدائش: ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۳ء سیوہارہ۔ بجنور
تعلیم: اُردو کی نثری داستانیں، تحقیقی
مقالے پر ۱۹۴۷ء پی ایچ ڈی کی ڈگری۔
۱۹۵۴ میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے
سوشیالوجی کی ڈگری۔
۱۹۵۰ میں انگریزی روزنامہ میں
اعزازی مدیر معاون اسی برس حمیدیہ
کالج بھوپال میں اُردو لیکچرر، ۱۹۶۵ میں
جموں یونیورسٹی میں پروفیسر، ۱۹۷۶ء میں
پروفیسر و صدر شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی
۱۹۷۹ء میں حیدرآباد یونیورسٹی میں اُردو
کے پروفیسر۔ جموں اور الہ آباد یونیورسٹیوں
کے بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین رہے۔
انجمن ترقی اُردو کے لائف ممبر۔ اُردو اکاڈمی
اُتر پردیش اور فخرالدین علی احمد کمیٹی کے
رکن۔ ۱۹۳۷ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۴
تک ساڑھے چار سو رباعیاں اور ساڑھے



تین ہزار اشعار کہے۔ ذکر و فکر پر ساہتیہ
اکاڈمی ایوارڈ ۱۹۸۲
مطبوعات: اردو کی نثری داستانیں ۵۴
تحریریں ۶۴ اردو مثنوی شمالی ہند میں ۶۱
لسانی مطالعے ۷۳، تفسیر غالب ۷۲۔ رموز
غالب ۷۶ اور تجزیے ۷۳، حقائق ۱۹۷۸ء
ذکر و فکر ۱۹۸۱ء
پتہ: شعبہ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی۔ حیدرآباد

مالک رام

نام: مالک رام بویجہ
پیدائش: ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ پھالیا۔ ضلع گجرات
(پاکستان)



علیم: ایم اے تاریخ (۱۹۳۰ء) ایل ایل
) (۱۹۳۲ء)
۳۵-۱۹۳۲ء آریہ گزٹ کے ایڈیٹر
۳-۱۹۳۲ء میں 'نیرنگ خیال' کی ادارت
ہی کی۔ ۱۹۳۵ء میں حکومت ہند کے محکمہ
امرس میں سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوتے۔
۱۹۴ میں وزارت خارجہ میں انڈر سکریٹری
ن برس تک مصر میں تعینات رہے۔
۵ میں ملازمت سے سبکدوش ہوتے
ر ساہتیہ اکاڈمی میں ایڈیٹر مقرر
ہے۔ ۱۹۶۷ میں سہ ماہی جریدے
ریہ کا اجرا اور تذکرہ معاصرین پر
ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔
مطبوعات: ذکر غالب، تلامذۂ غالب،
سانۂ غالب، عورت اور اسلامی تعلیم،
ہ صورتیں الٰہی، تذکرہ معاصرین (چار
جلدیں) وغیرہ۔
تہ: سی ۵۰۴ ڈیفنس کالونی، نئی دہلی

مجتبیٰ حسین

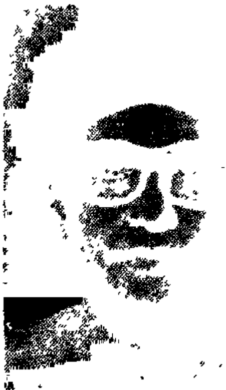
یدائش: ۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء گلبرگہ
علیم: بی اے ۵۶ (عثمانیہ یونیورسٹی)
۱۹۵۶ میں روزنامہ "سیاست"



حیدر آباد سے وابستہ ہوتے۔ آج کل
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ
ٹریننگ نئی دہلی میں اردو کے ایڈیٹر ہیں۔
مطبوعات: قطع کلام ۷۱، قصہ مختصر
۷۲، بہر حال ۷۴، آدمی نامہ ۸۱، بالآخر ۸۲،
جاپان چلو جاپان چلو ۸۳۔
پتہ: این سی آر ٹی، نئی دہلی

مجروح سلطان پوری

نام: اسرار احمد خاں
پیدائش: ۱۹۱۹ نظام آباد۔ اعظم گڑھ
تعلیم: ۱۹۳۰ میں درس نظامیہ کے لیے
ٹانڈہ ضلع فیض آباد گئے۔ مگر نہ کر پائے۔
الہ آباد یونیورسٹی سے مولوی عالم کا
امتحان پاس کیا ۱۹۳۸ میں لکھنؤ سے عربی
میں طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد
چند ماہ سلطان پور میں مطب کیا۔
۱۹۴۱ء میں جگر مراد آبادی کے



رابطہ میں آئے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک مشاعرے
میں بمبئی گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ
ہو گئے۔ ۱۹۴۷ میں انجمن ترقی پسند تحریک

کے رکن بن گئے۔ اور کچھ عرصہ جیل
میں بھی رہے۔
مطبوعات: اردو غزل ۵۴ (شعری مجموعہ)
پتہ: ۶ چغتائی کالونی، اجمیر روڈ۔ بمبئی

محسن زیدی

نام: سید محسن رضا زیدی
پیدائش: ۱۰ر جولائی ۱۹۲۵۔ بہرائچ
تعلیم: ایم اے معاشیات (لکھنؤ
یونیورسٹی ۵۶)
پیشہ: سرکاری ملازمت ممبر انڈین



اکنامک سروس۔
مطبوعات: شعری مجموعے ؛ شہر دل،
رشتۂ کلام۔
پتہ: ۲۶۴ سیکٹر ۴ آر کے پورم نئی دہلی

محمد حسن

پیدائش: ۱۹۲۰ء مرادآباد
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی (لکھنؤ
دہلی یونیورسٹی میں ریڈر رہے۔ آج
کل جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں صدر
شعبۂ اردو ہیں۔
مطبوعات: ادبی تنقید ۵۴۔ پیسہ اور
پرچھائیاں ۵۵ (ڈرامے) ہندی ادب
کی تاریخ ۵۵۔ جلال لکھنوی ۱۹۵۶ء
زلفیں زنجیریں ۵۶ (ناولٹ) فردوس
بریں۔ مطالعہ سودا، شناسا چہرے۔
جدید اردو ادب، کہرے کا چاند (ڈرامہ)
ادبی سماجیات، معاصر ادب کے پیش رو،
عرض ہنر، نفسیاتی زاویئے۔
پتہ: ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹

محمد حسنین

پیدائش: ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۰ء پٹنہ بہار
تعلیم: ایم اے اردو ۱۹۴۶ (پٹنہ
یونیورسٹی) پی ایچ ڈی اردو ۱۹۵۶ء
(بہار یونیورسٹی)
۱۹۴۷-۶۸ مظفر پور گیا اور
اورنگ آباد میں لیکچرر ۶۸ سے مگدھ
یونیورسٹی میں۔
مطبوعات: بہار کے نو چراغ ۱۹۵۲
نمود وہستی ۸۰ نشاط خاطر ۷۶ صنف

الشاتبہ ۵۸ مرزا محمد علی فدوی ۵۴ حیات کلیم ۷۶۔
پتہ: صدر، پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی۔ بودھ گیا (بہار)

محمود سعیدی

نام: سلطان محمد خاں
پیدائش: ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء ٹونک
تعلیم: میٹرک، ادیب، ادیب ماہر، منشی
شعلہ و شبنم، تحریک، گلفشاں، نگار اور فلمی ستارے نامی رسائل سے وابستہ رہے۔
اب ایوان اردو دہلی کے مدیر ہیں



مطبوعات: کفنی ۶۰ سیاہ بر سفید ۶۱ آواز کا جسم ۲، سب رنگ۔ واحد متکلم ۷۶، آتے جاتے لمحوں کی صدا ۷۶۔ بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا ۱۹۸۴ء
تراجم: تجدید جنوں (جلیس عابدی کے ساتھ) سوویت سفارت خانے میں (پریم گوپال متل کے ساتھ) ایک روسی سائنس داں کے تجربات (پریم گوپال متل کے ساتھ) سفر تمام ہوا (ناول) چڑیا گھر (بچوں کے لیے)

تالیفات: نقد جدید و قدیم (ایک ادبی مباحثہ) ساحر لدھیانوی، ایک مطالعہ۔ شیرازہ (ہم عصر شاعری کا انتخاب پریم گوپال متل کے ساتھ)
پتہ: ۲۲-۷ پھاٹک تملیان ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مسرور جہاں

پیدائش: جولائی ۱۹۳۸ء تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی۔
تعلیم: ہائی اسکول
مطبوعات: (افسانوی مجموعے) دھوپ دھوپ، دھوپ سایہ، چراغ پھولوں کے، بوڑھا یوکلپٹس۔ (ناول) تاباں، پیکر، شہوار، گردشیں، فرح، پیار کی خوشبو، ہمیشں، تزئین، رومہ، سفینہ، طاہرہ، ارم، گردشیں، پتھر کا دیوتا، ایک مٹھی بوجھ، کنول، دھوپ چھاؤں، اجالے، راہوں میں، آواز نہ دو، اچانک، شام و سحر، روبینہ، خزاؤں سے دور، رشتہ پیار کا، درد کا ساحل، نئی صبح، رنگ ہزار، راشدہ، آشیانہ، غم دل، شگاف،
پتہ: کراؤن گیٹ، جگت نرائن روڈ، لکھنؤ

مسعود حسن خاں

پیدائش: ۲۸ر جنوری ۱۹۱۹ء قائم گنج
تعلیم: ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ دہلی، علی گڑھ، اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔
پیشہ: درس و تدریس ۴۸ - ۱۹۴۳ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کے ریڈر۔

۶۲-۵۳ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی۔
۷۳-۶۸ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی ۷۳، سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر لسانیات۔ وزیٹنگ پروفیسر کشمیر یونیورسٹی۔
مطبوعات: تاریخ زبان ادب اردو ۴۹ اردو زبان و ادب۔ دو نیم ۵۲ شعر و زبان ۶۷ انگریزی: فونٹیک فزالوجیکل اسٹڈی آف دی اردو ورڈز۔
پتہ: مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ (یوپی)

مصوّر سبزواری

نام: ظفر حسین



پیدائش: ۱۰ر جولائی ۱۹۳۴ء سنبھل، مرادآباد
تعلیم: ایم اے بی ایڈ
پیشہ: درس و تدریس
مطبوعات: (شعری مجموعے) مانجھی دھیرے چل ۱۹۷۱ خزینہ سخن ۶۳ برگ آتش سوار اور تین ناول۔
پتہ: نوح ضلع گوڑگانوں (ہریانہ)

مطیر ھوشیارپوری

نام: بلجیت سنگھ
پیدائش: ۲ر فروری ۱۹۳۲ء دسوہہ ضلع ہوشیارپور (پنجاب)
تعلیم: ایم اے اردو
مطبوعات: حسن و نور ۶۹ (قطعات) زندگی سے موت تک،، (شعری مجموعہ) بوند بوند آگ ۸۰ (شعری مجموعہ) فن طباعت' اخبار نویسی کے اصول' آغاجان عیش۔ اردو کا پہلا باغی شاعر کبیر اور ہریانہ کے مشاہیر
پتہ: ترقی اردو بیورو آر کے پورم۔ نئی دہلی

مظفر حنفی

نام: محمد ابوالمظفر
پیدائش: یکم اپریل ۱۹۳۰ء کھنڈوہ (ایم پی)
تعلیم: ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی
پیشہ: استاد شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
مطبوعات: پانی کی زبانی، تیکھی غزلیں، صریر خامہ، عکس ریزے، دیپک راگ، یم بہ یم، طلسم حرف، کھل جا سم سم،

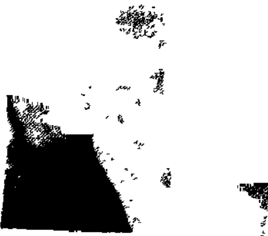


پردہ سخن کا (شعری مجموعے)
دیدۂ حیراں، اینٹ کا جواب، دو غنڈے
(افسانوی مجموعے)
ایک تھا شاعر، شوخیٔ تحریر، شاد عارفی
کی غزلیں، کلیات شاد عارفی، کتاب نما
دہلی کا جائزہ، اور نئے
چراغ کے ۱۸ شمارے (رسالیات)
شاد عارفی: شخصیت اور فن، نقد ریزے
جہات و جستجو، تنقید العبار، جدیدیت
تفہیم و تجزیہ، وضاحتی کتابیات - چار
جلدیں - (تنقید و تحقیق)
طوفان، بیداری، گجراتی کے یک بابی
ڈرامے، اوڑیا افسانے، بھارتیندو ہریش
چندر، گلاگر مجمع الجزائر، تین دفتر اور
پانچ دوسرے ناول (تراجم)
بندروں کا مشاعرہ، نیلا ہیرا (ادب اطفال)
پتہ: ۲۵۸ ٹیلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مظہر امام

پیدائش: ۵ رمارچ ۱۹۳۰ء دربھنگہ (بہار)





تعلیم: ایم اے اردو (علیگڑھ یونیورسٹی)،
ایم اے فارسی (بہار یونیورسٹی)
پیشہ: ڈائریکٹر دوردرشن - سری نگر
مطبوعات: زخم تمنا ۱۹۶۲ (شاعری)
رشتہ گونگے سفر کا ۱۹۷۴ (شاعری)
آتی جاتی لہریں ۱۹۷۹ (تنقید)
پتہ: ڈائریکٹر
دوردرشن سری نگر

(ملک زادہ) منظور احمد

پیدائش: ۱۷ راکتوبر ۱۹۲۹ - فیض آباد
تعلیم: ایم اے انگریزی - ایم اے تاریخ -
ایم اے پی ایچ ڈی اردو -
پیشہ: درس و تدریس -



مطبوعات: اردو کا مسئلہ، کالج گرل،
شہر سخن، مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن -
پتہ: ریڈر شعبہ اردو - لکھنؤ یونیورسٹی -

ممتاز مرزا

پیدائش: ۲۰ رجنوری ۱۹۲۸ء
تعلیم: بی اے
پیشہ: ریاست کی سب ایڈیٹر رہیں، نیز
ایرانی سفارت خانے سے وابستہ رہیں -

مطبوعات: یادوں کے سائے ۱۹۷۵ء
پتہ: بی ۳ نظام الدین ویسٹ - نئی دہلی

منشا الرحمٰن منشا

نام: منشا الرحمٰن خاں
پیدائش: یکم مئی ۱۹۲۴ء بمبیاں گاؤں
راجہ ملڈانہ (مہاراشٹر)
تعلیم: ایم اے (اردو و فارسی) پی ٹی
پی ایچ ڈی۔
ناگپور میں اردو کے استاد ہیں۔
مطبوعات: آہنگ حیات ۱۹۶۳ء
نوائے دل ۱۹۶۴ - ذکر خوباں ۱۹۶۷
آئینہ اقبال ۱۹۷۴ عکس دوراں ۱۹۷۵ء
(شعری مجموعے)
پتہ: ۱۱ سٹار کی ٹاؤن - ناگپور ۴۴۰۰۱

منموہن تلخ

نام: منموہن تخلص تلخ
پیدائش: ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء - ناگپور
تعلیم: بی اے ۱۹۴۸ (کیمپ کالج دہلی)
پیشہ: صحافت



۱۹۴۸ء میں ہفتہ وار 'اپنا دیش' کا
اجرا کیا۔ ۱۹۵۰ میں روزنامہ 'تیج'
۵۶ - ۵۷ میں روزنامہ 'پرتاپ'
نئی دہلی سے وابستہ رہے۔ پھر ملازمت
چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۷۷ میں لندن کے
آج انٹرنیشنل کی ادارت کی۔ آج کل
ہندی روزنامہ 'جن ستّہ' سے وابستہ ہیں۔
مطبوعات: چراغ فکر ۱۹۵۸ جذبہ و آواز
۱۹۶۹ اور خرابہ ۱۹۷۰ (شعری مجموعے)
پتہ: بی ۸۷ گل مہر پارک نئی دہلی ۴۹

مہدی پرتاپگڈھی

نام: مہدی حسن
پیدائش: ۱۵ر جولائی ۱۹۳۴ء
ضلع پرتاپ گڈھ
تعلیم: ہائی اسکول
پیشہ: محکمۂ آبپاشی میں ہیڈ کلرک۔
مطبوعات: لفظ و بیاں (مجموعۂ غزل ۷۳)
نئے نئے آسمان (مجموعۂ غزل ۸۳)
پتہ: ۲۶ اسکول واٹر کریا شنکر درمیانہ
پرتاپ گڈھ (یوپی)

میکش اکبر آبادی

نام: سید محمد علی شاہ تخلص میکش
پیدائش: مارچ ۱۹۰۲ آگرہ
مطبوعات: نغمہ اور اسلام ۲۴ - میکدہ
۱۹۳۰ - حرف تمنا ۱۹۵۵ - داستانِ شب
(شعری مجموعے) نقد اقبال ۶۴ مسائل
تصوف - حضرت غوث الاعظم ۱۹۶۶
توحید اور شرک ۱۹۶۴ء
پتہ: کڑہ میوہ - آگرہ - (اتر پردیش)

نثار احمد فاروقی

پیدائش: ۲۹ر جون ۱۹۳۴
تعلیم: ایم اے (عربی ادبیات دہلی یونیورسٹی) پی ایچ ڈی ،،



مطبوعات: دید و دریافت ۱۹۶۴ء
میر کی آپ بیتی ۵۷، تلاش میر ۷۴، تلاش غالب ۶۹ ——— تاریخ طبری کے ماخذ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔
پتہ: ۸۲۷ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

ندا فاضلی

پیدائش: ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ دہلی
تعلیم: ایم اے (انگریزی)



بچپن گوالیار میں گزرا۔ ۱۹۶۵ء میں خاندان کے افراد پاکستان ہجرت کر گئے اور وہ گوالیار سے بمبئی چلے گئے۔
مطبوعات: لفظوں کا پل (شعری مجموعہ) مور ناچ (شعری مجموعہ) اور ملاقاتیں۔
پتہ: ڈانڈ پارا۔ کھار ویسٹ بمبئی ۵۲

نذیر احمد

پیدائش: ۳ر جنوری ۱۹۱۵ء گونڈہ
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی۔ لکھنؤ اور تہران یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔
ایڈیٹر غالب نامہ
مطبوعات: ظہوری ۱۹۵۳ء (سوانح) تحقیقی مطالعہ ۵۴۔ کتاب نورس ۱۹۵۶ (موسیقی)
پتہ: ایوان غالب۔ ماتا سندری روڈ نئی دہلی

(ڈاکٹر) نریش

پیدائش: مالیر کوٹلہ
تعلیم: ایم اے (ہندی) ایم اے (اردو) پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی)



پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی سے
وابستہ، دس برس تک ماہنامہ نوجوت
سے وابستہ رہے۔ مالیر کوٹلہ سے "شاہین"
جریدہ جاری کیا۔
مطبوعات: تشنۂ لب، خوشبو کا سفر،
غم فردا ۱۹۸۱ (شعری مجموعہ) باز گشت
۱۹۷۵۔ ادب کی پرکھ (تنقید) بند دروازہ
ننھے ہاتھوں کا لمس، (افسانے) امتی
۱۹۶۷ (ناول ہندی) تذکرہ شعراء
چنڈی گڑھ۔ پتھروں کا شہر (۱۹۸۶ء)
پتہ: شعبہ ہندی پنجاب یونیورسٹی ایوننگ
کالج (چنڈی گڑھ)

نشتر خانقاہی

نام: سید انوار حسین
پیدائش: فروری ۱۹۳۱۔ جہان آباد
ضلع بجنور (اترپردیش)
اوائل عمری میں بمبئی چلے گئے۔ اور
صحافت کا پیشہ اپنایا۔ پھر دہلی آگئے اور
کئی رسائل سے وابستہ رہے۔
مطبوعات: دستریں (شعری مجموعہ)



میرے لہو کی آگ۔
پتہ: بھاٹن۔ بجنور ۲۴۶۷۰۱ (یوپی)

نند کشور وکرم

پیدائش: ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء۔ راولپنڈی
اسلام آباد (پاکستان)
تعلیم: ایم اے فارسی (پنجاب یونیورسٹی)
۵۸۔ ایم اے اردو (دہلی یونیورسٹی) ۶۶ء
۵۴-۱۹۵۳ء میں "نئی کہانی" کانپور
کی ادارت، ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت



اختیار کی ۷۹-۱۹۶۴ء نائب مدیر
"آج کل" نئی دہلی۔
۱۹۶۱ء میں ناول "یادوں کے کھنڈر"
ہندی میں اور ۱۹۸۱ میں اردو میں شائع
ہوا۔ "غالب حیات و شاعری" ۱۹۵۹ء۔
"کواپریٹو ڈیری" اور "سفینۂ انقلاب"
پر حکومت ہند سے ایک ایک ہزار روپے
کے انعامات ملے۔

یادوں کے کھنڈر پر اتر پردیش
اردو اکاڈمی اور مغربی بنگال اردو
اکاڈمی سے انعامات ملے۔ ۱۹۸۲ء میں
محمد حسین آزاد (تحقیق)۔ بچوں کے لیے
پہیلیاں اور رنگ برنگے پھول (شہباز
حسین کے اشتراک سے مرتب کیں۔)
اور ۱۹۸۳ء میں "منتخب افسانے" اور
"اردو ۱۹۸۳ء" کی اشاعت ہوئی۔
پتہ: اے۔ ۲ کرشن نگر۔ دہلی ۱۱۰۰۵۱

نور الحسن ہاشمی

پیدائش: یکم جولائی ۱۹۱۴ء سندیلہ
ضلع ہردوئی (یوپی)
تعلیم: ایم اے فارسی و انگریزی (لکھنو
یونیورسٹی) پی ایچ ڈی (علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی)
۴۳-۳۹ ماہنامہ جامعہ کے مدیر
۶۸-۱۹۵۴ فروغ اردو کے ایڈیٹر، ۷۵-۱۹۶۴
لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر



مطبوعات: کلیات ولی ۴۵ء کلیات
حسرت ۶۶ء نو طرز مرصع ۵۸۔ ایک نادر
رزمنامہ ۵۴ء ادب کا مقصد ۵۶ء دہلی
کا دبستان شاعری ۴۹ء ناول کیا ہے،
بکٹ کہانی۔
پتہ: اسمٰعیل بلڈنگ یونیورسٹی روڈ
لکھنو (اتر پردیش)

واجدہ تبسم

پیدائش: حیدرآباد
تعلیم: ایم اے
مطبوعات: شہر ممنوع، آیا بسنت سکھی، نتھ اتر آئی، نتھ کا زخم، نتھ کا بوجھ، نتھ کا غرور، اترن، کیسے سمجھاؤں، روزی کا سوال، پھول کھلنے دو، زخم دل اور مہک مہک، جیسے دریا، مولسری کی چھاؤں، چشم خوں فشاں (ناول) ساتواں پھیرا



پتہ: ریلوے بلاک ۱۳۱
فلیٹ نمبر ۱ سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

وامق جونپوری

نام: احمد مجتبیٰ تخلص وامق



پیدائش: ۲۳ر فروری ۱۹۱۰ کجگاؤں
ضلع جونپور (یوپی)
تعلیم: بی اے ایل ایل بی
مطبوعات: بیچینی ۱۹۴۸ء جرس
۱۹۵۰ء شب چراغ ۱۹۷۸ء
پتہ: لال کوٹھی ڈاکخانہ
کجگاؤں ضلع جونپور (یوپی)

وحید اختر

پیدائش: ۱۲ر اگست ۱۹۳۵ء
تعلیم: ایم اے فلسفہ، پی ایچ ڈی ۱۹۶۰
(جامعہ عثمانیہ)
۱۹۵۲-۵۸ء سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرر ہوئے۔ ان دنوں شعبہ فلاسفی میں ریڈر ہیں۔
مطبوعات: خواجہ میر درد (تحقیق) زنجیر شب (مجموعہ کلام)
پتہ: شعبۂ فلاسفی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وزیر آغا

پیدائش: ۱۹۲۲
تعلیم: پی ایچ ڈی (اردو میں طنز و مزاح پر تحقیقی مقالہ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور)
ایڈیٹر "اوراق" لاہور
مطبوعات: آدھی صدی کے بعد، مسرت کی تلاش، اردو ادب میں طنز و مزاح، اردو شاعری کا مزاج، عبدالرحمان چغتائی؛ شخصیت اور فن، تخلیقی عمل، دوسرا کنارہ (انشائیے) چوری سے یاری تک، تنقید اور ادب، مجلسی تنقید، تنقید اور احتساب، نئے مقالات، اقبال کے





تصوراتِ عشق، نئے تناظر، نظم جدید کی
کروٹیں، شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ،
شام کی منڈیر سے
پتہ: ۵۸ سول لائن سرگودھا پاکستان

ہرچرن چاولہ

پیدائش: ۳ر نومبر ۱۹۲۵ء داؤد خیل
میاں والی (پاکستان)
تعلیم: گریجویٹ (پنجاب یونیورسٹی)
تقسیم ملک کے بعد ہندوستان چلے
آئے۔ اور محکمہ ریلوے میں سروس کے
بعد فروری ۷۵ء میں اوسلو ناروے چلے
گئے اور وہاں ڈنک بالسکے لائبریری میں
بحیثیت صلاح کار ملازمت کرلی۔
مطبوعات: درندے ۷۶ء چراغ کے زخم
(ناول) عکس آئینے کے ۷۵، ریت سمندر
اور جھاگ (افسانوں کے مجموعے) ننھی
جل پری (ڈنمارک کے مشہور ادیب ایچ
سی اینڈرسن کی طویل کہانی کا بچوں کے
لیے ترجمہ ۸۰) دی بروکن ہورائزن
پتہ: ۵۰.اے منڈل فیرٹ اوسلو، ناروے

ہمت رائے شرما



پیدائش: ۲۳ر فروری ۱۹۱۹ء نارووال
ضلع سیالکوٹ (پاکستان)
پیشہ: آرٹ ڈائریکٹر، گیت کار، مصنف۔
مطبوعات: ہندو مسلمان (افسانوں
کا مجموعہ) نکات زبان دانی (تنقید)
شہاب ثاقب (شعری مجموعہ)
پتہ: فلیٹ نمبر ۲ ستی زن کوآپریٹو ہاؤسنگ
سوسائٹی بلڈنگ ۲۶ کیڈل روڈ بمبئی ۶۱

ہنسراج رہبر

نام: ہنسراج تخلص رہبر
پیدائش: ۹ر مارچ ۱۹۱۳ء باؤسنگوال
پٹیالہ (پنجاب)
تعلیم: ایم اے تاریخ ۴۲ء (پنجاب یونیورسٹی)



مطبوعات: نیا افق ۴۷ (افسانے) ہم لوگ
(افسانے) اب اور تب (افسانے)
پریم چند ۵۱ - ترقی پسند ادب ایک جائزہ
غالب حقیقت کے آئینے میں (تحقیق) پریڈ
گراؤنڈ ۵۳ (ناول) گنگا ۵۳ (ناول) برسکا
تتلی ۸۱ (ناول) ترقی پسند ادب،

پتہ: ایس ۱۶ نوین شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲

ہند کے

ناشر و کتب فروش

اپنا کتاب گھر، بڑا عیدگاہ، پورنیہ (بہار)

اتحاد بک ڈپو بساطی بازار جھانسی۔ ۲۸۴۰۰۱

آتھر گلڈ پبلی کیشنز ۲۷۵۸ ۸/۸۱ لارنس روڈ نئی دہلی۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی، قیصر باغ لکھنؤ (یوپی)

اترا پبلی کیشنز، کریم گنج گیا (بہار)

احباب پبلشرز مقبرہ عالیہ، گولہ گنج لکھنؤ (اتر پردیش)

احباب بک ڈپو مومن پورہ ناگپور (مہاراشٹر)

احمد بک ڈپو بخشی بازار کٹک (اڑیسہ)

ادارۂ ادب ۳۹۶ جواہر نگر سری نگر (جموں و کشمیر)

ادارہ ادبیات اردو، ایوان اردو، خیرات آباد حیدرآباد (آندھرا)

ادارہ ادبیات دہلی ۲۰۰۹ گلی قاسم جان دہلی ۱۱۰۰۰۶

ادارہ اسلامیات دیوبند (اتر پردیش)

ادارہ انشائے ماجدی رابندر سرائے کلکتہ ۷۰۰۰۷۲

ادارہ النوریہ دیوبند یوپی

ادارہ ایالی علی نگر لدھیانہ

ادارہ خرام پبلی کیشنز حوض قاضی دہلی۔
ادارہ درس القرآن دیوبند (اُتر پردیش)
ادارہ دعوت القرآن دیوبند (اُتر پردیش)
ادارہ علم و حکمت دیوبند (اُتر پردیش)
ادارہ فروغِ اُردو امین الدولہ پارک لکھنؤ
ادارہ فروغِ اُردو مہسول چوک سیتامڑھی (اُتر پردیش)
ادارہ مطبوعات اسلامیہ ۱۵۸۶ سوئی والان دہلی
ادبی اکادمی آفتاب منزل شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
ادبی ٹرسٹ بک ڈپو کنارہ بنک عابد روڈ حیدرآباد
ادبی دنیا ڈگی بازار علی گڑھ (اتر پردیش)
ادبی دنیا، اُردو بازار جامع مسجد دہلی
ادبی سنگم ۱۵۲-ایل ۵ فریدآباد ٹاؤن شپ (ہریانہ)
ادبی سنگم، جامعہ نگر نئی دہلی
اُردو اکاڈمی، بلہرہ ہاؤس، قیصر گنج لکھنؤ
اُردو پبلی کیشنز ۱۴۸ ۴ اُردو بازار دہلی - ۶
اُردو پبلشرز نظیرآباد لکھنؤ / قلعہ روڈ جون پور
اُردو پریشد ۳۲۶۸ سیکٹر ۱۵ ڈی چنڈی گڑھ
اُردو رائٹرز گلڈ الہ آباد
اُردو رائٹرز گلڈ ۱/۱۸ فیرس لین اسرار منزل کلکتہ
اُردو ریسرچ اکاڈمی گھیر عثمان رامپور
اُردو کورس بکس دائرہ شاہ اجمل الہ آباد
اُردو سرکل دین محمد ہاؤس جمشید پور - ۶
اُردو سماج جامعہ نگر نئی دہلی - ۲۵
اُردو مجلس ۷۷ بازار چتلی قبر دہلی
اُردو محل ۹۱ باغ منو نیا گاؤں لکھنؤ

ارشد پبلی کیشنز ۱۴ سید صالح روڈ کلکتہ

آزاد بک اسٹور، سورت گنج نزد مسجد مدھوبنی (بہار)

آزاد بک ڈپو، ہال بازار، امرتسر

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی

آزاد کتاب گھر ساکچی بازار جمشید پور (بہار)

اسٹوڈینٹس بک اسٹال، ۲۲ اودے پورہ اندور (مدھیہ پردیش)

اسٹوڈینٹس بک ہاؤس چار مینار حیدرآباد

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی جامعہ نگر نئی دہلی۔

اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۴۸۵ اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

اسلامی بک ڈپو امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ (اترپردیش)

اسلامی بکس مین گیٹ دارالعلوم دیوبند سہارنپور۔ (اترپردیش)

اسلامی تبلیغی مشن مٹیا محل دہلی

اسلامیہ بک ڈپو۔ طلاق محل کانپور (اترپردیش)

اسلامیہ بک ڈپو نیو مارکیٹ تاتار پورہ چوک بھاگل پور سٹی (بہار)

اسلامیہ کتاب ہاؤس مدرسہ اسلامیہ پوسٹ رفیع گنج گیا (بہار)

اشرف پبلی کیشنز بیت الشرف مکھنیاں بیگو سرائے بہار ۸۵۱۲۱۱

اشرفی کتاب خانہ بخشی بازار الہ آباد

اصغر علی بک سیلر گنج نمبر ۲ بتیا (مغربی چمپارن (بہار)

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۴۷۹ سوئی والان دہلی

اعجاز بک ڈپو، جے پی لین روڈ ہاوڑہ (مغربی بنگال)

اعجاز پبلشنگ ہاؤس ۲۰۶۰ ناہر خاں اسٹریٹ دریا گنج نئی دہلی

افغانی دارالکتب دیوبند (اترپردیش)

اقبال پبلشنگ ہاؤس، خزانچی روڈ پٹنہ (بہار)

اقبال احمد اینڈ برادرس ۱۴۔ سید صالح لین کلکتہ - ۷

اقدار کتاب گھر ۷۱/۲۵ شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ - ۱۷

اگروال بک ڈپو کھاری باؤلی دلی
الجمعیۃ بک ڈپو گلی قاسم جان اسٹریٹ دہلی
الہ آباد بک ہاؤس زیرو روڈ الہ آباد
الیاس ٹریڈرس شاہ علی بنڈہ روڈ حیدرآباد (آندھرا)
آل انڈیا مومن اکیڈمی جی ۷ ۹ مورلینڈ روڈ بمبئی
امپیریل بک ڈپو پٹنہ (بہار)
انجم بک ڈپو ۴۲۰۸ جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶
انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) اُردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی۔
انجمن ترقی اُردو ماڈل ٹاؤن ۵۳ ۵ راگھو ماجرا پٹیالہ
انجمن ترقیٔ اُردو (مغربی بنگال) ۹ بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ - ۱
انجمن تہذیب نوبہار گنج ، الہ آباد
آندھرا پردیش اُردو اکاڈمی، سیف آباد حیدرآباد
انڈیا بک ہاؤس بخشی بازار کٹک (اڑیسہ)
انڈین لنگویجز پبلی کیشنز گیا۔ (بہار)
انڈین بک ڈپو مال روڈ شملہ (ہماچل پردیش)
انوار بک ڈپو امین الدولہ پارک لکھنو (اُترپردیش)
انوار بک ڈپو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ
انوار بک ڈپو ۹۹/۱ اے ونرچت پور روڈ کلکتہ
اوورسیز بک سینٹر ۵۴ جوہو پارلے اسکیم اندھیری بمبئی - ۵۸
اورنٹیل بک ڈپو بازار نصراللہ خاں رامپور (اترپردیش)
انوراگ کتاب گھر ۱۳۹۸ اسیکٹر ۳۴ سی چنڈی گڑھ۔
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس گلی عزیزالدین وکیل لال کنواں دہلی
ایچ پی بک ڈپو بہادر گنج چوک پوسٹ سری سرائے دربھنگہ (بہار)
ایس چاندا اینڈ کمپنی رام نگر۔ دہلی ۵۵
ایس ایم خلیل اینڈ سنز چوک بلیا (اُترپردیش)

ایس ایم زیڈ بک امپورٹر معروف گنج گیا (بہار)
ایشیا پبلشرز ۵ سبھار گولین تیس ہزاری دہلی۔
ایشیا پبلی کیشنز۔ اردونا ہال اُردو بازار دہلی
ایم آئی انصاری ۱۸ پی ایم بستی تھرڈ لین شب پور (مغربی بنگال)
ایم بشیر حسن اینڈ سنز ۱۰۳ رابندرا سرائے کلکتہ
ایم شرف الدین اینڈ سنز چوک آرہ (بہار)
اہلوو الیہ بک ڈپو ۶/۹۹۵۳ نیو روہتک روڈ نئی دہلی۔
ایوان پبلشرز نخاس کہنہ الہ آباد (اُتر پردیش)
ابال ساہتیہ مندر ۱۳۱ا کٹرہ الہ آباد (اُتر پردیش)
بزم ادب رام پور (اُتر پردیش)
بزم اُردو ادب پرتاپ گڑھ (اُتر پردیش)
بزم اشاعت اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری ممبئی۔ ۶۰
بزم شعراء رامپور درمحلہ روڈ رام پور (اُتر پردیش)
بزم جامی۔ محلہ سوتھ بدایوں (اُتر پردیش)
بک ایمپوریم سبزی باغ پٹنہ ۔۴ (بہار)
بک کارنر، کناٹ پلیس نئی دہلی
بک کارنر دانش کدہ امروہہ (اُتر پردیش)
بک فاونٹین سوراج پوری روڈ گیا (بہار)
بک لینڈ بخشی بازار کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اڑیسہ)
بک ورلڈ بک سیلرز چوک حیدر آباد (آندھرا)
بک ہاؤس دریا پور پٹنہ (بہار)
بہار اسٹور شاپ نمبر ۱۹ بلاک نمبر ۹ ساکچی بازار جمشید پور (بہار)
بہار پبلشنگ ہاؤس نیا ٹولہ پٹنہ
بھارت بک ڈپو اشوک راج پتھ پٹنہ (بہار)
بھارت بکڈپو پٹرول پمپ مین روڈ ہزاری باغ پٹنہ (بہار)

بھارتی پبلی کیشنز ۲۰۵ گڑھیا بازار مٹیا محل دہلی ۱۱۰۰۰۶

بھوپال بک ہاؤس چار بتی بدھوارہ بھوپال (مدھیہ پردیش)

بیسویں صدی پبلی کیشنز دریا گنج دہلی

پاپولر بک ڈپو موتی مسجد بھوپال (مدھیہ پردیش)

پاپولر بک کارنر کھجوری بازار اندور (مدھیہ پردیش)

پاپولر پبلی کیشنز ۹۹۳ بازار چتلی قبر دہلی

پاسبان دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

پاکیزہ اسٹور پورب سرائے مونگھیر (بہار)

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے-۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

پرنس بک ڈپو ۴/۳ سی نیو روہتک روڈ قرول باغ نئی دہلی

پرویز بک ایجنسی پوسٹ بکس ۱۸۹ حیدرآباد -۱

پرویز بک ہاؤس سنہری باغ پٹنہ (بہار)

پریم کتاب گھر ۱۱۶۹ سیکٹر ۸ سی چنڈی گڑھ

پستک بھنڈار گونہ ترا روڈ پٹنہ (بہار)

پنجاب اردو اکاڈمی ۳۳۴۹ سیکٹر ۲۱ ڈی چنڈی گڑھ

پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی

پیپر کارنر ارار یہ کوٹ پورنیہ (بہار)

پی پی پبلی کیشنز ۹۹۳ بازار چتلی قبر دہلی-۶

پیوپلز بک اسٹال پیوپلز ٹیوٹوریل کالج محن فاؤنڈر حیدرآباد

پی کے بک آرگنائزیشن ۲۴ ڈی آنند نگر اندر لوک دہلی

پی کے پبلی کیشنز ۳۰۷۲ پرتاپ اسٹریٹ دریا گنج نئی دہلی

تاج بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی

تاج بک ڈپو مین روڈ رانچی (بہار)

تاج بک ڈپو لوئر چت پور روڈ کلکتہ (مغربی بنگال)

تاج بک ہاؤس مچھلی کمان حیدرآباد (آندھرا)
تاج پبلشرز ۱۶۶، بیری والا باغ دہلی ۱۱۰۰۰۶
تامل ناڈو اُردو پبلی کیشنز ایسوسی ایشن امیرالنساء بیگم اسٹریٹ ماؤنٹ روڈ مدراس
ترقی اُردو بیورو۔ وزارت تعلیم ویسٹ بلاک ۸۔ راما کرشنا پورم نئی دہلی-۲۲
تسنیم ادبی محفل خدیو منزل بنجارہ ہل روڈ حیدرآباد (آندھرا)
تناظر پبلی کیشنز میور وہار دہلی
تیج بک ڈپو حضرت گنج لکھنؤ۔
تیز گام پروگریسو پبلی کیشنز ۹۲۲ روح اللہ خاں اسٹریٹ دریا گنج ۱۱۰۰۰۲
جامعہ دینیات دیوبند (اُترپردیش)
جامعہ ملیہ شعبہ اُردو جامعہ نگر نئی دہلی
جاوید بک ڈپو ۷۷، کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ (مغربی بنگال)
جاوید بک ڈپو کالج روڈ بڑا بازار ہزاری باغ (بہار)
جاوید بک ڈپو ہاشم روڈ رحمت اللہ روڈ بمبئی۔
جمال بک ڈپو، باری روڈ گیا (بہار)
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر
جیبی کتاب گھر نزد مدرسہ قادریہ حبیبہ جامع مسجد بھدرک (اڑیسہ)
چاولہ بک اسٹال اسٹیشن روڈ پیلی بھیت (اُترپردیش)
چمن بک ڈپو ۲۰۵ گلی گڑھیا بازار مٹیا محل جامع مسجد دہلی
حاجی غنی احمد بک سیلرمسٹن روڈ کان پور (اُترپردیش)
حاجی محمد سعید اینڈ سنز ۲۰ رفیع احمد قدوائی روڈ کلکتہ
حجازی بک ڈپو۔ لال کنواں دہلی
حسامی بکڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد
حفیظ بک ڈپو، جامع مسجد دہلی
حلقۂ ادب، عابدی منزل بریرہنہ غازی پور (اُترپردیش)
حلقۂ تشنگان ادب ۱۰۴ اسکیٹر-۱ راما کرشنا پورم نئی دہلی

حنیف بک ڈپو، مومن پورہ، ناگپور - ۱۸
حیدر اینڈ سنز بک سیلرز اینڈ پبلشرز مچھلی کمان حیدر آباد
حیدر بک ڈپو، محلہ گڑھ پورہ بہار شریف (بہار)
حیدری بک ڈپو چھپٹا بازار، حیدر آباد (آندھرا)
خمخانہ ادب بے ۹/۴۲ راجوری گارڈن دہلی -
خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی حضرت نظام الدین نئی دھلی۔
خیاباں پبلی کیشنز ۱۰۵ انشان پاڑہ روڈ دوسری منزل بمبئی ۴۰۰۰۰۹
خیبر پبلی کیشنز ۲۹۱۰ لال دروازہ، سرکی والان سوئی والان دھلی -
خورشید بک ڈپو نزد امین آباد - ڈاک خانہ لکھنؤ (اترپردیش)
دارالاشاعت اسلام ۷۷ کولو ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
دارالاشاعت ترقی رام نگر شاہدرہ دہلی
دارالاشاعت مدرسہ باقیات صالحات ویلور ۶۳۲۰۰۴
دارالحبیب ۵۲۹۶ کوچہ رحمان چاندنی چوک دہلی ۱۱۰۰۰۶
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو
دارالمصنفین اعظم گڑھ (اترپردیش)
داس گپتا پرکاشن سی ۱۵ ۔ کالج اسٹریٹ مارکیٹ کلکتہ ۷
دانش اکیڈمی، آرہ (بہار)
دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (اترپردیش)
دائرہ ادب ولنہ، کاشانہ تنہا انصاری ولنہ یارہ مولہ (جموں کشمیر)
دلی بک سروس ۱۵۰۳ قاسم جان اسٹریٹ دہلی
دہلی بک سینٹر راجدوارہ رام پور (اترپردیش)
دیپک پبلشرز مائی ہیراں گیٹ جالندھر (پنجاب)
دین دنیا پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی
دینی بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی
ذکی بک ڈپو خیر آباد ضلع اعظم گڑھ (اترپردیش)

راجپال اینڈ سنز، کشمیری گیٹ دہلی
رام پرشاد اینڈ سنز بک سیلرز ہاسپٹل روڈ آگرہ (اتر پردیش)
رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ کلاں محل دہلی
رام کمار بک ڈپو حضرت گنج لکھنؤ
رام نرائن بینی مادھو کٹڑہ الہ آباد
رانی کتاب گھر ۹۹۳ بازار چتلی قبر دہلی ۱۱۰۰۰۶
رائٹرز امپوریم لمیٹیڈ ۳۲ خورشید بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ نئی دہلی
رائٹرس گلڈ ٹرنر ۲۸ ایونگ کرسچین کالج الہ آباد
رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا الہ آباد
ربانی بک ڈپو لال کنواں دہلی
رتن اینڈ کو دریبہ کلاں دہلی
رخشندہ کتاب گھر بمبئی
رضوان بک سیلرز ڈاک خانہ مبارک پور مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ (اترپردیش)
رضوان بک ڈپو چھتہ مسجد گیا (بہار)
رفیق بک ڈپو طلاق محل کان پور (اتر پردیش)
رنگ محل پبلی کیشنز ۵۵/۶، انصاری روڈ مظفر نگر (اتر پردیش)
روشن پبلی کیشنز بدایوں
رومی پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹیڈ سری نگر (جموں کشمیر)
ریاض بک ڈپو ۱۲۔ بی ایم بستی تھرڈ لین شب پور (مغربی بنگال)
زم زم بک ٹرسٹ ۱۲۰ پی کے وشو کرما نگر شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲
زندہ دلان حیدر آباد ۲۷ مجردگاہ معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد ۵۰۰۰۰۱ (آندھرا)
زیور پبلی کیشنز باقر گنج پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
زاہد بک ڈپو ۱۲۔ راجہ باڑہ چوک اندور (مدھیہ پردیش)
ساقی بک ڈپو اردو بازار دہلی
ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹیڈ پنج رتن دوسری منزل اوپیرا ہاؤس بمبئی ۴۰۰۰۰۴

سالم کمپنی دیوبند (اترپردیش)
ساہتیہ اکاڈمی رابندرا بھون منڈی ہاؤس نئی دہلی
ساہتیہ سدن گوتم مارگ گیا (بہار)
سب رنگ کتاب گھر گلی قاسم جان دہلی ۱۱۰۰۰۶
سب رنگ کتاب گھر، مینا روڈ رانچی بہار
سب رنگ کتاب گھر، موتی جھیل مظفر نگر (بہار)
سبھاش بک ڈپو چہار باغ لکھنؤ
ستار پبلی کیشنز آصف علی روڈ نئی دہلی
سحر پبلشنگ ہاؤس چوڑی والان دہلی
سراج الحسن بکسیلر گنج نمبر ۲ بتیا (مغربی چمپارن) بہار
سردار بک اسٹال بس سٹینڈ سلیم پور دیوریہ (اترپردیش)
سرسید بک ڈپو علی گڑھ
سطور پرکاشن ۲۲۷۱ دہلی گیٹ دہلی
سعیدہ بک ڈپو بڑا امام اسٹریٹ گنٹور (آندھرا)
سعید جنرل اینڈ بک اسٹال لاکھی گیٹ سہارن پور (اترپردیش)
سلامتی پبلی کیشنز بی بی مسجد مومن پورہ گلبرگہ ۴ (کرناٹک)
سلطانیہ بک اسٹور ۴۵۰/۱ ایچ سیکٹر ۱۵ روڑ کیلا (اڑیسہ)
سلطانیہ بک ڈپو، آصف علی روڈ نئی دہلی
سلوجہ پرکاشن، ڈی ۴۱ گل مہر پارک نئی دہلی
سلیم بک ڈپو، حضرت نظام الدین نئی دہلی
سمت نامہ پبلی کیشنز ۲/۴۸ راجندر نگر نئی دہلی
سنٹرل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی
سنٹرل بک ڈپو، ابراہیم پورہ بھوپال (مدھیہ پردیش)
سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن دہلی ۱۱۰۰۰۵
سنٹرل نیوز ایجنسی مدراس ہوٹل بلڈنگ کناٹ پلیس نئی دہلی۔

سنگل بک ڈپو شمشاد مارکیٹ علی گڑھ (اُتر پردیش)
سوسائٹی بک پلیس، ۷ کولو ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
سہیل پبلی کیشن مولانا محمد علی روڈ کلکتہ
سیما پبلی کیشنز ذکی ہوٹل نظام الدین ویسٹ نئی دہلی
سیماب اکادمی ۸۲ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی۔
سیمانت پرکاشن کوچہ روح اللہ تراہا بیرم خاں دریا گنج نئی دہلی
سیفی بک ڈپو، منڈی بازار، برہان پور (مدھیہ پردیش)
شاہ بک ڈپو دیوبند (اترپردیش)
شاہین بک ڈپو جامع مسجد آسنسول (مغربی بنگال)
شکیل بک ڈپو ۱/۱۲۰ لوئر چیت پور روڈ کلکتہ
شکیل بک ڈپو سبزی باغ پٹنہ (بہار)
شمس پبلی کیشنز ۹۴ بی ۱ ے ویرانی مارگ بمبئی ۸
شنکر بک اسٹال مین روڈ بیل سانڈ (سیتا مڑھی۔ بہار)
شاداب کتاب گھر ۱/۴۴ ڈی سرسید احمد روڈ کلکتہ
شاد عظیم آبادی میموریل کمیٹی پٹنہ ۴ (بہار)
شالیمار بکس کوچہ چیلان دریا گنج دہلی
شالیمار پبلی کیشنز نیا ملک پیٹھ حیدرآباد

شان ہند ۸۔انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲
شاہد اکاڈمی مٹیا محل دہلی
شاہ اجمل اشاعت گھر ۱۱۹ دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد
شاہین بک سنٹر ڈی ۱۰۲ ویلکم سیلم پور دہلی
شاہین بک اسٹال اینڈ پبلشرز سری نگر
شاہی پبلی کیشنز ۱۹۲۲، کوچہ رُوح اللہ خاں دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲
شاہین پبلی کیشنز شوکت علی روڈ الٰہ آباد

شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد
شبستان، شاہ گنج الہ آباد
شرنی بک سنٹر قلعہ گھاٹ دربھنگہ (بہار)
شری کرشن گپتا، بک سیلر کچہری روڈ، میرٹھ
شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی دہلی
شعور پبلیکیشنز دہلی
شمع بک اسٹال چوک کلاک ٹاور سبزی منڈی الہ آباد
شمع بک اسٹال ۷/۱ گیس اسٹریٹ راجہ بازار کلکتہ ۷۰۰۰۰۹
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
شمیم بک ڈپو ڈاک خانہ سرائے میر اعظم گڑھ (اترپردیش)
شہناز پبلی کیشنز شہامت گنج۔ بریلی
شیر شاہ اکاڈمی محلہ شاہ جمعہ سہسرام (بہار)
شیریں انٹرپرائزز بیس منٹ آشادیپ ۹ ہیلی روڈ دہلی
شیریں بک ڈپو بخشی بازار کٹک (اڑیسہ)
صادق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ
صادق کتب خانہ بھنڈی بازار بمبئی
صوفی پبلی کیشنز ۱۱۸۱ بلی ماران دہلی
صدیق بک ڈپو، امین الدولہ پارک لکھنؤ
صدی پبلی کیشن ۱۸۸۰ بازار ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶
صدیقی اشاعت گھر بے ۱۷ جنگپورہ ایکسٹنشن نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴
صدیقیہ بک ڈپو ۱۰۷ لوئرچت روڈ کلکتہ
طلعت پبلی کیشنز، مسلم کالج چمن گنج کان پور (اترپردیش)
ظفر بک ڈپو تال پارہ چوک رائے پور (مدھیہ پردیش)
ظفر بک ڈپو جی بی روڈ گیا (بہار)
ظفر بک ڈپو ابراہیم، رحمت اللہ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

عاشقین بک ڈپو، حویلی اعظم خاں۔ دہلی
عامر بک ڈپو، پہلی منزل ۱۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۔۱
عاشق حسین اینڈ سنز نورانی منزل پٹنہ (بہار)
عثمانیہ بک ڈپو ۷ر چیت پور روڈ کلکتہ ۔۱
عبدالوحید بک سیلر دال منڈی وارانسی (اتر پردیش)
عثمانیہ بک ڈپو مینا بازار، شاہی گیٹ جامع مسجد دہلی
عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستھان)
عصری آگہی پبلی کیشنز رام نگر دہلی
عظیم بک ڈپو دیوبند (اتر پردیش)
عظیم الشان بک ڈپو سلطان گنج پٹنہ (بہار)
علمی مجلس دہلی، چھتہ نواب صاحب فراش خانہ دہلی
علمی مجلس کتب خانہ ۱۱۷۲ کلاں محل دہلی
علوی بک ڈپو ۴۹۔ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین نئی دہلی
غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب ماتا سندری روڈ نئی دہلی
غلام مصطفےٰ بک سیلر ۱۲ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ
فانی بک ڈپو رنجیت نگر نئی دہلی
فتح پور بک ڈپو مسلم چوک فتح پور (اتر پردیش)
فراست بک ڈپو عقب مدینہ مسجد کھوکھراں اسٹریٹ مرادآباد (اتر پردیش)
فرید بک ڈپو چتلی قبر دہلی
فرینڈس بک کارنر ۲۱ اے اسلامیہ مارکیٹ بریلی
فرینڈس نیوز ایجنسی بلاقی روڈ گریڈیہہ (بہار)
فیصل طلعت پبلی کیشنز ہمایوں باغ کان پور (اتر پردیش)
قادری بک سنٹر شیخ محلہ سیوان (بہار)
قاسمی بک ڈپو سبزی بہور پٹنہ (بہار)

قصر ادب پبلی کیشنز پری گھاٹ بھوپال
قصر اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی
قومی کتب خانہ بریلی
کتاب گھر، زیل آباد میل وشارم ضلع شمالی آرکاٹ (تمل ناڈو)
کایا پبلیکیشنز بہادر گڑھ (ہریانہ)
کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ
کتابستان ۱۷ چک الٰہ آباد
کتاب دان بی ۲/۵ ریور بنک کالونی لکھنؤ
کتاب کار رام پور (اُتر پردیش)
کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴ (بہار)
کتب خانہ اشاعت الاسلام چوڑی والان دہلی
کتب خانہ محمودیہ دیوبند
کتب خانہ نذیریہ جامع مسجد دہلی۔
کتب پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی
کرانتی پبلی کیشنز ۱۷۷۸ سوئی والان دہلی
کریسنٹ پبلی کیشنز نو کریم گنج گیا
کلادرپن سیکٹر ۱۵ چنڈی گڑھ
کلچرل اکاڈمی رینا ہاؤس، جگجیون رام روڈ گیا۔ (بہار)
کمال پبلشرز ۲۰۳۰ گلی قاسم جان لال کنواں دہلی ۶-۱۱۰۰۰
کوکن اردو رائٹرز گلڈ معرفت ماہنامہ نقش کوکن جیل روڈ بمبئی
گوہر بک ڈپو ۲۸ پلی کین ہائی روڈ مدراس ۵
لاجپت رائے اینڈ سنز دہلی
لطف الدولہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد ۲۷
محرک پبلی کیشنز باٹن روڈ آسنسول (مغربی بنگال)
مجلس اشاعت ادب ۴۹۱۰ باڑہ ہندو راؤ دہلی
مجلس مصنفین محمد عثمان اینڈ سنز مدراس

بدینہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
مرزا پبلی کیشنز حسن آباد رعنا واری سری نگر
مرکز ادب اردو انیس منزل ۱۳۷ شاہ گنج لکھنؤ
مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر) پنجاب
مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶
مشورہ بک ڈپو رام نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱
معیار ادب بک ڈپو گلی بیبا ہزاری گوجر پور بھوپال (مدھیہ پردیش)
معیار پبلی کیشنز ۱۹۴/۷ سی صفدر جنگ ڈویلپمنٹ ایریا نئی دہلی
مقیم احمد بک اسٹال ۱۲۵ پارک اسٹریٹ کلکتہ
مکتبہ دینیات دیوبند سہارنپور (اتر پردیش)
مکتبہ رحمانیہ انصاری روڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مکتبہ دین و ادب ۱۰ لاٹوش روڈ لکھنؤ
مکتبہ رنگین ۱۰۹۷ گنج میر خاں دہلی
مکتبہ ادب ۲۹ مالویہ نگر بھوپال (مدھیہ پردیش)
مکتبہ ارتقا ۵ سی سنڈل اسٹریٹ کلکتہ ۱۶
مکتبہ تحریک انصاری روڈ دریا گنج دہلی
مکتبہ ثناء اللہ اکاڈمی ۳۲۴۴ نئی سڑک دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی / پرنسیس بلڈنگ محمد علی روڈ بمبئی / یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ
مکتبہ جدید اردو بازار دہلی
مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ شرقیہ ابراہیم پورہ بھوپال
مکتبہ عزیزیہ اردو بازار دہلی
مکتبہ شعر و حکمت ۲۲-۲-۶۷۴ بازار نور الامرا حیدرآباد ۱۴
مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ رشیدیہ اردو بازار دہلی
مکتبہ الحیات نیو کریم گنج گیا ۸۲۳۰۰۱
مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف۔ پٹنہ

مکتبہ رہبر ۲۹۳۶ کلاں مسجد ترکمان گیٹ دہلی ۶ — ۱۱۰۰۰
موڈرن پبلشنگ ہاوس گولہ مارکیٹ نئی دہلی ۲ — ۱۱۰۰۰
مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، ایم جی ایم بلڈنگ نیتا جی سبھاش روڈ بمبئی ۲
مینار بک ڈپو چار مینار حیدرآباد۔ ۲
نازش بک سنٹر ۳۲۰۷ کھاٹک تیلیان ترکمان گیٹ دہلی ۶ — ۱۱۰۰۰
ناولستان جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی
نرگس پبلی کیشنز ۱۵ چھپرا بلڈنگ دادر بمبئی
نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ (اترپردیش)
نشاط بک ڈپو قدوائی روڈ مالیگاؤں (ناسک)
نشتر پبلی کیشنز نزد مسجد قادر صاحب۔ مومن پورہ ناگ پور
نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین الدولہ پارک (اترپردیش)
نصیر بک ڈپو۔ بستی نظام الدین نئی دہلی
نکہت پبلی کیشنز الہ آباد
نمائندہ کتاب گھر شیخ سرائے۔ سیتاپور
نندن بک ڈپو۔ پی آئی روڈ بریلی کینٹ
نورجہاں پبلی کیشنز لال کنواں دہلی
نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
نیرنگ اکیڈمی گھانسی بازار حیدرآباد
نیشنل بک ٹرسٹ اے ۵ گرین پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶
نیشنل بک ڈپو چار کمان حیدرآباد ۲
نیشنل پبلشرز ۳/۲ پریم نگر ڈبل اسٹوری نئی دہلی ۱۱۰۰۱۸
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، سری آربندو مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶
نیو اسکول پبلی کیشنز رودگران دہلی ۶ — ۱۱۰۰۰
نیو رائٹرز پبلیکیشنز بمبئی
نیو لٹریچر ۱۵۵ بستی نظام الدین نئی دہلی ۱۳

دلا اکیڈمی عزیز باغ حیدرآباد (آندھرا)
وسل پبلی کیشنز ۱۰۷ جولی بھون ۱۰ نیومیرین ڈرائیو چرچ گیٹ بمبئی
ہم لوگ پبلشرس ۵ ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ لکھنؤ
ہمالیہ پاکٹ بکس انصاری روڈ نئی دہلی
ہند پاکٹ بکس جی ٹی روڈ شاہدرہ دہلی
ہندوستانی بک ٹرسٹ، کپتان بھون جے ٹاٹا روڈ بمبئی
ہندوستان پبلی کیشنز ابو کا بھٹہ غازی آباد (اُترپردیش)
ہندوستانی ادبی سوسائٹی ٹیگور اکیڈمی بلڈنگ بارہ ٹوٹی دہلی
ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
یوسفی کتب خانہ بازار حاسہ سہارن پور (اُترپردیش)



پاکستان کے اہم ناشر و کتب فروش

آئینہ ادب :- چوک مینار انارکلی۔لاہور
آئینہ بُک ڈپو :- شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور
احباب اعظم :- لاہور
احسان اکیڈمی :- لاہور
احسن برادرز :- ۲۔ المینار مارکیٹ چوک انارکلی لاہور
ادارہ القلم :- راولپنڈی
ادارہ ادب نو :- لاہور
ادارہ ادبیات :- سرکلر روڈ۔ لاہور
اکادمی ادبیات پاکستان :- اسلام آباد
ادارہ پنجاب رنگ :- برانڈرتھ روڈ۔ رام گلی۔ لاہور
ادارہ تحقیقات اسلامی :- اسلام آباد
ادارہ ثقافت پاکستان :- مکان نمبر ۲ ایف ۷/۲ گلی نمبر ۱۱ اسلام آباد
ادارہ فروغ اردو :- ایبک روڈ۔ لاہور
ادارہ فکر و ادب :- لاہور
ادارہ مصنفین پاکستان :- منٹگمری روڈ۔ لاہور
ادارہ نو :- ربر مسلم مسجد۔ لاہور
ادارہ مطبوعات :- لاہور
ادبی لائبریری :- نیو مارکیٹ سمن آباد۔ لاہور
ادبی دُنیا :- قائداعظم روڈ۔ لاہور
ادب گاہ :- بلاک نمبر ۲ اے ۴/۹ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

اردو اکیڈمی :۔ سندھ کراچی
اردو بکسٹال :۔ قائداعظم روڈ۔ لاہور
اردو مرکز :۔ سرکلر روڈ لاہور
اسلامی اکیڈمی :۔ لاہور
اشاعت منزل :۔ ہل روڈ لاہور
البیان :۔ زیر مسلم مسجد لاہور
التحریر :۔ اردو بازار۔ کیر اسٹریٹ لاہور
الجدید :۔ نزد نعمت کدہ ہوٹل۔ سرکلر روڈ۔ لاہور
الحمرا اکیڈمی :۔ ۳۰ لونگ روڈ نیلا گنبد لاہور
الحیات :۔ ۱۱۰ مین سمن آباد۔ لاہور
المثال :۔ نیپر روڈ۔ لاہور
انارکلی کتاب گھر :۔ لاہور
انصار بک اسٹال :۔ اردو بازار سرگودھا
بُک پبلیس :۔ ۲۰۴ ذوالقرنین گنپت روڈ۔ لاہور
بُک سینٹر :۔ حیدر روڈ۔ راولپنڈی۔
بُک کارنر :۔ چوک فیصل شہید بازار کلاں جہلم
بین الاسلامی مرکز اشاعت :۔ عارف والا۔ لاہور
پاک کتاب گھر :۔ ۳۵ اردو بازار کراچی۔
پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس :۔ اسلام آباد
پنجاب نیوز ایجنسی :۔ اردو بازار کراچی۔
پنجابی ادبی اکیڈمی :۔ ۱۔ کچہری روڈ۔ لاہور
پولیمر پبلیکیشنز :۔ راحت مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
تعبیر پبلیکیشنز :۔ کراچی
تعبیر پبلشنگ ھاؤس :۔ سیمنٹ بلڈنگ، تعاون روڈ۔ لاہور
جامعہ اسلامیہ :۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ اسلام آباد
جدید کلاسک پبلشرز :۔ ۱۳۶-۱۔اے بلاک نی نارتھ ناظم آباد۔ کراچی
چودھری اکیڈمی :۔ ۲۱۳ ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ۔ لاہور

حامد برادرس :۔ سوہا بازار۔لاہور ۸
خالد پبلیکیشنز :۔ ۱۲ ڈی، حسن سنٹر گلشن اقبال۔کراچی
خالد اکیڈمی پبلشرز :۔ کالج روڈ، راولپنڈی
خیام پبلشرز :چوک اُردو بازار، لاہور
دارالاشاعت :۔ مولوی مسافر خانہ، کراچی
دارالبلاغ :۔ محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، لاہور ۵
دارالعلم :۔ اشرف منزل ۴۳۷ بی ویب روڈ گارڈن (ایسٹ) کراچی ۵
دفتر ماہنامہ اسلام :۔ کتاب خانہ حفیظ، ماڈل ٹاؤن، لاہور
رابعہ بک ھاؤس :۔ بخشی مارکیٹ، انارکلی، لاہور
زاہد اکیڈمی :۔ ۷۔ اے کوہ نور شوگر ملز کالونی، جوہر آباد
سلیم پبلشنگ ایجنسی :۔ بہادر شاہ مارکیٹ، موہن روڈ، کراچی
سنگِ میل پبلیکیشنز :۔ چوک اُردو بازار لاہور
سیپ پبلیکیشنز :۔ پوسٹ بکس ۳۲۲۴ کراچی ۲۸
شمع ادب :۔ اُردو بازار گوجرانوالا
شمع پبلشرز :۔ اُردو بازار، گوجرانوالا
شہزاد پبلشرز :۔ ۱۔ جان محمد روڈ لاہور
شہناز بک کلب :۔ کراچی
شیخ شوکت علی اینڈ سنز :۔ محمد علی جناح روڈ۔کراچی
شیخ غلام علی اینڈ سنز :۔ لاہور۔ حیدر آباد۔ کراچی
ضیائے ادب :۔ ۴۔ گل زیب کالونی، نواں کوٹ سمن آباد۔ لاہور
علی برادرز :۔ ۱۱۷ ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ، اُردو بازار، لاہور
فیروز سنز لمیٹڈ :۔ لاہور، راولپنڈی، ملتان، حیدر آباد، پشاور، کراچی
قائداعظم اکاڈمی :۔ کراچی
قمر کتاب گھر :۔ اُردو بازار کراچی
قومی کتب خانہ :۔ ۶۵ ریلوے روڈ، کراچی، لاہور
کتاب منزل :۔ کشمیری بازار، لاہور
کراچی بک ڈپو :۔ ۴۸ اُردو بازار، کراچی

کراچی یونیورسٹی :- کراچی
کمبائنڈ پبلشرز :- ۷۴ فیروز پور روڈ اچھرہ - لاہور
کوہ نور پبلیکیشنز :- ۱۷- بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور
گوشۂ ادب :- ناظم آباد کراچی ۱۸
ماڈل بک اسٹال :- ٹولنٹن مارکیٹ شاہراہ قائداعظم - لاہور
ماورا پبلشرز :- کالج روڈ - راولپنڈی
ماورا پبلشرز :- بہاولپور روڈ - لاہور
محبوب بک ڈپو :- امین پور بازار، شاہ فیصل آباد
مدینہ بک ڈپو :- بندر روڈ - کراچی
مقتدرہ قومی زبان :- ۲۴ ڈی بلاک نمبر ۷ گلشن اقبال کراچی ۴۷
مطبوعات حرمت :- بینک روڈ - راولپنڈی
مقبول اکیڈمی :- چوک انارکلی، سرکلر روڈ، لاہور
مکتبہ احسان :- چہلیک، کچہری روڈ، ملتان
مکتبہ اُردو :- لاہور
مکتبہ اُردو ادب :- بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور
مکتبہ القریش :- چوک اُردو بازار لاہور
مکتبہ ایوان اُردو :- جیل روڈ، حیدر آباد کالونی، کراچی ۵
مکتبہ دانیال :- وکٹوریہ چیمبرز، صدر، کراچی
مکتبہ ڈائریکٹو :- ۲۴ کمرشل بلڈنگس دی مال لاہور
مکتبہ جدید :- چوک انارکلی، لاہور
مکتبہ چٹان :- ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور
مکتبہ سرمد :- پوسٹ بکس ۱۰۵۴ راولپنڈی
مکتبہ علم و ادب :- کچہری روڈ - لاہور
مکتبہ کاروان :- کچہری روڈ - لاہور
مکتبہ میری لائبریری :- لاہور
مکتبہ معاصر :- ۲۰۴ الفیصل پلازہ شاہراہ قائداعظم - لاہور
موڈرن پبلشرز :- ۸۶ گول ایمپریس مارکیٹ - کراچی

مکتبہ موقلم :- رستم جی لین، جناح روڈ، کوئٹہ۔
فنڈ رسنز :- ۲۲۱ سرکلر روڈ لاہور، فیرر روڈ کراچی/گارڈن کالج روڈ راولپنڈی
نسیم بک ڈپو :- کچہری روڈ، لاہور
نفیس اکیڈمی :- بلاسس روڈ، کراچی
نیو پکٹوریل پریس :- راولپنڈی
وطن دوست لمیٹڈ :- ۸ سی احمد پارک، نیو گارڈن ٹاؤن۔ لاہور
ہمدرد اکیڈمی :- کراچی
ہمدرد فاؤنڈیشن پریس :- ہمدرد سنٹر، کراچی
یوسف پبلشرز :- بنک روڈ راولپنڈی۔

ہماری مطبوعات

ی تتلی	(ناول)	ہنسراج رہبر	قیمت -/۲۰ روپے
وں کے کھنڈر	(ناول)	نندکشور وکرم	قیمت -/۲۰ روپے
ی	(مثنوی)	شرر فتحپوری	قیمت -/۳۰ روپے
ؤ صدرنگ	(مثنوی)	عبدالمجید شمس	قیمت -/۱۶ روپے
س کا صحرا	(افسانوں کا مجموعہ)	دیویندر اسر	قیمت -/۳۰ روپے
لۂ احساس	(شعری مجموعہ)	کرشن مراری	قیمت -/۲۶ روپے
دنیا نیا آدم	(مثنویاں)	شرر فتحپوری	قیمت -/۲۴ روپے
ردا	(شعری مجموعہ)	شرر فتحپوری	قیمت -/۳۶ روپے

پبلشرز اندر ڈسٹری بیوٹرز ۔ ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

وفیات

اختر انصاری

اختر انصاری اکبر آبادی کا ۱۹ر اگست ۱۹۸۸ء کو بھاولپور کے ہوٹل الہلال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا ۱۶ر اگست کو مرحوم ایک تقریب کے سلسلہ میں کراچی سے بھاولپور پہنچے تھے اور ہوٹل الہلال میں قیام پذیر تھے۔

اختر انصاری اتر پردیش کے قصبہ اکبر آباد (ضلع آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی اور ماہنامہ "مشرب" کا اجرا کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد سندھ میں منتقل ہو گئے، جہاں سے انہوں نے "نئی قدریں" نام کا ماہنامہ جاری کیا جو تادم آخر باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ انہوں نے اس رسالے میں اردو کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی فوقیت دی۔

اختر انصاری مرحوم نے عمر کے آخری لمحات تک علم و ادب کی خدمت کی۔ نثر و نظم دونوں میں انہیں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے ان میں درج ذیل کتب شامل ہیں۔

نثری کتب: "شاہ عبداللطیف حیات اور شاعری" "سچل سرمست کی ادبی و لسانی خدمات" "اکبر الہ آبادی پر ایک کتاب" "ادبی رشتے" "لسانی رابطے" "شعری تخلیقات میں نغم فزا" "نئی رہگذر" "نئی کہکشاں" "سبد گلچیں" "فردوس مغلیہ" "جام جم" "دل رسوا" "لب گفتار" اور "منظر جاں" شامل ہیں۔ "منظر جاں" ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے۔

اطہر پرویز



جون ۱۹۲۵ء میں سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے ۱۹۴۵ء میں فارسی میں اور ۱۹۵۸ء میں اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں

اُن کا تقرر بحیثیت لیکچرر محکمۂ تعلیم میں ہوا۔ اگست ۱۹۶۸ میں حکومت ہند نے ایجوکیشن آفیسر کی حیثیت سے مارشیس بھیجا جہاں دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۲ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں سینیئر مقرر ہوتے۔

انھوں نے بچوں کے لیے زائد از پچاس کتابیں لکھیں۔ لگ بھگ سترہ کتابوں پر اُنہیں انعام سے نوازا گیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۴ کو دورۂ قلب کے سبب علی گڑھ میں رحلت۔

مطبوعات: ادب کا مطالعہ، ادب کسے کہتے ہیں، بیدی اور بیدی کے افسانے، ہمارے پسندیدہ افسانے، کرشن چندر اور کرشن چندر کے افسانے، منٹو کے نمائندہ افسانے، اُردو کے تیرہ افسانے، ایک دن کا بادشاہ، ایک ناؤ اور رنگ سازنہ کا قصہ، پودوں اور جانوروں کی دُنیا، مشینی گھوڑا، جادو کے کھیل، قصۂ حاتم طائی وغیرہ۔

افسر امروہوی

۹ فروری ۱۹۸۴ء کو کراچی میں بزرگ شاعر و ادیب جناب افسر امروہی کا انتقال ہو گیا۔

افسر امروہی کا اصل نام منظور احمد اور اُن کے والد کا نام شیخ شمس الدین تھا۔ وہ ۹ دسمبر ۱۸۹۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوتے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں کراچی چلے گئے ۱۹۳۴ء میں انھوں نے کراچی میں انجمن ترقی اُردو ہند کی شاخ قائم کی اور کئی سال تک اُس کے سکریٹری رہے۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں انھوں نے کراچی سے رسالہ تنویر کا اجرا کیا۔ اُنہوں نے کراچی میں مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ انجمن ترقی اُردو پاکستان سے وابستہ ہوئے۔

مطبوعات: برق تخیل ۲۴، نالش خیال ۲۹، شہاب تخیل ۲۹، سرمایۂ تغزل ۸۳ (چار شعری مجموعے) ہادی المجمع ۲۴، تذکرہ عروس الافکار ۵، بیاض مرائی ۵، تذکرۂ مدائح الشعراء ۶، مثنوی عافیت بخیرا ۸، مثنوی نوسر ہار ۸۲، سنگھاسن بتی ۸۲ء مصحفی حیات و کلام، تلامذۂ مصحفی۔

انور صابری

مشہور شاعر اور جنگ آزادی کے سپاہی علامہ انور صابری کا طویل عرصہ سے "زیابیطس"



کے شکار تھے۔ پچھلے چار سال سے وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تھے تقریباً تین سال قبل ان کی بینائی ختم ہو گئی تھی اس کے بعد دونوں پیر مفلوج ہو گئے۔ انتقال کے وقت وہ کسی کی آواز سن کر پہچاننے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

علامہ انور صابری پچاس سال سے شعر کہہ رہے تھے حب الوطنی ان کا خاص مزاج تھا۔ "السلام علیکم" کلام کے بعد "لفظ دوراں" اور "ساقی نامہ" شائع ہوا۔ "وہ جنہیں کوئی نہیں جانتا" ان کی نثری کتاب ہے جس میں گمنام شاعروں کے حالات اور تعارف لکھے۔ مرحوم دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ اور ۴؍ اگست کو دیوبند ہی میں انتقال فرمایا۔

دوارکا داس شعلہ

۱۳؍ اگست ۱۹۱۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ کلام پر حفیظ جالندھری سے اصلاح لیتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۸۱ میں ساہتیہ کلا پریشد کا ادبی ایوارڈ ملا۔

۱۰؍ اپریل ۱۹۸۴ء کو دہلی میں وفات۔

مطبوعات: شعلہ زار ۱۹۶۲ (شعری مجموعہ) میرے مرشد (روحانی رہنما باوا لال جی کے سوانحی حالات)



راجندر سنگھ بیدی

نام: راجندر سنگھ بیدی ولد ہیرا سنگھ بیدی ماں کا نام: سیوادئی

تاریخ پیدائش: پہلی ستمبر ۱۹۱۵ء صبح ۳ بج کر ۴۷ منٹ پر بمقام لاہور۔ وطن مالوف: گاؤں ڈلے کی، تحصیل ڈسکا۔ ضلع سیالکوٹ۔

تعلیم: ۱۹۳۱ میٹری کیولیشن (ایس بی۔ بی۔ ایس خالصہ اسکول، لاہور) ۱۹۳۳ انٹرمیڈیٹ ڈی اے وی کالج لاہور۔

۱۹۴۵-۴۶ء میں لاہور میں ہیشوری فلمز کے لیے "کہاں گئے" نامی فلم لکھی۔

۱۹۴۷ء: لاہور کو خیرباد۔

۱۹۴۸ء: دہلی میں منتقلی۔ ادیبوں کے وفد کے ساتھ کشمیر گئے۔ جموں ریڈیو اسٹیشن میں ڈائرکٹر کا عہدہ۔

۱۹۴۹ء: دہلی کو واپسی۔ ۱۹۴۹ء ہی میں دہلی سے بمبئی کو منتقلی۔ بمبئی میں فلمی زندگی کا آغاز۔

بمبئی میں تقریباً چالیس فلموں کے مکالمے لکھے، جن میں "بڑی بہن" (۱۹۴۹ء) "داغ" (۱۹۵۲ء) "مرزا غالب" (۱۹۵۴ء) "دیوداس" (۱۹۵۵ء) "ابھیمان" (۱۹۵۷ء) "مدھومتی" (۱۹۵۸ء) "انورادھا" (۱۹۶۰ء) "انوپما" (۱۹۶۶ء) وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ دوستوں کے ساتھ اور انفرادی طور پر خود بھی فلمیں بنائیں جن کے نام ہیں: "گرم کوٹ" (۱۹۵۵ء) "پھاگن" (۱۹۵۸ء) رنگولی (۱۹۶۲ء) "دستک" اور آنکھن دیکھی (آخر الذکر فلم ریلیز نہیں ہوئی)



۱۹۶۵ء میں "ایک چادر میلی سی" پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ

۱۹۷۲ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔

۱۹۷۷ء میں بیوی ستونت کور کی وفات۔

۱۹۷۸ء میں مودی غالب ایوارڈ۔

۱۹۷۹ء میں فالج کا حملہ۔

۱۹۳۲ء ادبی زندگی کا آغاز۔ پنجابی جریدے "سارنگ" کی ادارت (طالب علمی کے زمانے میں محسن لاہوری کے نام سے انگریزی، اردو اور پنجابی میں نظمیں اور کہانیاں لکھیں)

۱۹۳۳ء میں پہلی ملازمت: پوسٹ آفس لاہور بحیثیت کلرک۔ ۱۹۴۳ء میں ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ۔ چھ ماہ دہلی میں مرکزی حکومت کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں کام کیا۔ تیسری ملازمت آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بحیثیت آرٹسٹ۔

۱۹۸۴ء میں بیماری کا شدید حملہ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء کو بمبئی میں وفات۔

مطبوعات: (افسانوں کے مجموعے) دانہ و دام ۳۶، گرہن ۴۲، کوکھ جلی ۴۹، اپنے دکھ مجھے دیدو ۶۵، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۷۴، مہمان ۷۸، مکتی بودھ ۸۲ (ڈرامے)

جان چیز ہیں ۴۳، سات کھیل ۴۶ (ناول) ایک چادر میلی سی ۶۲۔

ساغر نظامی



نام: محمد صمد یار خاں ولد ڈاکٹر سردار محمد احمد یار خاں

پیدائش: ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء ضلع علی گڑھ (اُتر پردیش)

سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ میں سے تھے۔ ماہنامہ پیمانہ آگرہ (۱۹۲۳ء) ماہنامہ مستقبل (۱۹۲۶) ہفتہ وار علی گڑھ پنچ (۱۹۲۹) ہفتہ وار استقلال علی گڑھ (۱۹۲۹) ماہنامہ ایشیا (۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۰ء) کے مدیر رہے۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ کو ذکیہ سلطانہ نیر سے شادی ہوئی۔

۱۹۵۳ء میں بمبئی سے دہلی آئے اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوشی اور پبلیکیشنز ڈویژن میں منظوم تاریخ آزادی لکھنے پر مامور ہوئے۔

۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن۔ ۱۹۷۰ء میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۸۰ء ہمدرد ایوارڈ۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی ایوارڈ اور امتیازِ میر ایوارڈ۔ ۱۹۸۳ء میں اُردو اکیڈمی دہلی ایوارڈ اور غالب مودی ایوارڈ۔

۲۷ فروری ۱۹۸۴ء کو چندر لوک روڈ نئی دہلی میں انتقال اور ۲۸ فروری کو بستی نظام الدین میں نواب لوہارو کے قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے۔

مطبوعات: شبابیات ۲۵ (رباعیات) تہذیب کی سرگزشت ۲۷ (طویل کہانی) سمندر کی دیوی ۲۷ (طویل کہانی) صبوحی ۳۲ (غزلیات کا مجموعہ) مشائخ مارہرہ ۳۳ (تاریخی کتاب) کہکشاں ۳۴ (کہانیوں کا مجموعہ) بادۂ مشرق ۳۵ (قومی نظمیں، غزلیں) رنگ محل ۴۳ (شعری مجموعہ) موج و ساحل ۴۸ (قومی نظمیں)) شکنتلا ۶۰ (کالی داس کے ڈرامے ابھگیان شکنتلم کا ترجمہ) انارکلی ۶۳ (منظوم ڈرامہ) نہرو نامہ جولائی ۶۷ (طویل نظم) مشعلِ آزادی جلد اول ۸۲ (منظوم تاریخ آزادی)

سکندر علی وجد

پیدائش: ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء ویجاپور۔ اورنگ آباد۔

تعلیم: بی اے (عثمانیہ یونیورسٹی ۳۵) حیدرآباد سول سروس (۱۹۳۷) پاس کرنے

کے بعد منصف کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۶۴۔ ۱۹۵۶ میں سیشن جج ۶۴ میں ملازمت سے سبکدوشی اور مہاراشٹر انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ۱۹۷۲ میں راجیہ سبھا کے رکن ۱۹۷۵ میں مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کے وائس چیرمین۔ ۱۹۷۴ میں بیاضِ مریم پر اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے تین ہزار کا انعام دیا۔ ۱۹۷۷ میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے پانچ ہزار کا ایوارڈ دیا۔

مطبوعات: لہو ترنگ ۴۴۔ آفتابِ تازہ ۵۲۔ اوراقِ مصور ۶۳۔ بیاضِ مریم ۶۴

سمن سرحدی



نام: رام چندر تخلص سمن سرحدی
پیدائش: ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۲ قصبہ پروا ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں صوبہ سرحد (پاکستان)
تعلیم: انڈر گریجویٹ
مطبوعات: بچوں کی دُنیا (منظوم روسی ادب ۱۹۷۳) لینن (مائیکوفسکی کی نظم کا منظوم ترجمہ)

بچوں کی دُنیا پر وزارت تعلیم و سماجی بہبود کی جانب سے ایک ہزار روپے کا ایوارڈ، لینن پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۸۰ اور اتر پردیش اردو اکاڈمی مغربی بنگال اُردو اکاڈمی ایوارڈ۔

وفات: ۲۴ جنوری ۱۹۸۵ء دہلی

شاذ تمکنت



نام: شاذ تمکنت
پیدائش: ۳۱ جنوری ۱۹۳۳ حیدر آباد
وفات: ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء حیدر آباد میں
تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی
پیشہ: درس و تدریس (ریڈر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی)
مطبوعات: تراشیدہ، بیاضِ شام، نیم خواب، ورق انتخاب، دستِ فریاد، موزوم حیات و کارنامے۔

ظفر ادیب

نام : بھیم سین

پیدائش : ۱۴ر جنوری ۱۹۱۳ء ملتان چھاؤنی (پاکستان)

تقسیم ملک سے قبل مکتبہ دانش لاہور سے وابستہ رہے۔ تقسیم ملک کے بعد جنوری ۴۸ میں دہلی چلے آئے اور پھر کئی ملازمتیں کیں۔ اشاعتی ادارہ قائم کیا جہاں سے کئی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔

مطبوعات : جوتے بار (شعری مجموعہ) ، غالب کے مقبول اساتذہ، ہم عصروں پر غالب کا اثر ۲۷، اُردو زبان کا قومی کردار ۷۶، غالب کے معنوی اساتذہ ۸۰۔

فیض احمد فیض

نام : فیض احمد خاں

والدہ کا نام : سلطان فاطمہ

والد کا نام : چودھری سلطان محمد خاں

پیدائش : ۳ فروری ۱۹۱۱ء قصبہ کالا قادر خاں ، ضلع سیالکوٹ۔

تعلیم : ۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۱۶ء میں میر سیالکوٹی کے مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور کے اسکاچ مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

۱۹۳۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوکر ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم اے او کالج میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی

کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں ایک انگریز خاتون مس ایلس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ شیخ عبداللہ شیر کشمیر نے اُن کا نکاح پڑھایا۔ ۱۹۴۲ء میں فوج میں کیپٹن کے عہدے پر تقرر اور لاہور سے دہلی آمد۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں کرنل کے عہدے پر فائز۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ یہاں انہوں نے ۲۲ جون تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد لندن چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہاں سے کراچی واپس آئے اور عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور نگراں مقرر ہوئے۔

فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ ۱۹۴۲ء میں اور چھوٹی بیٹی منیزہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئی۔

فیض کی پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے۔ دو بھائی اور تین بہنوں کا انتقال فیض کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ فیض نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے اُنہیں قید تنہائی کی سزا ہوئی اور اس عرصے میں وہ باہری دُنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ یہ تین ماہ انہیں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں گزارنے پڑے۔ جہاں پر اُنہیں دوست احباب بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنا قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان کے زمانۂ قید کی یادگار ہیں۔ "زنداں نامہ" کی بہت سی نظمیں انہوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ مارچ ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ فیض ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۵۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں رہائی ملی۔

۳۹-۱۹۳۸ء تک انہوں نے ماہنامہ "ادب لطیف" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ۵۸-۱۹۴۷ء تک روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز، ہفت روزہ لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ فیض صاحب بیروت میں افرو ایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے جریدۂ 'لوٹس' کے کافی عرصہ تک مدیر اعلیٰ رہے۔

اعزازات: فیض کو فوجی ملازمت کے دوران ۱۹۴۶ء میں ایم بی ای کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۲ء میں فیض احمد فیض کو لینن انعام سے نوازا گیا۔

سیر و سیاحت: فیض نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کیے۔ ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء تک سان فرانسسکو اور جنیوا میں رہے۔ جولائی ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۶۴ء کے دوران انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کے لیے سفر کیے۔

۱۹۵۸ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

فیض نے ۳۸-۱۹۳۹ء میں ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے۔ جو لاہور ریڈیو سے نشر ہوتے۔ ان کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ پرائیویٹ سکریٹری، سانپ کی چھتری اور 'تماشہ میرے آگے'۔

فیض صاحب نے دو فلموں کے لیے گانے اور مکالے لکھے۔ ایک فلم ہے "جاگو ہوا سویرا" جو ۱۹۵۹ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اِس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔ دوسری فلم ہے "دور ہے سکھ کا گاؤں"

قیامِ پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہوئے اور ایک عرصہ تک ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر رہے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصّہ لیا۔ فیض نے جنیوا اور فرانسسکو میں منعقدہ آئی ایل او کے اجلاس میں بھی شرکت کی۔

فیض کی تخلیقات: (شعری مجموعے) نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء پہلا مجموعۂ کلام۔ دستِ صبا ۱۹۵۲ء، زنداں نامہ ۱۹۵۶ء، دستِ تہ سنگ ۱۹۶۵ء، سرِ وادیٔ سینا ۱۹۷۱ء، شامِ شہرِ یاراں ۱۹۷۸ء، میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء، کلامِ فیض ۱۹۸۲ء،

نثری مجموعے: میزان (تنقیدی مضامین) فروری ۱۹۶۲ء، صلیبیں میرے دریچے کی (خطوط) ۱۹۷۱ء، متاعِ لوح و قلم ۱۹۷۳ء، ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء، سفر نامہ کیوبا ۱۹۷۴ء، مہ و سالِ آشنائی ۱۹۸۰ء۔

کلیات: نسخہ وفا (پاکستانی ایڈیشن) سارے سخن ہمارے (برطانوی ایڈیشن) دستِ تہ سنگ کے علاوہ فیض کے مجموعوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

وفات: فیض احمد فیض دمہ کے مرض میں مبتلا تھے۔ ۱۸ر نومبر کی رات کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء بروز منگل دن کے ایک بج کر پندرہ منٹ پر میو ہسپتال کے ایسٹ میڈیکل وارڈ میں انتقال۔



قاضی عبدالودود

اوائل مئی ۱۸۹۶ء میں کاکو (زنزد جہان آباد) پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ انگریزی کی ابتدائی تعلیم اینگلو محمڈن اسکول پٹنہ اور اینگلو محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ میں حاصل کی۔ بنگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ سے لاطینی سیکھی۔ کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کالج پٹنہ سے امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں شاہ رشید اللہ صاحب کی صاحبزادی نجم النسا بیگم سے شادی ہوئی۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ ۱۹۲۷ء میں ٹرائی پوس اور ۱۹۲۹ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۳۶ء میں انھوں نے تحقیقی رسالہ معیار جاری کیا جس کے چند شمارے ہی منظرِ عام پر آئے۔

اُن کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی ادبی ایوارڈ اور اعزازات سے نوازا گیا۔ صدر جمہوریہ ہند نے پدم شری اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے گولڈ میڈل دیا۔

مطبوعات: معیارستان، اشتر و سوزن، دیوان جوشش، دیوان رضا، قطعات دلدار اور تذکرہ ابن طوفان فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ



کلیم الدین احمد

پیدائشی نام: رحیم الدین احمد

پیدائش: ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء بروز منگل شام ساڑھے چھ بجے۔ خواجہ کلاں۔ پٹنہ

تعلیم: پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۰ء میں ایم اے۔

بعد ازاں کیمبرج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۳ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں پروفیسر۔ ۱۹۴۷ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بہار، ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج کے پرنسپل، ۱۹۵۸ء میں ڈائرکٹر آف پبلک

انسٹرکٹر بہار ۵۸ سے ۶۷ تک خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر۔ ۱۹۷۲ء میں بھاگلپور یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر ـــــ معاصر کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں بہار اُردو اکاڈمی کے ڈپٹی چیرمین۔ ترقی اُردو بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ اُردو انگریزی ڈکشنری پراجیکٹ کے چیف ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۷۴ء میں غالب ایوارڈ، ۱۹۸۰ء میں بہار اُردو اکاڈمی ایوارڈ اور میر ایوارڈ۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو پٹنہ میں انتقال۔

مطبوعات: اُردو شاعری پر ایک نظر ۱۹۴۳ء، اُردو تنقید پر ایک نظر ۱۹۴۱ء، اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی ۱۹۴۴ء، عملی تنقید، اقبال ایک مطالعہ، ادبی تنقید کے اصول، میری تنقید ایک بالاویلا مغربی تنقید، شخصہائے گفتنی، اپنی تلاش میں۔

شعری مجموعے: ۴۲ نظمیں۔ ۲۵ نظمیں۔

تالیف و ترتیب: گلِ نغمہ، کلیاتِ شاد، گلزار ابراہیم، تذکرہ شورش و تذکرہ عشقی (دو جلدیں) تذکرہ بینی نراین جہاں۔



گوپی ناتھ امن

۱۶ ستمبر ۱۸۹۸ کو لکھنؤ میں ولادت۔

۱۹۰۴ میں امین آباد اسکول میں داخل ہوئے۔

۱۹۱۶ میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک

۱۹۱۷ میں سول کورٹ میں ملازمت اختیار کی۔ تین ماہ بعد میونسپل بورڈ لکھنؤ کے محکمہ صحت سے وابستہ ہوئے اور لگ بھگ سات برس تک وہاں ملازم رہے۔

گاندھی جی سے متاثر ہو کر اپنا تخلص امن رکھا۔ ۱۵ فروری ۱۹۲۲ کو گرفتار ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں میرٹھ میں مختار شپ کی پریکٹس شروع کی ۳۲۔ ۱۹۲۵ کے دوران غازی آباد میں وکالت شروع کی اور کانگریس کی تنظیم اور پرچار میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۷ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۲ میں چھ ماہ کی سزا ہوئی اور وہ گڑھ جیل میں رکھے گئے۔ ۱۹۳۶-۱۹۳۳ کے دوران ہفتہ نامہ تیج کے

ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہے۔ ۱۹۴۶ میں روزنامہ تیج کے ایڈیٹر ہوئے۔ ۴۷-۱۹۳۴ کے دوران صوبۂ دہلی کانگریس کے پرچار سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۶ میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۲ میں گرفتاری اور ڈیڑھ برس تک فیروز پور جیل میں نظر بندی۔ ۵۱-۱۹۴۸ میں دہلی اسٹیٹ کے پریس آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۵۳-۱۹۵۲ میں دہلی اسٹیٹ اتھارٹی کے چیرمین ہوئے۔ ۵۴-۱۹۵۳ میں دہلی سٹیٹ کے وزیر ترقیات ہوئے۔ ۱۹۵۵ میں روزنامہ سنسار کے مدیر اعلیٰ ہوئے۔ ۶۶-۱۹۵۸ دہلی کی تعلقات عامہ کمیٹی کے چیرمین ہوئے۔ ۱۹۷۷ میں صدر جمہوریہ نے پدم بھوشن کا اعزاز دیا۔ بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہے۔

۴ر جولائی ۱۹۸۴ کو دہلی میں وفات۔

مطبوعات: کانگریس کا پچاس سالہ کام ۳۵ کاروان منزل ۱۹۵۱ (مجموعہ کلام) چورنگ ۴۳ (مجموعہ کلام) نیا چمن ۴۶ (ہندی میں اردو شعراء کا تذکرہ) اردو ساہتیہ کا اتہاس ۵۲ (ہندی میں) راجندر پرشاد، سبھاش چندر بوس، جواہرلال نہرو، اور سردار پٹیل کی سوانح عمریاں برائے تعلیم بالغان۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد (ترجمہ)

محمد صادق

پیدائش: ۱۸۹۸ء پشاور۔ وفات: ۱۷ر جون ۱۹۸۴ء لاہور (پاکستان)

گورنمنٹ کالج لاہور میں لگ بھگ ۲۷ برس انگریزی کے استاد رہے۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔

مطبوعات: تاریخ ادب اردو (انگریزی) محمد حسین آزاد۔ اور بیسویں صدی کے ادیب۔

مرزا ظفر الحسن

پیدائش: ۳ر جون ۱۹۱۶ء سنگاریڈی حیدرآباد دکن

وفات: ۴ر ستمبر ۱۹۸۴ء کراچی

مطبوعات: محبت کی چھاؤں (افسانوں کا مجموعہ) ذکر یار چلے، پھر نظر میں پھول مہکے، اور دکن اداس ہے یارو، صلیبیں میرے دریچے کی، متاع لوح وقلم، عمر گزشتہ کی کتاب، فرض دوستاں، خون دل کی کشید، یاد مہرباں

نازش پرتاپگڈھی

نام: شیخ محمد احمد

پیدائش: ۱۲؍جولائی ۱۹۲۴ء پرتاپگڈھ (اتر پردیش)

تعلیم: انٹرمیڈیٹ، ادیب کامل۔

۱۹۳۷ء میں جب گورنمنٹ ہائی اسکول پرتاپگڈھ میں ساتویں جماعت کے طالبِ علم تھے تو شاعری کی ابتدا کی اور سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہوتے۔ ۱۹۵۰ء میں کنبے کے سبھی افراد پاکستان چلے گئے اور انہوں نے وہیلر اینڈ کمپنی میں ریلوے بک اسٹال کی ایجنسی کو ذریعہ معاش بنایا۔

مطبوعات: لکیریں ۱۹۷۲ء، زندگی سے زندگی کی طرف ۱۹۷۶ء، قدم قدم، متاعِ قلم ۱۹۷۳ء، جہاں اور بھی ہیں ۱۹۷۸ء، نیا ساز نیا انداز، درد تہ جام ۱۹۸۱ء۔



نشور واحدی

نام: حفیظ الرحمٰن ولد جمیل احمد یکتا

پیدائش: ۱۵؍اپریل ۱۹۱۲ء چندایر، آبائی وطن موضع چک حاجی شیخ پور پرگنہ سکندر پور ضلع بلیا۔

مصباح العلوم الٰہ آباد اور مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ ۱۹۳۰ء میں ضیا العلوم کانپور میں تقرر۔ ۱۹۳۹ء میں ادب عالیہ کی بنیاد رکھی۔ دس بارہ سال بعد کھتری کالج کانپور میں ملازمت۔ ۷۳-۱۹۴۷ء حلیم مسلم کالج میں درس و تدریس پر مامور۔ ۱۹۷۷ء میں اتر پردیش اُردو اکاڈمی سے ایوارڈ۔

مطبوعات: صہبائے ہند ۱۹۳۹ء، (مثنوی) شورِ نشور ۱۹۴۲ء (نظموں کا مجموعہ) آتش و نم ۱۹۴۶ء (غزلوں و نظموں کا مجموعہ) انتخابِ کلامِ نشور، جواہر پارے (اساتذہ سخن کا کلام اور تصویروں کا گلدستہ) دانشِ آخرالزماں (تصوف پر نثری رسالہ) سوادِ منزل ۱۹۶۸ء (غزلوں کا مجموعہ) فروغِ جام، گل افشانی گفتار ۱۹۷۴ء (انتخاب غزلیات) سلکِ شبنم ۱۹۷۸ (انتخاب غزلیات) تاریخ فلسفہ خودی ۱۹۷۹ء

یوسف دہلوی

۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو مشہور ماہنامہ شمع کے بانی ور مدیر اعلیٰ کی ۸۲ سال کی عمر میں نئی دہلی میں وفات ہوگئی اور اسی دن انھیں قوم پنجابیاں کے قبرستان باغ شیدی گوہر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

وہ ایک ممتاز صحافی، غریبوں کے ہمدرد اور محنت کش انسان تھے اور اپنی محنت و ایمانداری سے انھوں نے اتنی ترقی کی تھی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے ۱۹۳۹ء میں بڑی بے سروسامانی کے عالم میں ماہنامہ شمع کا اجرا کیا جس نے قلیل مدت ہی میں اتنی ترقی کی کہ اسکی شہرت و مقبولیت ملکی سرحدیں پھلانگ کر تمام دُنیا میں پھیل گئی۔ اشاعت کے وقت اس جریدے کے فی پرچہ کی قیمت دو آنے اور سالانہ قیمت ایک روپیہ تھی۔ ۱۹۴۶ میں انھوں نے اس پرچے کو آفسیٹ کی طباعت سے مزین کیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۵۴ء میں اسے برّ صغیر کا پہلا اُردو جریدہ بننے کا شرف حاصل ہوا جس کی اشاعت ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے بچوں کے لیے "کھلونا" اور خواتین کے لیے ماہنامہ "بانو" جاری کیا۔ ۱۹۵۹ میں انھوں نے شمع کے ہندی ایڈیشن سشما کا اجرا کیا جس کا آج ہندی کے مقبول ملی جریدوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے قریب انھوں نے فلم پروڈکشن اور ڈسٹری بیوشن کا کام شروع کیا لیکن کچھ عرصہ بعد گھاٹا ہو جانے کی وجہ سے اس کاروبار کو بند کر دیا۔ ۱۹۶۶ میں انھوں نے ماہنامہ "مجرم" اور ۱۹۶۷ء میں "شبستان" "اردو ڈائجسٹ" جاری کیا۔

حافظ صاحب نے اُردو کی ترویج و اشاعت کی غرض سے دو اشاعتی ادارے "شمع بک ڈپو" اور مکتبہ دینیات قائم کئے جہاں سے سینکڑوں کتابیں شائع کی گئیں۔ انھوں نے دہلی کا معروف دواخانہ خرید کر شمع لیبارٹریز کے نام سے یونانی ادویات کا کاروبار بڑے پیمانے پر شروع کیا۔

کتابیات

۱۹۸۵ء میں شائع کتابوں کی دستیاب تفصیلات

نام کتاب	مصنف	سائز	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کار
اپنا دامن اپنی آگ (افسانے)	کیول دھیر				
اجنبی صدا	منیر سیفی	ڈیمائی	۸۰	۲۰ روپے	بک امپوریم پٹنہ
اچھی کہانیاں				۲/۵۰ 〃	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی
احتشام حسین حیات و شخصیت اور کارنامے	فدا مصطفیٰ ندوی			۴۰ 〃	
ادب اور وابستگی	سید عبدالباری				
ادبی زائچے	ویریندر پرشاد			۲۰ 〃	
ادب گزیدہ (مضامین)	معین اعجاز		۱۲۸	۲۵ 〃	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
ادبی مضامین	نثار اعظمی				
ادبی نثر کا ارتقا	شہناز انجم			۸۰ 〃	
اُردو اسٹیج	ظہیر الدین مدنی			۱۸ 〃	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
اُردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	مہ ناز انور				
اُردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا (تنقید)	رام لعل	ڈیمائی	۱۴۶	۵۰ 〃	سیمانت پرکاشن نئی دہلی
اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	سید سجاد حسین	ڈیمائی	۴۷۲	۴۰ 〃	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
اُردو کا آسان قاعدہ	عطیہ رشید			۳/۵۰ 〃	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
اُردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل بیگ			۴۵ 〃	
اُردو مختصر افسانے کا ارتقا	نسیم آرا				
ارمانوں کی سیج (ناول)	الف ایم وسیم	کراؤن	۴۳۰	۳۲ 〃	پرنس بک ڈپو نئی دہلی
آزادی کی نظمیں	سید حسن	ڈیمائی	۲۰۰	۱۰ 〃	اتر پردیش اُردو اکادمی
اسٹیج ڈرامہ	آفاق احمد				

اسلوبیاتِ میر	گوپی چند نارنگ	ڈیمائی	۹۲	۲۵	〃	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی			۱۵	〃	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
اظہارِ غم	پیام سہالوی			،		
اظہار و افکار (مضامین)	نامی انصاری			۳۰	〃	
اعتقاداتِ سرسید اور شرر بدایونی	بی طیب بخش بدایونی			-		
افسانۂ لکھنؤ	محمود نقوی					
اقبال نئی تحقیق	سید شکیل احمد					
الف تا شا (طنز و مزاح)	نریندر لوتھر					
الہاماتِ مست	دینا ناتھ مست کشمیری	ڈیمائی	۲۴۸	۳۵	〃	ناشر/مصنف: جی-۲۰ / مالویہ نگر نئی دہلی
آمد (شاعری)	بشیر بدر	ڈیمائی	۱۶۸	۳۰	〃	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	مالتی شنکر	۰		۱۱	〃	پبلیکیشنز ڈویژن
امیر خسرو	سید غلام ثمنانی			۹/۲۵		نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی
اندرا گاندھی	خواجہ احمد فاروقی	ڈیمائی	۴۸	۱۸	〃	گلستان پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ
انشاء اللہ خاں انشا	شام لال کالڑا عابد پشاوری	ڈیمائی	۶۹۰	۳۴	〃	اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ
انشائیہ پچیسی (مضامین)	جاوید وششٹ	کراؤن	۱۲۴	۴۰	〃	سلوجہ پبلیکیشنز نئی دہلی
انقلاب زندہ باد	منور سادیوان					
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	زکی کاکوروی					
انگلیوں سے خون (شاعری)	سید علی ظہیر			۲۵	〃	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
انقلابِ وطن	پرتاپ چندر آزاد			۲۰	〃	سوراجیہ پرکاشن بریلی
آواز (ناول)	آمنہ ابوالحسن		۱۶۴	۲۵	〃	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
آئینۂ غزل (شاعری)	تاج پیامی	ڈیمائی	۱۱۲	۲۰	〃	مصنف
اے عمر گریزاں (ناول)	رضیہ جمیل	کراؤن	۲۹۰	۳۰	〃	ادبی دنیا دہلی
اینقہ (ناول)	سعیدہ بیگم	کراؤن	۳۴۴	۳۵	〃	کامران بک سنٹر دہلی
بہارِ شوق	ایس این سنہا					
بہاریں پھر بھی آتی ہیں (ناول)	سہیلا فاروقی	کراؤن	۳۴۴	۳۵	〃	اہلووالیہ بک ڈپو نئی دہلی
بھرتری ہری (انتخاب)	یوسف ناظم	ڈیمائی	۵۶	۵	〃	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
بھولی لڑکی	صالحہ خاتون					

بیسویں صدی میں اردو قصیدہ نگار	محمد کمال الدین					
پاکستان ایکسپریس	خشونت سنگھ	کراؤن	۱۶۰	۳۰	”	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
پرتو تحقیق	آصف زمانی			۴۰	”	
پریم چند اور تصانیف پریم چند	مانک ٹالہ	ڈیمائی	۲۲۴	۴۵	”	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
پلک پلک تشنہ (غزلیات)	صابر زاہد		۸۸	مفت		ناشر مصنف
پھانس (ناول)	ریحانہ زیدی	کراؤن	۴۴۸	۴۵	”	کامران بک سینٹر دہلی
پھل پھول اناج (مضامین)	اندرجیت لال	کراؤن		۲۵	”	سلوجہ پبلیکیشنز نئی دہلی
پھول اور شبنم	شبنم گورکھپوری					
تاریخ انگلینڈ	سید محمد عزیز الدین حسین			۹	”	نئی آواز نئی دہلی
تاریخ اور افسانہ	نزہت سمیع الزماں					
تحفۃ السرور	شمس الرحمٰن فاروقی	ڈیمائی	۲۵۲	۷۵	”	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
تذکرہ شعرائے فرخ آباد	شکنتلا موج	ڈیمائی	۲۵۶	۴۰	”	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
ترجمان الحدیث	سید محمود حسن			۳۵		مرکزی مکتبہ اسلامی
تصوف (شاعری)	عزیز وارثی		۱۲۰	۲۵		انجمن ترقی اردو، نئی دہلی
تعلیم اور اس کے مسائل	محمد اکرام خاں	ڈیمائی		۳۶	”	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	ڈیمائی	۷۶۷	۲۵	”	اردو ترقی بیورو
تم ہی تم (شاعری)	منصور لکھنوی					
تمیز تحریر	محمد منصور عالم	ڈیمائی	۲۰۰	۴۰	”	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
تیری خوشبو تیرے خواب	ساحل سلطان پوری					
ٹیپو سلطان	شیخ علی ظفر علی نظامی			۸/۵۰	”	نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی
جائزے	مظفر حنفی			۴۵	”	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
تیرے رخ کی تصویر	رحمٰن حمیدی	ڈیمائی	۹۶	۱۰	”	کلچرل اکیڈمی، گیا
جدید اسباب الامراض	جمیل احمد					
جدید ہندی ادب کے معمار	نجم الدین					
جزیرہ (ناول)	م ک مہتاب	کراؤن	۱۸۰	۲۵	”	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
جلتے توے کی مسکراہٹ	انور ندیم	ڈیمائی	۲۸۸	۳۰	”	ہم لوگ پبلشرز لکھنؤ
جلوہ بینش	مظہر عزیز					

جو میرے وہ راجہ کے نہیں	صغرا مہدی					
حرفِ آرزو (شاعری)	ڈی. اے. سرلیش قربان					
حساب لفظ لفظ کا	کیف احمد صدیقی			۳۰	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
حضرت بابا شیخ فرید گنج شکر	گوربچن سنگھ					
حضرت شاہ اکبر دانا پوری حیات اور شاعری	طلحہ رضوی برق			-		
حکم نامہ	سلطان سبحانی					
خطا معاف	شادان بدایونی	ڈیمائی	۲۰۸	۲	"	پبلشر/مصنف
خطرناک سفر	ریاض احمد خاں					
خواب کا در بند ہے (شاعری)	شہریار			۵۰		
خطوط مشاہیر بنام مسعود حسن رضوی	نیر مسعود	ڈیمائی	۲۹۲	۳۴	"	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
دامنِ شفق	شفق وارثی					
دبستان امیر مینائی	عرفان عباسی					
درد دل (افسانے)	ستارہ جعفری			۱۸	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
درد کے رشتے	شاہد بدایونی					
دریا کی رانی	اشرف صبوحی			۲	"	مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی
دستاویز (شاعری)	شوق بجنوری			۴۰	"	انجمن ترقی اردو نئی دہلی
دشت نوا	وقار سروانی					
دنیا میرا گاؤں	خواجہ غلام السیدین			۶۰	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
دنیا میں اسلام اور مسلمان	محمد نسیم قریشی					
دمِ آتش (شاعری)	سریر کابری	ڈیمائی	۱۶۸	۳۰	"	بہار اردو اکادمی
دوسری کروٹ (افسانے)	دریندر پٹواری	ڈیمائی	۱۵۲	۳۰	"	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	زہرہ مشیر			۴	"	مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی
دھوپ سایہ اور میں (شاعری)	وقار واثقی	ڈیمائی	۸۰	۱۵	"	ناشر/مصنف
دیوان غزلیات سودا	ہاجرہ ولی الحق					
رازونیاز (شعری مجموعہ)	راز لائل پوری		۱۶۰	۲۵		مکتبہ شانِ ہند دریا گنج نئی دہلی
رام لال فن اور شخصیت (تنقیدی مضامین)	نریندر ناتھ سوز	ڈیمائی	۱۵۸	۵۰		سیمانت پرکاشن نئی دہلی
رجز (شاعری)	امیر قزلباش					

رسول اکرمؐ اور یہود حجاز	برکات احمد			۴۰	،،	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
رسول کریمؐ کی جنگی اسکیم				۱۷	،،	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
رشتوں کا زہر (ناول)	مینا ناز	کراؤن	۲۴۰	۲۵	،،	کامران بک سنٹر دہلی
رشحات قیصری	مسعود انور علوی					
رگ سنگ (شاعری)	اختر نظمی	کراؤن	۸۰	۵	،،	ناشر مصنف
روشن الاؤ	سیفی سرونجی	کراؤن	۱۱۲	۱۵	،،	انتساب پبلیکیشنز، سرونج
رہگزر جمال	محمد منیر فاروقی					
ریزہ مینا	توکل حسین نیر سلطانپوری					
زندہ کول	اے این رینا			۴	،،	ساہتیہ اکادمی نئی دہلی
سادہ ورق	کمال جائسی					
سارا دن دھوپ (افسانے)	غیاث احمد گدی					
ساحر یادوں کے آئینے میں	کرشن ادیب	ڈیمائی	۱۹۲	۲۵	،،	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
سانحہ رزم	ساجد الرحمن صدیقی			۱۰	،،	مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
سحر سرمد (شاعری)	مالک رام سنوت					
سرمایۂ جاں	حامد مینائی					
سرابوں کی فصل	جنا پرشاد راہی		۵۰	۳۰		
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع			۲۵	،،	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
سماج	نفیس بانو شمع					
سمت سفر	ناوک حمزہ پوری	کراؤن	۱۲۸	۱۲	،،	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
سٹنے داترے	نور الحسنین			۱۵	،،	
سنت سندیش	شانتی سیٹھی					رادھا سوامی
سونا جاگتا (بچوں کے لیے)	نیر مسعود	کراؤن	۴۸	۳	،،	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
سید سلیمان ندوی	عتیق احمد صدیقی			۲۱	،،	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
شاخیں (شاعری)	اسلام پرویز	ڈیمائی	۱۰۴	۱۵	،،	ادارہ فروغ ادب سیتامڑھی
شارینہ (ناول)	محسنہ حبیب	کراؤن	۲۶۰	۲۸	،،	المومالیہ بکڈپو نئی دہلی
شرار جستہ	شرف الدین ساحل	ڈیمائی	۹۶	۱۰	،،	علیم پبلشنگ ہاؤس، ناگپور
شعلے	اے آر خان اختر					

شفق کے پھول	ایم کوٹھیاوی راہی					
شگفتہ سحر	ممتاز نکہت					
شہر غزالاں	رضا امروہوی					
شمیم کرہانی شخصیات اور شاعری	خواجہ علی انجم	ڈیمائی		۴۰	〃	ناشر مصنف
شیخ نظام الدین اولیا	خلیق احمد نظامی			۸/۵۰	〃	نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی
صبح کا بھولا	اشفاق احمد					
صد چاک (شاعری)	دوارکہ راہی	ڈیمائی	۱۲۸	۴۰	〃	ناشر مصنف
صلیب	ظہیر انور	ڈیمائی	۱۲۰	۲۰	〃	بک امپوریم پٹنہ
صلیب کے زخم (ناول)	نوشہ صدیقی	کراؤن	۲۴۸	۲۵	〃	اہلووالیہ بک ڈپو نئی دہلی
طب ہومیو پیتھی	بیتاب علی پوری	کراؤن	۱۴۴	۱۵	〃	ناشر مصنف
طبی مقالات	افتخار الحق					
عروضی اور فنی مسائل (تحقیق)	عنوان چشتی			۶۰	〃	انجمن ترقی اردو نئی دہلی
عشری درجہ بندی	محمود حسن قیصر					
علامہ سید سلیمان ندوی	محمد نعیم صدیقی					
عہد ناظم کتب خانہ داری	مہ جبین اختر					
غذائی مسئلہ کا حل	اے جگت سنگھ					
غزل کی سرگذشت (نثر)	اختر انصاری			۱۷	〃	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
غزل نما	صائم سیانچوری					
فاران کی بلندی سے	مطرب نظامی					
فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق	شعیب اعظمی					
فریب زندگی (ناول)	دلشاد امروہوی	کراؤن	۲۲۲	۲۳	〃	پرنس بک ڈپو نئی دہلی
فصیل (افسانے)	تسکین زیدی	ڈیمائی	۱۵۲	۲۵	〃	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
فیض احمد فیض (تنقید)	کے کے کھلر	ڈیمائی	۱۸۰	۷۵	〃	سیمانت پرکاشن نئی دہلی
قافلہ حیات	حیات سالکی					
قرۃ العین حیدر کا فن	عبد المغنی	ڈیمائی	۲۰۰	۴۰	〃	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
قصہ ہائے رنگ (ترجمہ)	شعیب اعظمی					

قطرہ قطرہ سمندر	فاطمہ وحید جائسی					
قومی تعمیر کی دستاویز	عبدالاحد					
قید حیات و بند غم	شکیل شمسی			۳۰	؍؍	نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی
کالی داس، شخصیت اور فن	شبانہ شمیم					
کرچیں	انور ندیم	ڈیمائی	۱۲۸	۱۵	؍؍	ہم لوگ پبلشرز لکھنؤ
کنارہ (ناول)	سلمیٰ کنول	کراؤن	۵۴۳	۵۰	؍؍	کامران بک سینٹر دہلی
کھلاڑی (ناول)	عظمت رضا	کراؤن	۲۵۶	۲۲	؍؍	پرنس بک ڈپو نئی دہلی
کھنڈرات (ناول)	رام پال		۱۹۲	۳۵	؍؍	دیپک پبلشرز جالندھر
کہرن (شاعری)	ہلال رضوی					
کیا دن تھے	قاضی جلیل عباسی					
گداز شب (شاعری)	معین احسن جذبی			۴۰	؍؍	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
گرد و غبار	کمال انصاری					
گرگٹی بند	ناز کفیل گیلانی	کراؤن	۲۴۴	۲۳	؍؍	اہلو والیہ بک ڈپو نئی دہلی
گزشتہ حیدرآباد	نارائن رائے محبوب			۱۵	؍؍	ادبی ٹرسٹ حیدرآباد
گفتار غالب	مالک رام			۴۸	؍؍	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
گلستان غزل	قمر مرادآبادی					
گلشن نو بہار	سید سلیمان حسین					
گوہر شہزادی	اشرف صبوحی دہلوی			۳	؍؍	مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی
لسانیات کے بنیادی اصول	اقتدار حسین خاں			۴۰	؍؍	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
لغت نویسی کے مسائل	گوپی چند نارنگ			۳۵	؍؍	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
لفظوں کا آسمان (اڑیہ شاعری)	ستیا کانت مہاپاترے/کرامت علی کرامت			۲۰	؍؍	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
لمحوں کا لمس	مہر گیرا					
لمحہ لمحہ جاگی رات	یعقوب راہی					
لوفر (ناول)	آمنہ اقبال	کراؤن	۲۷۲	۲۰	؍؍	اہلو والیہ بک ڈپو نئی دہلی
مالک یوم الدین	ف۔س۔اعجاز	ڈیمائی	۱۲۰	۲۰	؍؍	انشا پبلیکیشنز کلکتہ
متاع فکر	عروج زیدی	ڈیمائی	۱۲۰	۲۰	؍؍	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
متعلقات انشا	عابد پشاوری					

مجاز شخص اور شاعر	مغیثہ عثمانی					
مجاہد آزادی میر واجد علی	مشتاق نقوی					
مجھے گھر یاد آتا ہے (ڈرامے)	شمیم حنفی	ڈیمائی		۲۱	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
مختصر افسانے کا ارتقا	جمال آرا نظامی					
مراۃ المعرفت (شاعری)	عارف سیمابی باکوٹی	ڈیمائی	۲۰۶	۴۰	"	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
مرجھائی کلی (ناول)	زلیخا حسین	کراؤن	۳۲۰	۳۰	"	پرلیس بکڈپو نئی دہلی
مرزا محمد جعفر اوج	سید سکندر آغا					
مرثیہ نگاران اردو	مرزا امیر علی بیگ					
مشرقی بوڑھے	عطاء اللہ پالوی					
مشفق خواجہ	خلیق انجم	ڈیمائی	۱۴۳	۳۰	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
معروف و منکر	سید جلال الدین عمری			۳۵	"	مرکزی مکتبہ اسلامی
مقدمۃ الادویہ	احتشام الحق قریشی					
موسم بھیگی آنکھوں کا	رفیعہ شبنم عابدی			۲۵	"	
مولانا عبدالحی فرنگی محلی حیات اور خدمات	غلام مرسلین					
موم کا شہر	قمر اقبال					
مہدی افادی	فیروز احمد					
مہاتما گاندھی کی کہانی	ایس ڈی ساونت۔ ایس ڈی بادلیکر			۱۰	"	پبلیکیشنز ڈویژن
مہر و نیم (شاعری)	افتخار عارف	ڈیمائی	۱۸۴	۳۰	"	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
میری صدا کا غبار	رفعت سروش					
مینا نے پایا سونا	جگدیش جوشی			۲/۵۰	"	نیشنل بک ٹرسٹ
میں بوند بوند زہر پیتا ہوں (ناول)	موہن لال	ڈیمائی	۸۰	۲۰	"	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی
نامورانِ علی گڑھ	نورالحسن نقوی			۱۵	"	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
نصرت (شعری مجموعہ)	عزیزہ ورثی	ڈیمائی	۱۲۰	۲۵	"	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
نقد بھنوری (تنقید)	حدیقہ بیگم			۲۵	"	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
نقوشِ ماضی	عظمت اللہ خاں					
نکات العروض	ذاکر عثمانی					
نگارِ حکمت (نظمیں)	محمد فضل الرحمٰن	کراؤن	۶۸	۶	"	ادارہ سیاست حیدرآباد

بقیہ صفحہ ۲۳۲ پر



پریس رجسٹرار کی اٹھائیسویں سالانہ رپورٹ "پریس اِن انڈیا ۱۹۸۴" کے مطابق ۱۹۸۳ میں بھارت میں شائع ہونے والے مختلف زبانوں کے اخبارات میں تعداد کے لحاظ سے اُردو اخبارات اور جرائد کا چوتھا مقام تھا سب سے زیادہ اخبارات و رسائل ۵۹۳۷ ہندی میں شائع ہوتے ہیں، دوسرے تیسرے اور چوتھے نمبر پر بالترتیب انگریزی (۳۸۴۴) بنگلہ (۱۵۸۲) اور اُردو (۱۳۷۸) کے اخبارات و جرائد تھے۔

رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۳ میں ہندوستان کے اردو اخباروں کی تعداد اور مجموعی اشاعت دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اشاعت میں یہ اضافہ دو لاکھ ۶۷ ہزار ہے۔ اس اضافے کے ساتھ ان اخباروں کی اشاعت ۲۲ لاکھ ۶۹ ہزار سے بڑھ کر ۲۵ لاکھ ۳۶ ہزار ہوگئی ہے۔ اِن اخباروں کی تعداد ۱۹۸۷ کی ۱۳۲۰ سے بڑھ کر ۱۳۷۸ ہوگئی ہے اس تعداد کی بدولت ملک کی اردو صحافت کو ان پانچ زبانوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے جن کے اخباروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ زیر جائزہ سال میں اردو اخبارات کی ایک لاکھ سے زیادہ اشاعت رکھنے والی ریاستوں کی تعداد بڑھ کر نو ہوگئی ہے جو کہ گذشتہ سال یعنی ۱۹۸۲ میں آٹھ تھی۔ اس سلسلے کی نویں ریاست جموں و کشمیر ہے جس کے اُردو پریس کی اشاعت پہلی بار بڑھ کر ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ جبکہ ۱۹۶۵ میں اس ریاست میں اخباروں کے سروے کا کام شروع ہوا تو اس کے اُردو اخباروں کی مجموعی اشاعت صرف ۴۲ ہزار تھی

اضافے کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ مختلف ریاستوں کے روزناموں کی اشاعت بتدریج بڑھ رہی ہے۔ ان کی مجموعی تعداد نو لاکھ پچاس ہزار ہو چکی ہے جبکہ پچھلے سال یہ سات لاکھ ۲۶ ہزار تھی روزناموں کی تعداد بھی جو پچھلے سال ۱۳۴ تھی اب ۱۴۸ ہو گئی ہے اور اب ہندوستان کے اردو روزناموں کی تعداد پورے ملک میں ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

۱۹۸۳ء میں اخباروں کی تعداد ۲۰۷۵۶ تھی جو کہ ۱۹۸۲ کی ۱۹۹۳۷ کے مقابلے میں ۴.۱ فی صد زیادہ تھی۔ اخبارات کی مجموعی اشاعت ۱۹۸۲ء میں ۵۰۰۹۴۰۰۰ تھی جو ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۵۵۳۹۱۰۰۰ ہو گئی یعنی اشاعت میں ۱۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ زیر تبصرہ سال میں ۶۰۷ نئے اخبارات نے اشاعت شروع کی جن میں سے ۷۰ روزنامے اور ۱۴۰ ہفتہ وار اخبارات تھے۔ روزانہ اخبارات کی تعداد بڑھ کر ۱۴۲۳ ہو گئی جو ۱۹۸۲ء میں ۱۳۳۴ تھی۔ اسی طرح روزانہ اخبارات کی اشاعت بڑھ کر سالانہ ۱۶۷۳۱۰۰۰ ہزار ہو گئی جو کہ گذشتہ سال ۱۴۸۷۰۰۰ تھی اور اس طرح اشاعت میں ۱۲.۶ فی صد کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۳ میں ملک میں ۱۹۲ بڑے، ۴۲۷ درمیانے اور ۳۵۶۷ چھوٹے پیمانے کے اخبارات تھے۔ جن کی اشاعت بالترتیب ۴۳۰۰۰، ۲۸،۲۰۰۰۰، ۱،۱۵،۶۱۰۰۰ اور ۲۰۹۸۷۰۰۰ کاپیاں تھیں۔

کلکتہ کا بنگالی روزنامہ آنند بازار پتریکا جس کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوتا ہے ۴۰۲۴۹۱ کاپیوں کی اشاعت کے لحاظ سے اس سال کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ کلکتہ کا ہی ایک اور بنگالی اخبار جگانتر ۳۲۷۵۴۰ کی اشاعت سے دوسرے نمبر پر تھا۔ انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس جو دس مقامات سے شائع ہوتا ہے کثیر ایڈیشنوں والے اخبارات میں ۵۶۷۸۰۱ کاپیوں کی اشاعت سے پہلے درجے پر تھا۔ انگریزی کا ہی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا جس کے تین ایڈیشن ہوتے ہیں ۵۳۹۵۶۵ کاپیوں کی اشاعت سے دوسرے درجے پر تھا۔ اشاعت کے لحاظ سے تیسرا مقام ملیالی اخبار ملیالم منورما کو حاصل رہا جو کالی کٹ، کوچین اور کوٹائم سے شائع ہوتا ہے اور جن کی مجموعی اشاعت ۵۰۷۶۵۷ ہے۔ جرائد میں سے ملیالی ہفتہ وار ملیالم منورما جو کوٹائم سے شائع ہوتا ہے ۶۴۸۵۲۴ کاپیوں کی اشاعت سے ۱۹۸۳ کا سب سے کثیر الاشاعت جریدہ تھا۔ دوسرا مقام مدراس کے تامل ہفتہ وار کمدم کا تھا جس کی اشاعت ۵۸۸۳۵۰ تھی۔ ۱۹۸۳ء میں ۹۱ زبانوں میں اخبارات و رسائل شائع ہوتے تھے جن میں تعداد کے لحاظ سے ہندی اخبارات و جرائد سب سے زیادہ تھے۔

بمبئی سے شائع ہونے والا گجراتی روزنامہ "بمبئی سماچار" سب سے پرانا اخبار تھا۔ یہ اخبار ۱۸۲۲ میں شروع ہوا تھا۔ کل ملا کر ۳۵ اخبارات ایسے تھے جو ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے شائع ہو رہے تھے۔ اُردو میں صرف ایک ہی روزنامہ مشیر دکن حیدر آباد ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے شائع ہونے والا اخبار ہے۔

مذکورہ بالا رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۳ میں اُردو کے کچھ اہم اور اشاعت کے لحاظ سے قابل ذکر اخبارات و رسائل درج ذیل ہیں۔ ان میں سے بعض اخبارات و رسائل کی اشاعت مزید بڑھ گئی ہے۔

آزاد ہند کلکتہ	۱۱۶۱۰	انقلاب بمبئی	۲۵۰۷۵
اقراء کلکتہ	۱۲۸۳۰	اورنگ آباد ٹائمز اورنگ آباد	۱۸۳۰۰

آزاد ہند کلکتہ	۲۱۲۱۰	قومی مورچہ وارانسی	۱۲۸۸۰
آفتاب جدید بھوپال	۱۰۷۱۲	کلام مشرق کلکتہ	۱۳۵۰
برائٹ نیس مدراس	۱۱۷۹۵	مشرقی آواز گورکھپور	۱۳۷۷۶
بھاگیہ نگر ٹائمز حیدرآباد	۱۲۵۰۰	ہند سماچار جالندھر	۷۲۰۰۷
پرتاپ دہلی	۲۳۳۰۹	**ہفتہ وار۔**	
پرتاپ جالندھر	۱۰۳۶۹	بلٹز بمبئی	۳۸۲۲۷
تیر و نشتر کانپور	۱۱۳۵۰	نشیمن بنگلور	۴۷۳۵۳
رفعت کانپور	۱۲۸۰۰	نئی دنیا	۳۰۸۲۸
روزانہ ہند کلکتہ	۱۴۴۹۰	**ماہنامے۔**	
سیاست جدید کانپور	۱۱۷۸۹	بیسویں صدی دہلی	۳۲۶۹۱
عصر جدید کلکتہ	۱۴۰۵۷	خاتون مشرق دہلی	۱۸۵۴۲
غازی کلکتہ	۱۴۰۴۳	روبی دہلی	۳۸۱۲۵
قومی آواز دہلی	۲۲۵۰۰	شمع دہلی	۱۰۰۶۶۷
قومی آواز لکھنؤ	۲۴۲۴۱	فلمی ستارے دہلی	۱۴۷۹۰

	تعداد			تعداد اشاعت (ہزاروں میں)		
	روزنامے	رسائل	کل	روزنامے	رسائل	کل
بڑے اخبار						
ایک لاکھ سے زائد شائع ہونیوالے	-	۱	۱	-	۱۰۱	۱۰۱
۵۰۰۰۱ سے ۹۹۹۹۹	۱	-	۱	۷۳	-	۷۳
۲۵۰۰۱ سے ۵۰۰۰۰	۴	۵	۹	۱۰۹	۱۸۷	۲۹۶
درمیانے اخبار						
۱۵۰۰۱ سے ۲۵۰۰۰	۶	۵	۱۱	۱۲۷	۸۸	۲۱۵
چھوٹے اخبار						
۵۰۰۱ سے ۱۵۰۰۰	۶۲	۶۴	۱۲۶	۵۶۱	۵۶۴	۱۱۲۵
۲۰۰۱ سے ۵۰۰۰	۱۴	۷۴	۸۸	۴۷	۲۴۷	۲۹۴
۲ ہزار سے کم شائع ہونے والے	۱۹	۳۱۶	۳۳۵	۳۳	۳۹۹	۴۳۲
	۳۶	۴۶۵	۵۷۱	۹۵۰	۱۵۸۹	۲۵۳۶

۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والے کچھ اخبارات ورسائل

روزنامہ

ایثار	شاہد رام نگری	ایگزی بیشن روڈ۔ پٹنہ
پروین	رضا مہدی	حیدرآباد
قومی کارواں	مائل صدیقی الوارثی	مرادآباد
مشرقی آواز	نازانصاری	مٹیا محل دہلی
معیارِ حق	اے۔ڈی راجہ بھیا	دھولیہ
نیارا بھارت	جسونت سنگھ باوا	لدھیانہ پنجاب
وادی کی آواز	غلام نبی شیدا	سری نگر کشمیر

ہفتہ وار

آبگینہ	گورچرن سنگھ رہبر	جموں
بازگشت	کشوری منچندہ	۱۰۵ پرتاپ گڑھ جموں
بیریا	مہدی حسن رضوی	کوتوالی روڈ حیدرآباد
پراٹھتی کے		حیدرآباد
پرنس	قادری ظفر صادق	۱۵۸/۲ مینا پورہ مالیگاؤں
		پیلی بھیت
جنگجو	الیس ایچ نقوی	
-مازدکن	محمد باقر حسین شاد	سالار جنگ مارکیٹ دیوان دیوڑھی حیدرآباد
سیکولر ٹیمنم	میر فصاحت علی	ظفر گڑھ حیدرآباد
سیکولر محاذ	ریاض عظیم آبادی	پٹنہ
سہارا	اطہر عزیز	بھونیشور (اڑیسہ)
فلم ایڈوانس	کے۔این اقبال	سپکن روڈ۔بنگلور
کشمیر نامہ	ظفر معراج	ریزیڈنسی روڈ۔سری نگر
پوستہ آرگن	محمد ابراہیم محمد قاسم انصاری	بن اسلام پورہ۔مالیگاؤں۔

۱۹۸۴ میں شائع ہونے والے کچھ اخبارات و رسائل

روزنامہ

انوارِ قوم	زبیر احمد فاروقی - بانس منڈی - کانپور (یوپی)	
آئینہ حیدرآباد	خواجہ علی خاں سردار	غازی بنڈہ حیدرآباد
برائٹ لنس	سید محمد ابراہیم - بیری ملیپن اسٹریٹ، مدراس (تامل ناڈو)	
بہمنی نیوز	عزیز اللہ سرمست - گلبرگہ حیدرآباد (آندھرا پردیش)	
سفیرِ نو	ایم حفیظ اللہ	۱۸ - تلسی پور - الہ آباد (یوپی)
عوام	انور دہلوی	اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
گرم ہوا	——	مظفر پور (بہار)
نیرِ اعظم	شکیل حسن	نواب پورہ - مراد آباد - (یوپی)

ہفتہ وار

آج اور کل	بابر صدیقی	تکیہ روشن دل، یاقوت پورہ، حیدرآباد (آندھرا)
اردو ایکشن	حافظ ماجد حسین	کلول پارک حیدرآباد
الانصاف	محمد ہاشم پرویز	۳۸ جعفر نگر، مالیگاؤں
الجبل	محمد ارتضیٰ	۲۹ کوتوالی روڈ - بھوپال (ایم پی)
انڈین نیوز	محمد مشتاق حسین	امان نگر، یاقوت پورہ - حیدرآباد (آندھرا)
اودھ بازار	افضال احمد انصاری	۲۲۹/۲۴۹ گوکرن ناتھ روڈ - لکھنؤ (یوپی)
اورنگ	حکمت سلطانہ	پٹنہ - بہار
رشکِ ہند	شکیل احمد	شیو پور تکیہ ٹولی، پٹنہ (بہار)
رہبر فلم		اندرون دارالسلام، حیدرآباد (آندھرا)
رہگذر	محمد عبدالرافع لطیفی - ہمایوں نگر، حیدرآباد (آندھرا پردیش)	

رہنمائے عادل آباد	محسن صدیقی	احتساب منزل بھینسہ ضلع عادل آباد (آندھرا)
سری نگر بلٹن	غلام نبی شاہ نورانی	نور باغ نالہ روڈ، سری نگر (جموں کشمیر)
قومی ارتقا	محمد ابراہیم خاں	پنجہ گٹہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش)
معرکہ	سید اعجاز حسین	چتلا گیٹ، چاوڑی بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶
مگدھ ایکسپریس	سید محمد آصف	شیو پور ٹکیہ ٹولی، پٹنہ (بہار)
ننگل سماچار	کشن داس شرما	مین مارکیٹ، ننگل ٹاؤن (پنجاب)
وائس آف لوان		
وحدت اسلامی	حسین برخوردار	سفارت خانہ ایران ۵ بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی

پندرہ روزہ

حیاتِ نو	قاضی غلام احمد	مچھلی ٹولہ، کانپور (یوپی)
سلسلۂ جنگ	مطیع الرحمٰن نعمانی	ملا حلیم خاں، دربھنگہ (بہار)
صحت و سائنس	ایم آر انصاری	مالیگاؤں
معیارِ حق	ڈی اے راجو بھیا	مولوی گنج دھولیہ
مومن انڈیا	فاروق ارگلی/اشرف علی انصاری	۔ ۹۳ رشید مارکیٹ (ایسٹ) دہلی ۵۱

ماہنامے

العطش	راج کمار چندن	ایف ۷۷، گورودھ بخشی نگر، جموں (جموں و کشمیر)
جرائم	نازش انصاری	دآئی ۳ نیو رنجیت نگر، نئی دہلی
راہ اسلام	———	سفارت خانہ ایران ۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی
قوس	———	گیا، (بہار)
کمالستان	کنور محمد فاروق خاں	۔ ۹۳ رشید مارکیٹ (ایسٹ) دہلی ۱۱۰۰۵۱
مسلم انڈیا	سید شہاب الدین	نئی دہلی

دیگر رسائل

قرطاس (دو ماہی)	ظفر کلیم	مومن پورہ ناگپور
فکر و فن (سہ ماہی)	دھرم پال عاقل	بھاشا و سنسکرتی وبھاگ۔ شملہ

۱۹۸۳ء میں اردو اخبار و رسائل کی صورت حال

	روزنامے	سہ روزہ دوروزہ	ہفت وار	پندرہ روزہ	ماہنامے	سہ ماہی	دیگر	لائنہ	کل
۱۹۸۳ میں جاری کئے گئے	۹	-	۱۴	۴	۴	۲	-	-	۳۳
۱۹۸۳ میں ریکارڈ کئے گئے	۱۱	-	۲۳	۱۰	۷	۲	-	-	۵۳
۱۹۸۳ میں بند کئے گئے	-	-	-	-	۱	-	-	-	۱
ریکارڈ سے ہٹائے گئے	-	-	۱	۲	۲				۵
۱۹۸۳ میں تعداد (اردو)	۱۴۸	۶	۴۷۲	۱۹۴	۳۱۴	۳۰	۱۲	۲	۱۳۷۸
" " " (ہندی)	۴۷۰	۲۷	۲۷۰۹	۹۷۸	۱۴۱۴	۲۴۲	۷۷	۱۹	۵۹۳۶
" " " (انگریزی)	۱۲۳	۱۳	۴۲۸	۳۴۵	۱۵۲۸	۸۳۲	۴۱۵	۱۰۲	۳۸۴۰
تعداد (بنگالی)	۴۴	۸	۴۱۷	۲۷۰	۴۷۵	۲۷۱	۹۱	۶	۱۵۸۲
کل تعداد	۱۴۴۳	۲۴	۴۱۲۲	۲۸۱۷	۷۲۳۲	۱۹۷۹	۸۳۳	۱۹۷۹	۲۰۷۵۸
تعداد اشاعت (اردو)	۹۴۰	۱۰	۸۹۲	۱۸۴	۴۷۰	۳۷	۲	۱	۲۵۳۶
(ہزاروں میں)									
تعداد اشاعت (ہندی)	۴۵۳۷	۲۴	۴۴۷۴	۱۷۶۶	۴۴۷۹	۱۱۳	۵۵	۷	۱۵۴۵۸
تعداد اشاعت (انگریزی)	۳۳۴۹	۱۰	۱۴۷۰	۱۰۸۹	۳۶۲۳	۹۴۹	۳۱۴	۱۲۳	۱۰۹۲۷
تعداد اشاعت (ملیالم)	۱۵۲۸	-	۱۹۹۹	۳۶۴	۱۳۱۵	۱۱	۲۷	۴	۴۹۱۸
تعداد اشاعت (تمل)	۱۰۶۷	-	۲۰۹۰	۴۳۲	۱۰۴۵	۱۲	-	۳	۴۶۴۸
کل تعداد اشاعت	۱۹۷۳۱	۷۱۸	۱۵۳۷۲	۴۹۵۵	۱۵۸۱۷	۱۳۷۴	۳۳۵	۳۹۹	۵۵۳۹۱

۸۳ء میں اردو اخبارات ورسائل کی تعداد اشاعت (ہزاروں میں)

	روزانہ	سہ روزہ	ہفت روزہ	پندرہ روزہ	ماہانہ	سہ ماہی	دیگر	کل
آندھرا	۱۲۲	۱	۱۷۷	۳۲	۲۱	—	—	۳۵۳
اُتر پردیش	۱۴۸	—	۱۰۵	۴۶	۵۹	۱۲	۲	۳۷۲
اڑیسہ	—	—	—	—	—	—	—	—
بہار	۱۲۶	—	۱۷۸	۳	۸	—	—	۳۱۵
پنجاب	۱۲۵	—	۴۴	۹	—	—	—	۱۷۸
تمل ناڈو	۱۸	۶	۱	—	—	—	—	۲۵
جموں وکشمیر	۳۹	—	۷۰	—	۱	—	—	۱۱۰
چنڈی گڑھ	—	—	—	—	۱۱	—	—	۱۱
دہلی	۸۲	—	۹۹	۳۰	۳۴۴	۲۴	—	۵۷۹
راجستھان	۱۲	—	—	—	—	—	—	۱۲
کرناٹک	۶۱	—	۸۸	۱۸	—	—	—	۱۶۷
مدھیہ پردیش	۱۵	—	—	۳	۳	—	—	۲۱
مغربی بنگال	۱۱۱	—	۵۹	۳۱	۱۰	—	—	۲۱۱
مہاراشٹر	۴۴	—	۷۵	۱۰	۱۱	۱	۱	۱۴۲
ہریانہ	—	—	۳	۲	۳	—	—	۸
ہماچل پردیش	—	—	—	—	—	—	—	—
دیگر								
کل	۹۴۰	۱۰	۸۹۲	۱۸۴	۴۷۰	۳۷	۳	۲۵۳۶

۱۹۸۳ میں ریاستوں سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل

ریاست	روزانہ	سہ روزہ	ہفت روزہ	پندرہ روزہ	ماہانہ	سہ ماہی	سالانہ	دیگر	کل
آندھرا پردیش	۲۰	۱	۱۷۰	۴۷	۲۶	۲	-	-	۲۶۶
اترپردیش	۱۸	۴	۱۳۲	۲۴	۷۵	۹	-	۲	۲۶۴
اڑیسہ	-	-	-	-	۱	-	-	-	۱
بہار	۱۹	-	۵۷	۷	۶	۱	-	۱	۹۱
پنجاب	۱۳	-	۴۹	۲۰	۲۲	-	-	-	۱۰۴
تمل ناڈو	۲	۱	۵	-	۱				۹
جموں و کشمیر	۲۳	-	۹۰	۸	۶	-	-	۱	۱۲۸
چنڈی گڑھ	-	-	۲	-	۲	-	-	-	۴
دہلی	۱۰	-	۵۲	۴۳	۱۱۳	۹	-	۲	۲۲۹
راجستھان	۲	-	۳	۲	۳	-	-	-	۱۰
کرناٹک	۱۱	-	۲۰	۷	۸	۱	-	-	۴۷
مدھیہ پردیش	۵	-	۲	۲	۳	-	-	-	۱۲
مغربی بنگال	۱۲	-	۱۷	۹	۱۵	۳	-	-	۵۶
مہاراشٹر	۱۳	-	۶۴	۱۸	۲۷	۴	۲	۶	۱۳۴
ہریانہ	-	-	۷	۵	۶	۱	-	-	۱۹
ہماچل پردیش	-	-	۲	۲	-	-	-	-	۴
کل	۱۴۸	۶	۶۷۲	۱۹۴	۳۱۴	۳۰	۲	۱۲	۱۳۷۸

موضوعات کے اعتبار سے اخبارات کی تعداد

	۱۹۸۰	۱۹۸۱ء	۱۹۸۲ء	۱۹۸۳ء
خبریں	۷۰۴	۷۶۴	۷۶۸	۷۹۰
ادب و ثقافت	۱۸۷	۱۸۹	۱۹۸	۱۹۹
مذہبیات و فلسفہ	۱۰۷	۱۱۲	۱۱۳	۱۷۷
تجارت و صنعت	۵	۷	۷	۸
علاج و صحت	۱۸	۱۷	۱۸	۱۸
فلم	۲۸	۳۷	۲۹	۲۸
سماجی بہبود	۸	-	۶	۶
محنت	۵	۳	۳	۶
تعلیم	۶	۷	۷	۷
قانون اور عوامی انتظامیہ	۱	۲	۱	۱
زراعت اور پشو پالن	۲	۲	۲	-
بچے	۱۱	۱۰	۸	۱۱
سائنس	۳	۳	۳	۳
خواتین	۶	۶	۶	۵
ریڈیو موسیقی	۱	۱	۱	۱
کھیل کود	۷	۷	۸	۷
مالیات اقتصادیات	-	-	-	۱
ٹرانسپورٹ	-	-	-	۱
متفرق	۱۰	۱۵	۱۵	۱۵
کل	۱۱۰۸	۱۱۹۴	۱۱۹۰	۱۲۲۴

اردو اکادمی دہلی کی علمی سرگرمیاں

ایوارڈ کمیٹی کے زیرِ اہتمام اکادمی حسبِ ذیل کام کرتی ہے

★ صاحبِ فن قلم کاروں، صحافیوں اور شاعروں کی علمی خدمت کے اعتراف میں اُردو اکادمی ہر سال ایوارڈ دیتی ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء کے لیے یہ ایوارڈ خواجہ احمد عباس (۱۱۰۰۰ روپے) پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، مفتی شوکت علی فہمی اور پنڈت آنند زتشی گلزار دہلوی کو (۵۱۰۰ روپے) فی کس اکادمی کا تمغہ، سند اور شال (ہر ایک کو) دیے گئے۔

★ نادار اور مستحق قلمکاروں یا پس از مرگ ان کے پسماندگان کی مالی امداد کے طور پر ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران اکادمی نے چار چار سو روپے ماہوار کے حساب سے گیارہ پینشنز دی ہیں۔

★ اُردو اکادمی ہر سال معیاری کتابوں کی تصنیف اور ان کی طباعت پر مصنفین اور ناشرین کو انعام دیتی ہے۔

★ دو دو ہزار روپے کے انعامات دو ناشرین کو ہر سال معیاری کتابوں کی اشاعت پر دیئے جاتے ہیں۔

★ کمیٹی کی سفارش کے مطابق اکادمی نے اس سال سے ضرورت مند اور مستحق قلمکاروں اور شعرا کی ہمّت افزائی کے لیے ان کی تصنیف کی اشاعت میں مالی امداد دینا منظور کیا۔

★ کمیٹی کی سفارش پر اُردو کے ایک نمایاں ماہ نامے کی مالی امداد کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

★ افسانہ ورک شاپ / سمینار کا انعقاد مارچ ۱۹۸۵ء میں غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ہوا جس نے بین الاقوامی نوعیت اختیار کر کے شایانِ شان شہرت حاصل کی۔

★ کمیٹی کی سفارش پر اکادمی نے اس بات کی منظوری دے دی ہے کہ اکادمی اب تک منعقد ہوئے سبھی ادبی پروگراموں بالخصوص افسانہ ورکشاپ / سمینار، داغ دہلوی حیات اور کارنامے اور "دلّی والے" کے موضوعات پر سمینار میں پیش کیے گئے ادبی مضامین، مقالے، تجزیاتی مضامین اور کہانیوں کو کتابی شکل میں شائع کرے گی۔

★ دہلی کی مشترکہ تہذیب کے موضوعات پر دو کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا منصوبہ ہے۔

★ اُردو اکادمی کا ایک خبر نامہ بہت جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔

★ اُردو ادیبوں صحافیوں اور شعرا کی ایک ڈائریکٹری کی اشاعت کا بھی منصوبہ ہے۔

★ ایک ڈائریکٹری ناشرین اور کتب فروشوں کی معلومات پر مشتمل شائع کی جا رہی ہے۔

روزنامے

نام اخبار/رسالہ	سن اشاعت	ایڈیٹر	پتہ
آبشار	۱۹۵۵ء	ابراہیم ہوش	۵، فیرس لین کلکتہ - ۷۲ (مغربی بنگال)
آج	۱۹۵۳	ایس ایس احمد	اسٹیشن بازار مارگ اورنگ آباد (مہاراشٹر)
آج کی آواز	۱۹۷۹	حمید بن وحید	دیوانی ڈیوڑھی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)
آزاد	۱۹۳۹	عبدالہادی رفعت	ابراہیم صاحب اسٹریٹ بنگلور (کرناٹک)
آزاد	۱۹۴۸	کاظم رضوی	تیلیہ نالہ وارانسی (یوپی)
آزاد ہند	۱۹۴۸	احمد سعید ملیح آبادی	۲۲/۱۷، ساگردت لین کلکتہ (بنگال)
آفاق	۱۹۸۱	بدنام رفیعی	نزد پولیس کمشنر آفس پرانی حویلی حیدرآباد (آندھرا)
آفتاب	۱۹۵۷	ثناءاللہ بٹ	بادشاہ ہوٹل بلڈنگ سری نگر (کشمیر)
آفتاب جدید	۱۹۷۸	محمد غضنفر علی خاں	کیشو بھون بھوپال (مدھیہ پردیش)
آفتاب کرناٹک	۱۹۷۶	شفیع احمد شریف	۲۳۴۸ لورڈ نگر میسور (کرناٹک)
آئینہ	۱۹۶۴	ظفر معراج	ریذیڈنسی روڈ سری نگر (کشمیر)
اپنا اخبار	۱۹۸۰	سراج احمد دہلوی	چمپوز بمبئی ۱۷
اتحاد وطن	۱۹۴۶	امین اعجازی	صبا منزل سبزی باغ پٹنہ بہار
اجالا	۱۹۵۳	سوم دت شرما	پکا ڈنگہ جموں (کشمیر)
اجیت	۱۹۷۸	سادھو سنگھ ہمدرد	نہرو گارڈن روڈ جالندھر (پنجاب)
اخبار مشرق	۱۹۸۰	ایم ڈبلیو حق	۱۲ - درگاہ روڈ کلکتہ (مغربی بنگال)
اردو ٹائمز	۱۹۶۱	سعید احمد	۲۴۳ - مولانا آزاد روڈ بمبئی (مہاراشٹر)
اردو رپورٹر	۱۹۶۵	اے ایچ سعید	۹۷ مورلینڈ روڈ بمبئی-۸ (مہاراشٹر)

اُردو کرنٹ	۱۹۷۲ء	وحید ارشد	عقب پکچر پلیس نظام آباد (آندھرا)
افکار	۱۹۵۱ء	مقصود عمرانی	سلطانیہ روڈ ابراہیم پورہ بھوپال
اقرار	۱۹۸۲ء	حیات خاں	۱۴ اے کے ایم لین کلکتہ ۱۴ (مغربی بنگال)
اقبال	۱۹۶۸ء	غلام نبی خیال	ریذیڈنسی روڈ سری نگر (کشمیر)
الجمیعتہ	۱۹۱۵/۱۹۴۷	نازانصاری	گلی قاسم جان دہلی
الحمرا	۱۹۶۶	عتیق اللہ خاں حنفی	بدھ وارہ بازار بھوپال (مدھیہ پردیش)
الکلام	۱۹۲۴	جی ایم غفار جامی	جیا نگر بنگلور (کرناٹک)
امروز	۱۹۵۱	سفیان عالم	۹ بی بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ ۱۳ بنگال)
اِن دنوں	۱۹۷۵/۷۸	سید محمد عاصف	شیو پور ٹکیہ ٹولی پٹنہ (بہار)
" "	۱۹۸۴	سید محمد عاصف	۸۸- نارتھ ایونیو نئی دہلی
انڈین ٹائمز	۱۹۷۴	سید فاروق	لال چوک سری نگر (جموں کشمیر)
انقلاب	۱۹۳۸	خالد انصاری	تاردیو روڈ بمبئی ۳۴ (مہاراشٹر)
انگارے	۱۹۵۴	معین فاروقی	ونایک راؤ معظم جاہی حیدرآباد (آندھرا)
اورنگ آباد ٹائمز	۱۹۶۸/۷۸	عزیز خسرو	بڈی لین اورنگ آباد (مہاراشٹر)
ایڈوائس	۱۹۷۲/۷۴	کامریڈ راج گپتا	لکھدانا بازار جموں (کشمیر)
برائٹنس	۱۹۷۸	سید محمد ابراہیم	پیری میلین اسٹریٹ مدراس ۱۴
بےبس	۱۹۷۰	دھرم پال کپور	محلہ سودن لدھیانہ (پنجاب)
پاسبان	۱۹۴۶	محمد اسمٰعیل تابش،	میناکشی کوائل اسٹریٹ بنگلور (کرناٹک)
پرتاپ	۱۹۱۹/۴۹	ویریندر	نہرو گارڈن روڈ جالندھر (پنجاب)
پرتاپ	۱۹۱۹	کے نریندر	بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
پیغام	۱۹۴۵	وجیہہ الدین	چمن گنج کان پور (اُترپردیش)
پیغام نہرو		سید فصیح الدین	پٹنہ ۷ (بہار)
تیج	۱۹۲۳	وشوبندھو گپتا	نیا بازار دہلی
تسکین	۱۹۷۲ء	مقبول پونچھی	محلہ دلپتیاں جموں (جموں وکشمیر)

تنظیم میسور	۱۹۵۸	ایم ایچ حق	ویسٹ کراس لشکر محلہ بنگلور (کرناٹک)
تیرونشتر	۱۹۶۵	ایم سلیمان	فضل گنج کان پور (اتر پردیش)
تمل ناڈ ٹائمز	۱۹۶۲	عبدالوہاب صوفی	ٹرپلی کین مدراس ۵ (تاملناڈو)
جالندھر رپورٹر	۱۹۶۹	کرشن کمار کالرا	نیو ریلوے روڈ جالندھر (پنجاب)
جدید اردو رپورٹر	۱۹۶۹	اے راشد صغیر احمد	مور لینڈ روڈ بمبئی (مہاراشٹر)
جمہوریت	۱۹۶۹	ایس ای حسنین	۳۰ کیشوراؤ کھاڈے مارگ، جیکب سرکل بمبئی-۱۱ (مہاراشٹر)
چھوٹا اخبار	۱۹۸۳	سعید محمد ابراہیم	۳-پیری ہلین اسٹریٹ مدراس-۱۴
حق بات	۱۹۷۶	شیخ چاند	دودھ باؤلی پالم روڈ حیدرآباد (آندھرا)
حیدرآباد کرناٹک بیدر	۱۹۷۴	ایم اے حمید	گولہ خانہ بیدر (کرناٹک)
خانہ خدا		شریف مصطفےٰ زاہد	میسور (کرناٹک)
خدمت	۱۹۳۹	این ایل وانل	دی بنڈ سری نگر (جموں وکشمیر)
خلافت	۱۹۲۱	زیڈ اے خاں	خلافت ہاؤس موتی شاہ لین بمبئی-۲۷ (مہاراشٹر)
خونناب	۱۹۶۸/۷۴	جی ایم عروج	کھیتھ بایسٹی حیدرآباد (آندھرا)
دیش بدیش	۱۹۷۵	کیدارہ ناتھ سنگھ	دریاپور پٹنہ (بہار)
ذبیح	۱۹۷۱	اسماعیل ذبیح	اندرون یاقوت پورہ حیدرآباد (آندھرا)
راجستھان لیڈر	۱۹۸۲	راجندر کمار	۸۰۷ دریبہ پان جے پور (راجستھان)
راہ رو	۱۹۶۹	شفیق المنیٰ	بھنور پوکھر لین پٹنہ ۴ (بہار)
رجحان	۱۹۵۹	انوپ شرما	بالمقابل منروا سینما لدھیانہ (پنجاب)
رفعت	۱۹۶۶	شفیق احمد انصاری	ہمایوں باغ کان پور (اتر پردیش)
روزنامہ ہند	۱۹۲۹	رئیس الدین فریدی	۱۷ ساگر دت لین کلکتہ (مغربی بنگال)
روشنی	۱۹۴۳	عزیز کاشمیری	مکہ بازار لال چوک سری نگر (کشمیر)
رہبر وطن	۱۹۷۳	محمد فاروق علی	یاقوت پورہ حیدرآباد (آندھرا)
رہنمائے دکن	۱۹۴۹	سید وقار الدین	افضل گنج حیدرآباد (آندھرا)

رہنمائے ملت	۱۹۷۴	سید صادق علی	تنکر باغ حیدرآباد (آندھرا)
رہنمائے کرناٹک	۱۹۶۷/۶۸	سید عبدالقادر	سینیز روڈ بنگلور (کرناٹک)
زبان خلق	۱۹۶۷	خطیب انصاری	۹۲ چاندپورہ گیٹ مالیگاؤں ناسک (مہاراشٹر)
زمیندار	۱۹۶۴/۷۰	محمد شفیع سمنانی	مولانا آزاد روڈ امیراکدل سرینگر (جموں کشمیر)
ساتھی	۱۹۴۹	پرویز انجم	دریاپور پٹنہ
ساز دکن	۱۹۷۲	باقر حسین شاد	چتا بازار حیدرآباد (آندھرا)
سالار	۱۹۶۴	کے رحمان خاں	۲۸۲ کیولری روڈ بنگلور (کرناٹک)
سحر	۱۹۸۲	-	ناندیڑ پربھنی (آندھرا)
سرینگر ایکسپریس	۱۹۷۴	عبدالرحمن میر	کرن نگر سرینگر (جموں کشمیر)
سری نگر ٹائمز	۱۹۶۹	صوفی غلام محمد	بڈشاہ برج سرینگر
سلامتی	۱۹۷۰	حکیم شاکر	بی بی مسجد موتی پورہ گلبرگہ (کرناٹک)
سندیش	۱۹۴۷	نذیر حسین سمنانی	ویر مارگ جموں (جموں کشمیر)
سنگم	۱۹۵۲	مظاہرالدین ایڈوکیٹ	لالہ زار منزل دریاپور پٹنہ (بہار)
سماج	۱۹۵۳	ٹی۔آر مہندرا	چوڑا بازار لدھیانہ (پنجاب)
سویرا	۱۹۶۸	جمنا داس اختر	پٹودی ہاؤس۔ دہلی
سیاست	۱۹۴۹	عابد علی خاں	جواہرلال نہرو روڈ حیدرآباد (آندھرا)
سیاست جدید	۱۹۵۷	محمد اسحاق علمی	چمن گنج کانپور (اترپردیش)
شاردا	۱۹۴۸	شیام لال رازدان	ویر مارگ جموں (جموں کشمیر)
شان ملت	۱۹۷۹	محمد الیاس اصلاحی	۱۴۱۔ مولانا محمد علی روڈ کلکتہ (مغربی بنگال)
شمس	۱۹۷۶	محمد منور/نذیر احمد	تراب علی اسٹریٹ منڈی موہلہ میسور (کرناٹک)
صدائے عام	۱۹۴۲	سید رضی حیدر	(پٹنہ (بہار)
صداقت	۱۹۴۹	نند سنگھ جنڈو	چوڑا بازار لدھیانہ (پنجاب)
طاؤس	۱۹۶۸	اطہر حسین	سبزی باغ پٹنہ (بہار)
طوفان	۱۹۵۴/۷۸	دیویندر گپتا	بٹہ بازار بٹالہ (پنجاب)

عزائم	۱۹۰۱/۷۸	جمیل مہدی	امین آباد پارک لکھنؤ (اترپردیش)
عصر جدید	۱۹۱۹	سفیان عالم	۹ بی بالائی دت روڈ کلکتہ
عظیم آباد ایکسپریس	۱۹۸۰	رضوان احمد	سبزی باغ پٹنہ (بہار)
عکس	۱۹۶۶	کریم راجہ مونگیری	۳۴ چترنجن ایونیو کلکتہ
عمارت	۱۹۶۳	بابورام گپتا	محلہ ٹنکیاں جموں (جموں کشمیر)
عندلیب	۱۹۶۴	محمد یوسف رئیس دہلوی	کوریا سٹریٹ بمبئی-۲ (مہاراشٹر)
غازی	۱۹۶۲	وقار مشرق	۶-ایڈن ہسپتال کلکتہ ۷۳ (مغربی بنگال)
قومی آواز	۱۹۶۶	رگھو ویر مکت	ویر مارگ جموں
قومی آواز	۱۹۸۲	عشرت علی صدیقی	بمبئی
قومی آواز	۱۹۸۲	"	پٹنہ (بہار)
قومی آواز	۱۹۸۱	"	بہادر شاہ ظفر مارگ (نئی دہلی)
قومی آواز	۱۹۴۵	"	قیصر باغ لکھنؤ (اترپردیش)
قومی تنظیم	۱۹۵۸	ایس ایم فریدی	صبا منزل سبزی منڈی پٹنہ (بہار)
قومی جنگ	۱۹۶۷	ہاشم رضا عابدی	خاص روڈ رام پور (اترپردیش)
قومی مورچہ	۱۹۶۵	صفی الرحمٰن انصاری	رسول پورہ وارانسی (اترپردیش)
کلام مشرق	۱۹۶۸	معین اختر انصاری	۹۲/۱۱ بیچ روڈ کانپور "
کوثر	۱۹۷۶	خلیل بیباک/علیم سرکار	۲۹، ۱۲۰ اشوک ویسٹ کراس نمبر ۷ میسور کرناٹک
کوہکن	۱۹۸۳	انوار الہدیٰ	سبزی باغ پٹنہ (بہار)
گرج	۱۹۸۴	سرفراز صدیقی	لال مسجد روڈ مرادآباد
لدھیانہ ایکسپریس	۱۹۷۲	کرتار سنگھ گردھر	ویٹ گنج لدھیانہ (پنجاب)
لدھیانہ پوسٹ	۱۹۷۱ء	ست پال کور	۷۲ محلہ ٹریاں مالی گنج لدھیانہ (پنجاب)
لیڈر	۱۹۷۰	محمد منیر الدین جمال	حیدرآباد (آندھرا)
مارتنڈ	۱۹۳۱	ٹی این رینہ	شیتل ناتھ ساتھو سرینگر (جموں کشمیر)
محنت	۱۹۷۳	ستیہ نند شاکر	نابھہ ہاؤس جالندھر (جموں کشمیر)
مزدور واہنی	۱۹۷۷	ایس ایم عثمان	۱۰۱/۱۸۷ اپکن گنج کانپور (اترپردیش)

مسلمان	۱۹۲۷		۲۱ والاجاہ روڈ مدراس ۲ (تامل ناڈو)
مشیر دکن	۱۸۸۴		اے وسنت راؤ کولن گڈا حیدرآباد (آندھرا)
مقدس	۱۹۷۸		محمد شریف یوسف عثمانی نزد کالی چوک اورنگ آباد (مہاراشٹر)
ملاپ	۱۹۴۹	یش	ملاپ روڈ جالندھر (پنجاب)
ملاپ	۱۹۴۹	یدھ ویر	مکرم جاہی روڈ حیدرآباد (آندھرا)
ملاپ	۱۹۲۳	نوین سوری	بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی۔
منصف	۱۹۷۷	محمود انصاری	نامپلا اسٹیشن روڈ حیدرآباد (آندھرا)
ناظم	۱۹۳۷	ناظم علی خاں	بازار نصر اللہ خاں رامپور (اترپردیش)
ندیم	۱۹۳۵	اشفاق	قمر منزل مکھرا پورہ بھوپال (مدھیہ پردیش)
نقشبند	۱۹۷۴/۷۸	بشیر بن قاسم	نیو سیکریٹریٹ روڈ سرینگر (جموں کشمیر)
نوائے صبح	۱۹۶۷	جی ایم چیکن	زیرو برج سرینگر (جموں وکشمیر)
نوجیون	۱۹۶۱/۶۹	شمبھوناتھ کاچرو	ریذیڈنسی روڈ سرینگر (جموں کشمیر)
نوید دکن	۱۹۷۶	محبوب عالم خاں	اعتبار روڈ حیدرآباد (آندھرا)
نیا سنسار	۱۹۷۸	آر کے پوربی	گل شہید مرادآباد (اترپردیش)
نیا سنسار	۱۹۵۹/۷۸	جی آر عرفانی	لال چوک سرینگر (جموں کشمیر)
نیا کارواں	۱۹۷۱	قادر علی بیگ	بنک اسٹریٹ ٹروپ بازار حیدرآباد (آندھرا)
وقت	۱۹۶۷/۷۵	اندر سنگھ	موتی بازار جموں (جموں کشمیر)
وکیل	۱۹۳۲	کے تیش وکیل	سری نگر (جموں کشمیر)
ولر	۱۹۶۵	غلام محمد ڈار	ریذیڈنسی روڈ سرینگر (جموں کشمیر)
ہمارا بہار	۱۹۸۲	اسلم آزاد	مرادپور لین پٹنہ۔۴ (بہار)
ہمارا نعرہ	۱۹۶۳	محمد شمس الہدیٰ	سبزی باغ پٹنہ (بہار)
ہماری آواز	۱۹۴۶	ایس اشرف حسین	چمن گنج کانپور (اترپردیش)
ہمدرد	۱۹۶۵/۶۷	جی آر عارف	لال چوک سری نگر (جموں وکشمیر)
ہندوستان	۱۹۳۸	سرفراز احمد	۲۵۹ مولانا آزاد روڈ بمبئی۔۸ (مہاراشٹر)
ہند سماچار	۱۹۴۸	وجے کمار	ل لائنز جالندھر شہر (پنجاب)

دہلی انتظامیہ کی پیش قدمی

گھریلو کچرے سے بجلی کی تیاری

دہلی انتظامیہ نے حکومت ہند کے بجلی کے غیر روایتی وسائل کے محکمہ کی مدد سے تیمار پور میں گندگی ٹھکانے لگانے کے لیے بنائے گئے زمینی گڑھوں سے آتش پذیر گیس اور بجلی پیدا کرنے میں پہل کی ہے۔

زمین کے گڑھے میونسپلٹی کے ٹھوس فضلے (کچرے کو ٹھکانے لگانے کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔

طریقہ کار بڑا آسان ہے سوراخ دار پائپوں کو استعمال کرکے گندگی ٹھکانے لگانے والے زمینی گڑھوں میں ایک کنواں بنایا جاتا ہے اور پھر اس کی تہہ میں خلا، پیدا کیا جاتا ہے خلا گیس کو چوس لیتی ہے اور پھر اسے بجلی پیدا کرنے کیلئے پائپوں کے ذریعہ نزدیکی جنریٹر تک پہنچایا جاتا ہے۔

ایسے آٹھ کنویں ایک دوسرے سے 200 فٹ کی دوری پر پہلے ہی کھودے جا چکے ہیں۔ ایک ایکڑ گندگی کے گڑھے سے 100 کلو واٹ بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک کنواں کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا 10 ایکڑ سے ایک ہزار کلو واٹ (ایک میگا واٹ) بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ تیمار پور میں گندگی کا بھراؤ 80 ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے لہٰذا اس میں 8 میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

★ ایک کنویں پر تقریباً دس لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے جس میں جنریٹر، ٹرانسفارمر، پمپوں اور پائپوں کی تنصیب بھی شامل ہے۔

★ حساب لگایا گیا ہے کہ اس طرح پیدا کی جانیوالی بجلی پر روایتی طریقوں پر پیدا کی گئی بجلی پر ہونے والے لگ بھگ ساٹھ پیسے فی یونٹ خرچ کے مقابلے میں دس پیسے فی یونٹ خرچ ہوتا ہے۔

اس وقت دہلی میں مختلف ایجنسیوں مثلاً دہلی میونسپل کارپوریشن، دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی نئی دہلی میونسپل کمیٹی اور دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے ذریعہ تقریباً 50 گندگی ٹھکانے لگانے والے گڑھے استعمال کیے جا رہے ہیں مرکزی علاقے دہلی میں ہر روز 8000 ٹن کچرا حاصل ہوتا ہے۔ صدی کے بدلنے پر یہ مقدار بڑھ کر دوگنی ہو جانے کی توقع ہے۔

★ جراثیمی عمل کے ذریعہ کچرے میں تیمیری عمل کے ذریعہ گیس تشکیل دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار فطری طور پر بڑا آہستہ ہے

★ دہلی میں روزانہ زیادہ تر 850 میگا واٹ بجلی کی کھپت ہے۔ اور اس میں 15 فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے اگر دہلی کا تمام فضلہ قاعدے سے گندگی کے گڑھے میں لیجایا جائے تو دہلی کی 60 میگاواٹ روزانہ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی۔ جو کہ اسکی کل ضرورت کے 8 فیصد کے برابر ہو گی اس روزانہ کی بجلی کی پیداوار میں ہر سال 16 میگا واٹ کا مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے اس طرح سے پیدا کی گئی بجلی کو گاہکوں میں تقسیم کرنے کے لیے ڈیسو کی گرڈ میں پہنچایا جا سکتا ہے

★ ایک واحد لینڈ فل کم از کم دس سال کی مدت تک بجلی پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے اس کے بعد فضلے کو گندگی کے گڑھے سے باہر نکال کر کار آمد کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ چکر غیر معینہ طور پر جاری رہ سکتا ہے۔ اس وقت کوڑے کے ڈھیروں میں سے بننے والی گیس ماحول میں تحلیل ہو رہی ہے اور ماحول کو پراگندہ کر رہی ہے۔ یہ نیا پراجیکٹ دوہرا مقصد پورا کریگا یعنی یہ آلودگی کو روکنے میں معاون ہوگا اور ماحول کو زیادہ صاف رکھیگا۔ اور اس کے ساتھ کچھ حد تک راجدھانی کی بڑھتی ہوئی بجلی کی مانگ کو پورا کرے گا۔ اگر کسی اور ذریعہ سے آپ بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے بارے میں اپنے ذہن میں کوئی ترکیب رکھتے ہوں تو براہ کرم اس بارے میں مندرجہ ذیل پتے پر لکھیے۔

شری جگ پرویش چندر چیف ایگزیکیٹو کونسلر اور ڈیکریٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۲



دہلی انتظامیہ کے اطلاعات اور پبلسٹی کے ڈائرکٹوریٹ کی طرف سے جاری کیا گیا

انعامات واعزازات

اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات

لکھنؤ۔ (ڈاک سے) اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۸۵ء میں پہلی بار شائع شدہ اردو کتابوں پر تقریباً ایک لاکھ ستائیس ہزار پانچ سو روپے کے مختلف انعامات دیے جانے کا فیصلہ کیا ہے جن میں کاتبوں/ناشروں اور لیتھو پریس کے انعامات بھی شامل ہیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے مجموعی ادبی خدمات پر دس دس ہزار روپے کے مقررہ دو انعامات کے ساتھ اس سال ایک اور خصوصی انعام دس ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے جو پروفیسر محمد حسن، مرزا مہذب لکھنوی مرحوم (پس از مرگ) اور جناب عمر انصاری کو دیے گئے۔ کتابوں پر تین تین ہزار روپے کے تین انعامات، دو دو ہزار روپے کے سات انعامات، ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے اٹھارہ انعامات، ایک ایک ہزار روپے کے تینتالیس انعامات اور سات سو پچاس روپے کے اڑتیس انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ انعامات کی مجموعی رقم ایک لاکھ ستاون ہزار پانچ سو روپے ہے۔

انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں دس دس ہزار کے انعامات

۔ پروفیسر محمد حسن. ۲۔ جناب مہذب لکھنوی (مرحوم) پس از مرگ۔ ۳۔ جناب عمر انصاری

کتابوں پر انعامات

(۱) ۳۰۰۰/ کے تین انعامات

۱۔ عروضی اور فنی مسائل، پروفیسر عنوان چشتی (دہلی) ۲۔ خواب کا در بند ہے، شہریار (علی گڑھ) ۳. گداز شب، معین احسن جذبی (علی گڑھ)

(۲) ۲۰۰۰/ روپے کے سات انعامات

۱۔ عشرہ درجہ بندی، محمود حسن قیصر (علی گڑھ) ۲۔ رسول اکرم اور یہود حجاز، بشیر الحق (دہلی) ۳۔ کہہ دوں، ہلال رضوی (پس از مرگ) (رامپور) ۴۔ گلستان غزل، سراج الحق قمر مرادآبادی (مرادآباد) ۵۔ سارا دن دھوپ، غیاث احمد گدی (پس از مرگ) (دھنباد) ۶۔ کیا دن تھے؟، قاضی جلیل عباسی (دہلی) ۷۔ لسانیات کے بنیادی اصول، اقتدار حسن خاں (علی گڑھ)

(۳) ۱۵۰۰/ روپے کے اٹھارہ انعامات

۱۔ مختصر افسانے کا ارتقا، جمال آرا نظامی (علی گڑھ) ۲۔ اردو کی لسانی تشکیل، مرزا خلیل بیگ (علی گڑھ) ۳۔ علامہ سید سلیمان ندوی، محمد نعیم صدیقی (اعظم گڑھ) ۴۔ اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، مہناز انور (لکھنؤ) ۵۔ مجاز شخص اور شاعر، میمونہ عثمانی (الہ آباد) ۶۔ دیوان غزلیات سوکا، ناجرہ ولی الحق (لکھنؤ) ۷۔ مہدی افادی، فیروز احمد (جے پور) ۸۔ فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق، شعیب اعظمی (دہلی) ۹۔ متعلقات انشا، عابد پشاوری (ٹونک)، ۱۰۔ مرزا محمد جعفر اوج، سید سکندر آغا، (لکھنؤ) ۱۱۔ تعلیم کی نفسیاتی اساس، عبداللہ ولی بخش قادری (دہلی) ۱۲۔ شفق کے پھول، ایم۔ کوٹھیاوی راہی (گورکھپور) ۱۳۔ ابر سفید، ہتاب رشیدی (شاہجہانپور) ۱۴۔ آمد، بشیر بدر (میرٹھ) ۱۵۔ بہار شوق، ایس۔ این۔ سنہا (علی گڑھ) ۱۶۔ میری صدا کا غبار، رفعت سروش (دہلی) ۱۷۔ الف تماشا، زبیدہ زریں تحفہ (حیدرآباد) ۱۸۔ گلشن نو بہار، سید سلیمان حسین (لکھنؤ)

(۴) ۱۰۰۰/ روپے کے تینتالیس انعامات

۔ اردو مختصر افسانے کا ارتقا، نسیم آرا (الہ آباد) ۔ پرتو تحقیق، آصف زمانی (لکھنؤ) ۳۔ اقبال نئی تحقیق، سید شکیل احمد (آرہ) ۴۔ افکار و اظہار، نامی انادی (کانپور) ۵۔ ادب اور وابستگی، سید عبدالباری (سلطانپور) ۶۔ ہندی ڈرامے کا ارتقا، ابراہیم یوسف (بھوپال) ۷۔ حضرت شاہ اکبر داناپوری حیات اور شاعری

ہماری مطبوعات

پرکی دیتلی (ناول)	ہنسراج رہبر	قیمت ۳۰/- روپے
یادوں کے کھنڈر (ناول)	نند کشور وکرم	قیمت ۳۰/- روپے
پدمنی (مثنوی)	شور فتحپوری	قیمت ۳۰/- روپے
جلوۂ صد رنگ ۲ (مثنوی)	عبدالمجید تبس	قیمت ۱۶/- روپے
کینوس کا صحرا (افسانوں کا مجموعہ)	دیویندر اسر	قیمت ۳۰/- روپے
شعلۂ احساس (شعری مجموعہ)	ارکرشن مراری	قیمت ۲۶/- روپے
نئی دنیا نیا آدم (مثنویاں)	شور فتحپوری	قیمت ۲۴/- روپے
فردا (شعری مجموعہ)	شور فتحپوری	قیمت ۲۶/- روپے
حرف حرف (شاعری)	شور فتح پوری	قیمت ۲۴/- روپے
منتخب افسانے ۱۹۸۲ء	نند کشور وکرم	قیمت ۲۰/- روپے
اردو ۱۹۸۳ء	نند کشور وکرم	قیمت ۸۰/- روپے
منتخب افسانے ۸۵-۱۹۸۴		قیمت ۴۰/- روپے
مستقبل کے روبرو	دیویندر اسر	قیمت ۲۰/- روپے
گیانی ذیل سنگھ (سوانح)	سریندر سنگھ جوہر	قیمت ۸۰/- روپے
عالمی اردو ادب ۱۹۸۶	نند کشور وکرم	قیمت ۸۰/- روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے ۶ کرشن نگر دہلی ۵۱

طلور رضوی برق (پٹنہ) ۸۔ احتشام حسین، حیات وشخصیت اور کارنامے، فدا المصطفیٰ، فدوی (ناگپور) ۹۔ کالی داس شخصیت اور فن، شہانہ شبنم (میسور) ۱۰۔ سرسید کی تعلیمی تحریک، اختر الواسع (دہلی) ۱۱۔ انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، ذکی کاکوروی (لکھنؤ) ۱۲۔ عہدہ ناظم کتب خانہ داری، مہ جبیں اختر (دہلی) ۱۳۔ متاعِ فکر، عروج زیدی (رامپور) ۱۴۔ ریزۂ مینا، توکل حسین نیو سلطانپوری (پس از مرگ) (سلطان پور) ۱۵۔ سرابوں کی فصل، جبار رشاد راہی (علی گڑھ) ۱۶۔ سرمایۂ جاں، حامد مینائی (شاہجہاں پور) ۱۷۔ الہامات مست، دینا ناتھ کشمیری (دہلی) ۱۸۔ حساب لفظ لفظ کا، کیف احمد صدیقی (سیتاپور) ۱۹۔ سادہ ورق، کمال جائسی (کانپور) ۲۰۔ لمحہ لمحہ جاگی رات، یعقوب راہی (ممبئی) ۲۱۔ واردات، اثر عباسی (لکھنؤ) ۲۲۔ پھول اور شبنم، شبنم گورکھپوری (گورکھپور) ۲۳۔ دستاویز، شوق بجنوری (بجنور) ۲۴۔ عہد جاک، رگھوبیر سرن دواکر راہی (رامپور) ۲۵۔ تم ہی تم، مصور لکھنوی (لکھنؤ) ۲۶۔ موسم بھیگی آنکھوں کا، رفیعہ شبنم عابدی (ممبئی) ۲۷۔ فاران کی بلندی سے، مطرب نظامی (لکھنؤ) ۲۸۔ قطرہ قطرہ سمندر، فاطمہ وصیہ جائسی (لکھنؤ) ۲۹۔ غزل نما، صائم سیدنپوری (لکھنؤ) ۳۰۔ دبستان امیر مینائی، عرفان عباسی (لکھنؤ) ۳۱۔ مرثیہ نگاران اردو، مرزا امیر علی بیگ (لکھنؤ) ۳۲۔ فصیل، تسکین زیدی (کانپور) ۳۳۔ درد کے رشتے، برجیہ بہار سکینہ شاہد بدایونی (بدایوں) ۳۴۔ اپنا دامن اپنی آگ، کیول دھیر (لدھیانہ) ۳۵۔ نیلمبر، حمیدہ سلطان (دہلی) ۳۶۔ دردِ دل، شارہ جعفری (ممبئی) ۳۷۔ اسٹیج ڈرامے، آفاق احمد (لکھنؤ) ۳۸۔ مجھے گھر یاد آتا ہے، شمیم حنفی (دہلی) ۳۹۔ ادب گزیدہ، معین اعجاز (دہلی) ۴۰۔ جدید اسباب الامراض اور معالجات، جمیل احمد (سہارنپور) ۴۱۔ طبی مقالات، انتظار الحق جمیل (لکھنؤ) ۴۲۔ تعلیم اور اس کے مسائل، محمد اکرام خاں (دہلی) ۴۳۔ قومی تعمیر کی دستاویز، عبدالاحد (بنگلور)

(۵) ۵۰۰/- روپے کے ۳۸ انعامات

۱۔ ادبی زائچے، ویریندر پرشاد سکسینہ (بدایوں)
۲۔ ادبی مضامین، نثار اعظمی (شاہجہاں پور)
۳۔ حرف آرزو، ڈی۔ اے، پیر حسین قربان (سہارنپور) ۴۔ اعتقادات سرسید اور شرر بدایونی، طیب بخش بدایونی (بدایوں) ۵۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی حیات اور خدمات، غلام یسین (علی گڑھ) ۶۔ بیسویں صدی میں اردو قصیدہ نگاری، محمد کمال الدین (دربھنگہ)
۷۔ تاریخ اور افسانہ، نزہت سمیع الزماں (لکھنؤ)
۸۔ جلوۂ بینش، مظہر عزیز (پس از مرگ) (علیگڑھ)
۹۔ نکات العروض، ذاکر نعمانی (جلگاؤں)
۱۰۔ حضرت بابا شیخ فرید گنج شکر حیات اور کارنامے، سردار گربچن سنگھ (حیدرآباد)
۱۱۔ دنیا میں اسلام اور مسلمان، محمد نسیم قریشی (لکھنؤ) ۱۲۔ دشت نوا، وقار درانی (مرادآباد)
۱۳۔ حکم نامہ، سلطان سبحانی (مالیگاؤں)
۱۴۔ لمحوں کا لمس، مہر گیرا (ہوشیارپور)
۱۵۔ شہر غزالاں، رضا امروہوی (دہلی) ۱۶۔ قافلۂ حیات، حیات ساکی (لکھنؤ) ۱۷۔ راز و نیاز، راز لائل پوری (دہلی) ۱۸۔ اظہار غم، پیام سہالوی (لکھنؤ) ۱۹۔ رہگذر جمال، محمد منیر فاروقی (بارہ بنکی) ۲۰۔ شگفتہ سحر، ممتاز نکہت (لکھنؤ) ۲۱۔ تیری خوشبو تیرے خواب، ساحل سلطانپوری (سلطان پور) ۲۲۔ شعلے، اے۔ آر۔ خان اختر (لکھنؤ) ۲۳۔ دامن شفق، شفق دلتی (شاہجہاں پور) ۲۴۔ موم کا شہر، قمر اقبال (اورنگ آباد) ۲۵۔ رشحات قیصری، مسعود انور علوی (لکھنؤ) ۲۶۔ تذکرہ شعرائے فرخ آباد، شکنتلا موسج (فتح گڑھ) ۲۷۔ سلگتے دائرے، نور الحسنین (اورنگ آباد) ۲۸۔ ہر بار کھلا دل، نئے اودے سرن ارمان (مرادآباد) ۲۹۔ سماج، نفیس بانو شمع (دہلی) ۳۰۔ مشرقی لوڈلے، عطاء اللہ پالوی (پٹنہ) ۳۱۔ مجاہد آزادی میر واجد علی (ایک زندگی۔ ایک تاریخ) مشتاق نقوی (لکھنؤ) ۳۲۔ صبح کا بھولا، اشفاق احمد (ناگپور) ۳۳۔ بھولی لڑکی، صالحہ خاتون (رامپور)

۳۴۔ خطرناک سفر، ریاض احمد خاں (ممبئی)
۳۵۔ گرد و غبار، کمال انصاری (فیض آباد)
۳۶۔ مقدمہ علم الادویہ، احتشام الحق قریشی (لکھنؤ) ۳۷۔ نقوش ماضی، عظمت اللہ خاں (لکھنؤ) ۳۸۔ جدید ہندی ادب کے معمار، خواجہ وحید الدین (لکھنؤ)

ناشرین انعامات

۱۔ نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۵۰۰/- روپے
۲۔ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۰۰۰/- روپے
۳۔ مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۰۰۰/- روپے

لیتھو پریس کا انعام

۱۔ نامی پریس لکھنؤ ۵۰۰/- روپے

کاتبوں کی اچھی کتابت کے اعتراف میں انعامات

۱۔ نسیم اختر لکھنؤ ۵۰۰/- روپے
۲۔ ایس ایم مظہر الہ آباد ۵۰۰/- روپے
۳۔ سید اقبال احمد اعظم گڑھ ۵۰۰/- روپے

بہار اردو اکادمی کی طرف سے ۱۹۸۴ء کی مطبوعات پر انعامات

تین ہزار روپے کا قاضی عبدالودود انعام (تحقیق کے لیے)

محمد حسین آزاد۔ مصنف: قاضی عبدالودود

تین ہزار روپے کا پروفیسر کلیم الدین احمد ایوارڈ (تنقید کے لیے)

اقبال کا نظام فن۔ مصنف: ڈاکٹر عبدالمغنی

تین ہزار روپے کا اختر اورینوی ایوارڈ (تحقیق
نثر کے لیے)
۲۲ گھنٹے کا سفر۔ مصنف: احمد یوسف

دو ہزار روپے کے انعامات (فی کتاب)
۱۔ غالب کے خطوط۔ ڈاکٹر خلیق انجم
(تحقیق)
۲۔ تعریف اس خدا کی۔ شفیع جاوید (افسانے)
۳۔ نذیر احمد کی ناول نگاری۔ ڈاکٹر اعجاز
ارشد (تنقید)
۴۔ کاشف الحقائق۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی
(تنقید)
۵۔ گلہائے پژمردہ۔ عطاء اللہ پالوی
(سوانح)

ایک ہزار پانچ سو روپے کے انعامات
فی کتاب
۱۔ حرف تمنا۔ نازش سہسرامی (شاعری)
۲۔ پرائے چہرے۔ ذکیہ مشہدی (افسانہ)
۳۔ نصرتی کی شاعری۔ طیب انصاری
(تنقید)
۴۔ اردو میں صوفیانہ شاعری۔ ڈاکٹر
طیب ابدالی (تصوف)
۵۔ تحقیق کے طریقہ کار۔ ڈاکٹر ش۔ اختر
(تحقیق)

۶۔ شمار نفس۔ نجم عثمانی (شاعری)
۷۔ سلسلۂ روز و شب۔ صالحہ عابد حسین
(خود نوشت سوانح)
۸۔ اسلامیات۔ مالک رام (اسلامیات)
۹۔ اردو نثر کے اسالیب۔ ڈاکٹر عبدالخالق
(تنقید)
۱۰۔ مرا خوشیوں کی تلاش۔ ارمان نجمی
(شاعری)
۱۱۔ رباعیات شہباز۔ ڈاکٹر ذکی الحق
(ترتیب مع مقدمہ)
۱۲۔ اقبالیات کی تلاش۔ عبدالقوی دسنوی
(تنقید و تحقیق)

۱۳۔ سعادت یار خاں رنگین۔ ڈاکٹر
حسن آرزو (تحقیق)

۱۴۔ غزالاں۔ حفیظ بنارسی (شاعری)
۱۵۔ دوپہر کا دائرہ۔ نادم بلخی (شاعری)
۱۶۔ غلغل ہائے مضامین۔ عطا کاکوروی
(تحقیق و تنقید)
۱۷۔ ادب اور سماجیات۔ ڈاکٹر قدوس
جاوید (تنقید)
۱۸۔ لائبریرین شپ (علم کتابداری)
سید نقیت الحسن (لائبریری سائنس)

ایک ہزار روپے کے انعامات (فی کتاب)
۱۔ سرد سحر۔ سید نفی احمد ارشاد (شاعری)
۲۔ بیاض سحر۔ ضیا رتقتش (شاعری)
۳۔ دشنۂ چند۔ ناوک حمزہ پوری
(انشائیہ)
۴۔ حسرت موہانی۔ ایم۔ حبیب خاں
(سوانح)
۵۔ امکانات۔ شعیب شمس (افسانہ)
۶۔ سلگتے خیموں کا شہر۔ فخرالدین عارفی
(افسانہ)
۷۔ گمشدہ موسم۔ تسنیم قاسمی (شاعری)
۸۔ روشنی۔ انجم جمالی (افسانہ)
۹۔ صفیر بلگرامی بحیثیت غزل گو۔ ظفر
اوگانوی (تحقیق)
۱۰۔ خلا میں پہلا ہندوستانی۔ ابوالفیض سحر
(سائنس)
۱۱۔ شرح دیوان غالب۔ ڈاکٹر مسز افتخار
بیگم صدیقی (شرح)

۱۲۔ سنگ گزیدہ۔ شفق (افسانہ)
۱۳۔ معیار نظر (ارشد کاکوری) مرتبہ:
عظیم الرحمٰن (تنقید)
۱۴۔ خون کی مہندی۔ بشیر منظر لودی
(افسانہ)
۱۵۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم آبادی۔
ڈاکٹر مصطفیٰ الحسن (تحقیق)
۱۶۔ عکس آئینہ۔ غوث محمد غوثی (شاعری)
۱۷۔ مولیئر اور اس کے ڈرامے۔ ثریا حسین
(ڈراما مع تنقید)
۱۸۔ ہندو فلسفہ۔ ایک مطالعہ۔ ابراہیم اختر
(فلسفہ)
۱۹۔ تیسری دنیا کے لوگ۔ ابن کنول (افسانہ)
۲۰۔ اندر سبھا کی روایت۔ محمد شاہد حسین
(تحقیق)

۲۱۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ حیات اور
ادبی پس منظر۔ مسز ناظمی بیگم صدیقی (تحقیق)
۲۲۔ موسم زرد گلابوں کا۔ شاہد میر (شاعری)
۲۳۔ انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجمے۔
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد
(تحقیق)
۲۴۔ اردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان۔
ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی۔
۲۵۔ انتخاب غزلیات ناسخ۔ ناظم علی خاں
(انتخاب مع مقدمہ)
۲۶۔ دکھن کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر فرزانہ
بیگم (تحقیق)

پانچ سو روپے کے انعامات (فی کتاب)
۱۔ افکار صہبا۔ قاسم صہبا جمیل (شاعری)
۲۔ میر شیر علی افسوس۔ ڈاکٹر سید ظہیر حسن
(تحقیق)
۳۔ جام و سبو۔ ڈاکٹر طاہر تقی رضوی (شاعری)
۴۔ کمپیوٹر۔ ایک نیا جادو۔ شورش صدیقی۔
(سائنس)
۵۔ جنرل نالج۔ بیتی مظہر (جنرل نالج)
۶۔ حضرت آسی غازی پوری۔ ڈاکٹر کاظم
اشمی (تحقیق)
۷۔ عرفان ادب۔ ڈاکٹر سید غلام مرتضیٰ
(تنقید)

پانچ سو روپے کا پرنٹنگ ایوارڈ:
۱۔ قیدی کے خطوط۔

۱۹۸۵ء کی مطبوعات پر اردو اکادمی دہلی کے انعامات

دہلی۔ اردو اکادمی دہلی نے ۱۹۸۵ء میں شائع شدہ ۱۵ کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کتابوں پر یہ انعام منظور ہوئے ہیں ان کی فہرست مع رقم ایوارڈ درج ذیل ہے۔

شاعری

۱۔ امیر قزلباش۔ رجز م/۲۰۰۰ روپے
۲۔ عزیز وارثی۔ تعرف /۲۰۰۰ روپے
۳۔ سالک رام ابھاشا۔ سر سرمد /۱۰۰۰ روپے

افسانہ / ناول / ڈراما

۴۔ بیگم حمیدہ سلطان۔ نیلم /۲۰۰۰ روپے
۵۔ ڈاکٹر صغرا مہدی۔ جو بیدہ راجہ کے شہیں /۲۰۰۰ روپے
۶۔ م۔ ک۔ مہتاب۔ جزیرہ /۲۰۰۰ روپے

تنقید / تحقیق / دیگر اصناف

۷۔ اختر الواسع۔ سرسید کی تعلیمی تحریک ۲۰۰۰ روپے
۸۔ ڈاکٹر نعیم الدین۔ ہندوستان میں فارسی ادب /۲۰۰۰ روپے
۹۔ سید محمود نقوی۔ افسانۂ لکھنؤ /۱۰۰۰ روپے
۱۰۔ اے۔ جگت سنگھ۔ غذائی مسئلہ کا حل /۲۰۰۰ روپے
۱۱۔ ڈاکٹر شہناز انجم۔ ادبی نثر کا ارتقا /۱۰۰۰ روپے
۱۲۔ شعیب اعظمی۔ تصد ہائے رنگ (ترجمہ) /۱۰۰۰ روپے

انشائیہ / طنز و مزاح / خاکہ / سفرنامہ / مکتوبات

۱۳۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ۔ انشائیہ کہلیں /۲۰۰۰ روپے
۱۴۔ معین اعجاز۔ ادب گزیدہ /۲۰۰۰ روپے

بچوں کا ادب

۱۵۔ منور ماد یوان۔ انقلاب زندہ باد /۲۰۰۰ روپے

اکادمی ہر سال معیاری کتابوں کی طباعت پر ناشرین کو بھی انعامات دیتی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں مسافر نظامی میموریل اکیڈمی کو معیاری کتابیں شائع کرنے کے لیے ۲۰۰/ روپے کا انعام دیا گیا۔

۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے لیے غالب انعامات

غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ سب کمیٹی کا جلسہ ۱۱ [illegible] میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل دانشوروں کو انعامات دینے کا فیصلہ کیا

۱۔ فخر الدین علی احمد غالب انعام (برائے اردو فارسی تحقیق)	۱) پروفیسر مختار الدین احمد (برائے ۸۳ء) ۲) پروفیسر ابو محمد سحر (برائے ۸۴ء)
۲۔ مودی غالب انعام (برائے اردو نثر)	۱) جناب خواجہ احمد عباس (برائے ۸۳ء) ۲) جناب صلاح الدین عبد الرحمٰن (برائے ۸۴ء)
۳۔ مودی غالب انعام (برائے اردو شاعری)	۱) نارائن پرتاب گڑھی (پس مرگ) (برائے ۸۳ء) ۲) جناب میکش اکبر آبادی (برائے ۸۴ء)
۴۔ ہم سب غالب انعام (برائے اردو ڈراما)	۱) محترمہ شیلا بھاٹیہ (برائے ۸۳ء) ۲) جناب اظہر افسر (برائے ۸۴ء)
۵۔ سلوا تیا لکشمن غالب انعام (برائے اردو صحافت)	۱) جناب یونس دہلوی (برائے ۸۳ء) ۲) جناب ناز انصاری (برائے ۸۴ء)
۶۔ ساگر سوری غالب انعام (برائے اردو طنز و مزاح)	۱) جناب فکر تونسوی (برائے ۸۳ء) ۲) جناب یوسف ناظم (برائے ۸۴ء)
۷۔ پدم چند غالب انعام (برائے خطاطی)	۱) جناب فضا عرشی (برائے ۸۳ء) ۲) جناب سید مختار الزماں (برائے ۸۴ء)

اول چار انعامات دس دس ہزار روپیہ نقد اور باقی تین انعامات پانچ پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک ایک تمغہ اور توصیفی اسناد پر مشتمل ہیں۔

Regd. No. 45755/85

Registered with the Registrar of Newspapers in India

ALAMI URDU ADAB عالمی اردو ادب

(The only Reference Volume in Urdu)

Price Rs. 80/-

Plac of Printing Sanjeev Offset Printers, Delhi.

Statement about ownership and other particulars about

FORM IV

(As required by Rule 8 of Press Registrar's Act)

Place of Publication	Delhi
Periodicity of Publication	Annual
Printer's Name	Vikas Datta
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, DELHI- 110051.
Publisher's Name	Vikas Datta
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, DELHI- 110051.
Editor's Name	Vikas Datta
Nationality	Indian
Address	J-6 Krishan Nagar, DELHI- 110051.
Owner's Name	Vikas Datta
Address	J-6 Krishan Nagar, DELHI-110051.

I, Vikas Datta hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Vikas Datta
Publisher.

بابت فارم ۴

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات۔

۱۔ رسالہ ہٰذا عالمی اردو ادب

۱۔ مقام اشاعت:

جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

۳۔ وقفۂ اشاعت: سالانامہ

۴۔۵۔۶ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر:

وکاس دتا

۷۔ قومیت: ہندوستانی

۸۔ پتہ: جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱

میں وکاس دتا اقرار کرتا ہوں کہ

مندرجہ اندراجات درست اور صحیح ہیں۔

(دستخط) وکاس دتا

طابع و ناشر وکاس دتا نے سنجیو آفسٹ پرنٹرز سے چھپوا کر جے ۶ کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱ سے شائع کیا۔